نشانِ راہ

جلد دوم

مظہر الدین

اشاعتِ اوّل ------- اکتوبر ۱۹۷۱ء

تعداد ------- ایک ہزار

قیمت ------- سات روپے

مطبع ------- محبوب پریس راولپنڈی

ناشر
------- حریم ادب مقابل تھانہ
------- بی ڈویژن
------- سید پور روڈ راولپنڈی

عنوانات

پیش لفظ

"نشانِ راہ" میرے اُن مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو میں "کوہستان" کے یومِ ظہور سے لے کر تا دمِ زوال لکھتا رہا ہوں۔ یہ مضامین اسی جذبہ کے تحت لکھے گئے تھے۔ کہ عشق کو زندگی نصیب ہو۔ عشق پھر حدی خوان بن کر اٹھے۔ دلوں کو گرمائے اور سینوں کو نورِ یقین سے بھر دے۔

ظاہر ہے کہ عشق کے مزاج کا سارا مدّ و جزر کیف و کم، جوش و خروش اور ذوق و شوق حسن کے جلووں کا منّت پذیر ہوتا ہے۔ ہزار دلیل عشق کو مستی میں نہیں لا سکتی۔ لیکن محبوب کے جمال کی ایک ہلکی سی جھلک اس کی دنیا زیر و زبر کر کے رکھ دیتی ہے۔ وہ سر بکف میدان میں آجاتا ہے۔ غلغلہ انداز ہوتا ہے۔ نغمہ سرائی کرنے لگتا ہے، مرتا ہے اور مار ڈالتا ہے۔ یہ سب محبوب کے جمال کی کرشمہ سازیاں ہوتی ہیں۔ وہ ازل سے پروردۂ جمال ہے اور جمال کے سائے ہی میں زندگی گزارنے کو عبادت کی معراج جانتا ہے۔ میں نے اپنے مضامین کے ذریعے عشق کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے تاکہ وہ جمال کی لطافتوں سے بہرہ ور ہو سکے۔ آئینے کا حسن و جمال ذاتی نہیں ہوتا۔ بلکہ حسنِ دوست، جلوۂ دوست، عکسِ دوست اور جمالِ دوست کہلاتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں۔ بہر حال میں عشق کی بارگاہ میں ایک ایسا آئینہ لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ جس میں حسن کا عکسِ لطیف جلوہ فگن ہے۔

چند سال قبل نشانِ راہ کا پہلا مجموعہ بڑی ناقبول صورت میں شائع ہوا تھا۔ جو میرے ذوق کا غمّاز نہ تھا۔ انشاء اللہ آئندہ کبھی اسے نئی ترتیب و تدوین سے شائع کیا جائے گا۔

ممکن ہے یہ مجموعہ میری زندگی میں اشاعت پذیر نہ ہو سکتا یا کم از کم اس میں تعویق ہو جاتی۔ لیکن ایک دوست نے اس کی اشاعت کے لئے سرمایہ پیش کر دیا۔ "تجلّیات" کی اشاعت بھی

اسی طرح ظہور میں آئی تھی اور میں چاہتا تھا کہ ان مخلص اور عاشقانِ رسولؐ کا نام بھی ان تصانیف کی ابتدائی سطور میں شامل کر دیا جاتا۔ لیکن ان بزرگوں نے اس امر کی اجازت نہیں دی۔ وہ پسِ پردہ رہ کر رحمت کے مزے لوٹنا چاہتے ہیں۔ بہرحال میرے لئے یہ امر بڑی طمانیت کا موجب ہے۔ کہ میری دونوں تصانیف کی اشاعت کا موجب دو سید زادے بنے ہیں۔ جس ذاتِ قدسی صفات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ثنا خوانی کا مجھے شرف نصیب ہوا ہے۔ عطا بھی مجھ پر اُسی ذات فداہ امی وابی کی اولادِ امجاد کے توسّل سے ہوئی۔

اللّٰہم صلّ علیٰ محمّدٍ وعلیٰ آلِ محمّدٍ بعددِ معلومٍ لک

سگیت جامی وجائش ہمیشہ کوئے دوست
نہ آں سگے کہ بہرآستانہ می باشد

منظہرالدین

۲۱ جولائی ۱۹۷۰ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وحدہٗ لاشریک

اللہ کریم کے تمام اسمائے گرامی صفاتی ہیں۔ صرف اللہ ذاتی نام ہے۔ جسے اسمِ اعظم کہا گیا ہے احد اور واحد بھی ربِّ جلیل کے نام ہیں۔ اللہ اور الٰہ میں جو فرق ہے وہی احد اور واحد میں ہے۔ الٰہ صفت پر دلالت کرتا ہے اور اللہ ذات پر، واحد کا ثانی ممکن ہے اور احد کا ثانی ممکن نہیں۔ احد اپنی ذات، صفات اور افعال میں وحدہٗ لاشریک کو کہتے ہیں واحد حِس کے نزدیک ایک ہوتا ہے لیکن عقل کے نزدیک اُس کا تجزیہ ممکن ہوتا ہے۔ حِسّی اعتبار سے زید، فردِ واحد کا نام ہے۔ لیکن عقلی اعتبار سے اس کا تجزیہ اور تقسیم ممکن ہے عقل یہی فتویٰ صادر کرے گی کہ زید عناصر کے مجموعے کا نام ہے جو بکھر سکتا ہے۔ ٹوٹ سکتا ہے ریزہ ریزہ ہو سکتا ہے۔ اُس کی تقسیم ممکن ہے۔ لیکن احد میں ایسا کوئی احتمال نہیں۔ احد، ثانی کو گوارا نہیں کرتا۔ حِسّ اور عقل کے نزدیک اُس کی وحدت اور یکتائی مسلّمات کا درجہ رکھتی ہے۔ احد کہہ کر اپنی ذات سے جسمیت کی نفی کی گئی ہے۔ جو طول، عرض اور عمق کی متقاضی ہوتی ہے۔ واحد کہنے سے اس نوع کے جو اشتباہ پیدا ہو سکتے تھے۔ وہ احد کہہ کر مٹا دیئے گئے تاکہ سرسری نظر رکھنے والوں کو کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ وہ خدا کی ذات کو بھی جسمیت سے متصف نہ جان لیں۔ ثانی رکھنے والے واحد پر قیاس کر کے گمراہ نہ ہو جائیں۔ احدیت کی شان جب بندے میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اُسے اِس صفت سے حصّہ نصیب ہوتا ہے۔ کثرت سمٹ کر وحدت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے قلب پر وحدت کا نور جلوہ بار ہونے لگتا ہے اور وحدہٗ لاشریک کہنے کا مزا آنے لگتا ہے۔ احدیت کے مفہوم و معنی سے نا آشنا انسان علائق کا بندہ ہوتا ہے۔ کثرت سے نہیں نکل سکتا ہر دم

نئے نئے بت اس کی آستین میں ہوتے ہیں اور نئے نئے لات و منات اُس کا قبلۂ مقصود بنتے ہیں۔ احدیت کی شان اِن چیزوں کی نفی کر دیتی ہے۔ بشرطیکہ دل اِس سے لذّت گیر ہو۔

شانِ کریمی

انسان کو اللہ کریم نے جو نعمتیں بخشی ہیں ان کا شمار ممکن نہیں۔ انسان تو ابھی تک اپنے وجود کے اندر پرورش پانے والے افکار و خیالات کی بوقلموں تصویروں کا احاطہ نہیں کر سکا۔ وہ قدرت کے مظاہر کو کیا سمجھے گا، اور کیا شمار کرے گا۔؟ کیا آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کا شمار ممکن ہے۔؟ نفس کی آمد و شد کا حساب کیا جا سکتا ہے؟ زندگی سراسر انعاماتِ ربّانیہ سے عبارت ہے اور کسی ایک انعام کا تفصیلی احاطہ بھی ممکن نہیں۔ درخت، پہاڑ، صحرا، دریا، پھول، پھل، پتّے اور اُن کی رعنائیاں اور زیبائیاں کیا لاحاصل ہیں ؟ زندگی سے ان کا کوئی سروکار نہیں ؟ اِن میں سے کسی ایک چیز کو بھی بے فائدہ کہا جا سکتا ہے ؟ غرض یہ کارخانۂ قدرت اور اس کی ہر چیز انسان کے محسوس اور غیر محسوس منافع اور فوائد کے لئے ہے۔ کائنات کی جن بے کراں نعمتوں کو ہم بے کراں جانتے ہیں خدا تعالےٰ نے انہیں اپنے کلام میں قلیل کہا ہے۔ اور شادِ ربّانی ہے کہ متاعِ دنیا قلیل ہے کثیر خدا تعالےٰ کے نزدیک ذاکرین کا ذکر ہے۔ ذاکرین کے ذکر ہی کو قرآن میں کثیر کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مختصر سی زندگی میں خدا کی جو یاد کی جائے گی۔ وہ بہت قلیل ہو گی۔ گنتے چنے انفاس کے دامن میں یاد کی کتنی پونجی سما سکتی ہے ؟ لیکن کہا یہ جا رہا ہے کہ بندے! یہ کم نہیں، بہت ہے۔ قلیل نہیں کثیر ہے۔ اور اپنے تمام تر انعامات کو قلیل کہا جا رہا ہے۔ یہ کیوں ؟ محبت کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ اپنی عطا کو قلیل اور دوست کی عطا کو کثیر جانتی ہے۔ کبھی محبت کا تحفہ لانے والے کی اس لئے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ بارگاہ کی عظمت اور تحفے کی فرومائیگی کو دیکھ کر خجالت محسوس نہ کرے شرمائے نہیں۔ یہ کریموں کی عادت ہے اور ذاکرین کے ذکر کو کثیر کہہ کر بھی اسی شانِ کریمی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ تاکہ اُن کے حوصلے فزوں ہوں۔

ایمان اور اسلام

ایمان، قلبی تصدیق کا نام ہے اور اسلام، ظاہری اعمال کا۔ دل جب کسی حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے۔ تو اس کا اثر بدن پر بھی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ ایک ہی حقیقت جب دل میں ہو تو ایمان کہلائے گی۔ اعمال کا حسن و جمال بن کر بدن سے ظاہر ہونے لگے تو اسی کو اسلام کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ اعضاء و جوارح جب ایمان کی تجلّی سے مستنیر ہوں گے تو اُن پر اسلام کا اطلاق کیا جائے گا۔ یُوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایمان دل سے شروع ہو کر ظاہر پر منتج ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء دل سے ہوتی ہے اور اِس کا منتہیٰ بدنِ انسانی ہے بخلاف اسلام کے وہ ظاہر سے شروع ہوتا ہے۔ اور دل پر پہنچ کر منتہی ہوتا ہے۔ یہ ایک ہی جلوے کے دو رُوپ ہیں کہیں وہی ایمان کہلاتا ہے اور کہیں اسی کو اسلام کا نام دیا جاتا ہے۔ دونوں شکلوں میں حقیقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کیوں کہ اسم کے بدل جانے سے مسمّٰی کی ذات نہیں بدلا کرتی۔ آپ ایک شخص کو خواہ مختلف ناموں سے پکاریں، اس کی ذات نہیں بدلے گی۔ وہ ایک ہی رہے گی۔ منافقینِ عرب جو زبان سے یہ کہتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے، لیکن اُن کے دلوں میں ایمان موجود نہ تھا۔ رب تعالےٰ کی طرف سے انہیں یہ کہا گیا کہ تم ایمان نہیں لائے یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے۔ اس آیت میں بظاہر ایمان اور اسلام میں مغائرت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دونوں میں کوئی مغائرت نہیں اُن کا ایمان چونکہ نمائشی تھا اس لئے کہا گیا کہ ظاہری اعمال اور باطنی اعمال میں ہم آہنگی ہونی چاہیئے۔ ظاہر کی درستگی باطن کی درستگی کے بغیر معتبر نہیں۔ اعمال کے ساتھ ایمان اور ایمان کے ساتھ اعمال ہوتے چاہئیں۔ اعمال پر بھی بعض مقامات پر ایمان کا اطلاق ہوا ہے۔ اور یہ ایمان کے ثمر اور نتیجہ کے اعتبار سے ہے۔ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ اسلام ایمان سے کوئی مختلف اور جداگانہ چیز ہے

اصُول و فروع

ایمان کی ایک اصل ہے اور ایک فرع، اصلی ایمان تو اسی کو کہا جاتا ہے جو قلبی تصدیق سے عبارت ہو۔ لیکن مجازاً عمل پر بھی ایمان کا اطلاق ہوتا ہے۔ درخت کے تنے اور ٹہنیاں بھی درخت ہی کہلاتی ہیں لیکن اُن کا علیحدہ وجود انہیں اس اعزاز کا مستحق قرار نہیں دیتا۔ ایمان بھی اگر عمل سے جدا ہو یا عمل، ایمان کا ثمر اور نتیجہ نہ ہو تو دونوں کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ جاتی۔ سچّا ایمان، معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے اور معرفت کے حصول کے تین ذرائع ہو سکتے ہیں۔ جمال، جلال اور کمال۔ معرفت، جمال کے ذریعے حاصل ہو تو دل عشق و محبّت کا گہوارہ بن جائیگا۔ جمال روح پر بھی پرتو افگن ہوگا اور افکار و خیالات میں بھی اس کی تابانیاں نظر آنے لگیں گی جلال کے ذریعے متعارف ہونے والا اور معرفت حاصل کرنے والا ہمیشہ خائف و لرزاں رہے گا۔ نظر اٹھا کر اسے جمال دیکھنے کی فرصت نہ مل سکے گی۔ اسے ہمیشہ خوف دامن گیر رہے گا۔ لطف میں بھی اسے یہ کھٹکا لگا رہے گا کہ کہیں قہر و غضب کا مورد نہ بن جاؤں۔ جمال کے شیدائی کی دوسری کیفیات ہوتی ہیں۔ وہ قہر و غضب میں بھی جمال کے مزے لوٹتا ہے۔ عتاب کو بھی عطا جانتا ہے۔ جفا کو بھی کرم سمجھتا ہے۔ اغماض اور بے التفاتی کو چھیڑ چھاڑ سمجھ کر نثار ہونے لگتا ہے۔ کمال کے ذریعے شناسائی حاصل کرنے والے کی تمام تر توجّہ کمال کی قصیدہ خوانی پر مرکوز ہوتی ہے۔ وہ اپنے ممدوح کی ذات کو ہر عیب اور نقص سے مبّرا ثابت کرنے کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کر دیتا ہے اور محاسن گنوانے میں زورِ کلام صرف کرنے لگتا ہے۔ بغرض شناسائی جس ذریعے سے حاصل ہو اُس کا رنگ بات بات میں جھلکتا ہے۔ ہر نوع کی مخلوق میں یہ اصول کارفرما ہے۔

محبّت کے ثمرات

ایک معمولی سی نیکی بسا اوقات بے پایاں اجر کی مستحق قرار پاتی ہے عبادت کا اجر خلوص کی بنا

پر ہوتا ہے اور خلوص کا اندازہ اُن تندائد سے لگایا جا سکتا ہے جو انسان حسنات سمیٹتے وقت
برداشت کرتا ہے۔ جذبہ صدّیق نہ ہو تو راہ کی مشکلات کو برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔
مشکلات کے دریا جتنے گہرے اور عمیق ہوں اسی نسبت سے انسان کو عنایاتِ ربّانیہ کا مستحق
بنا دیتے ہیں ایک انسان جو کسی پیاسے کی پیاس بجھانے کے لئے چلچلاتی دھوپ میں پانی لے کر
آئے وہ اُس انسان سے یقیناً زیادہ اجر و ثواب کا مستحق قرار پائے گا ، جسے پانی لانے میں کوئی
زحمت نہ برداشت کرنی پڑے۔ تکلیف جتنی زیادہ ہو گی رحمت کو اسی نسبت سے پیار آئے گا ۔
درماندگی اور شکستگی کے آثار مسافر کو الطاف و عنایات کا مورد بنا دیتے ہیں۔ تازہ دم مسافر ایسی لذّتوں
سے شناسا نہیں ہو سکتا نہ اُس کی بلائیں لی جاتی ہیں نہ دلجوئی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ راہِ حق
کے عاجز اور درماندہ مسافروں کے لئے جو لذتیں اور سرمستیاں ہیں وہ صرف انہی کا حصّہ ہیں۔ خوشی
اور آسودگی میں وقت گزارنے والے اُن سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے اُن سے قانون اور قاعدے کا سلوک
کیا جائے گا اور درماندگی کے زخم کو صرف محبّت کا مرہم ہی بھر سکتا ہے اور محبت جب نوازنے پر آتی
ہے تو قانون اور قاعدے کی پابند نہیں رہتی۔ قانون اور قاعدے قانونی تعلق رکھنے والوں کے لئے
ہوتے ہیں جو اسیرِ محبّت بن کر آتے ہیں اُن سے محبت کی زبان میں بات کی جاتی ہے۔ محبّت کو
فروغ بخشا جاتا ہے۔ نیا ولولہ اور نیا حوصلہ عطا کیا جاتا ہے۔ روحی اور قلبی تعلق رکھنے والوں سے قانون
کی باتیں نہیں کی جاتیں ۔ دل کی باتیں کی جاتی ہیں۔ جو سلوک اُن سے ہوتا ہے وُہ خالصتاً محبّت کا
اعجاز کہلاتا ہے۔ محبّت کے ثمرات سے موسوم ہوتا ہے۔ قانون کی اطاعت کی عطا محدود ہے ، لیکن
محبّت کی اطاعت کی عطا محدود نہیں ، وہ غیر محدود ہے اس لئے کہ محبّت خود غیر محدود ہے۔ وہ نوازنے
پر آتی ہے تو گدا کو شاہ بنا دیتی ہے دل کی کایا ہی نہیں پلٹتی حال کو بھی بدل کر رکھ دیتی
ہے۔ بعض لوگوں کے لئے حدیث شریف میں جنت کے ہر دروازے کے کھلنے کا ذکر آتا
ہے۔ ہر دروازے پر اُن کا استقبال کیا جائے گا اور اُن سے حساب بھی نہیں لیا جائے گا
اس لئے کہ اُن کی محبّت کا یہی اجر ہو گا۔

مناجات کی لذّت

کچھ مدّت کے لئے نزولِ وحی کے بند ہو جانے سے حضور علیہ السلام کو تو خیر قلق و اضطراب تھا ہی لیکن ان لوگوں کی طنز و تعریض کا سلسلہ بھی کچھ کم وسیع نہ تھا۔ جن کے سینے کفر سے معمور تھے اور وہ محبّت کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے۔ محبّت کے جہان میں کلام ہی نہیں ہوتا۔ خاموشی بھی ہوتی ہے۔ التفات ہی سے نہیں نوازا جاتا، تغافل سے بھی تربیت کی جاتی ہے، یار کا تغافل بھی مربّی ہوتا ہے۔ التفاتِ دوست میں انسان جب کمی پاتا ہے تو گوناگوں خیالات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ اندیشہ دل میں گزرنے لگتا ہے کہ کہیں دوست کی رضا کے خلاف تو کوئی فعل سرزد نہیں ہو گیا جو اس نے بیگانگی کی خو اختیار کر لی ہے؟ اور کبھی اس نوع کے دوسرے اندیشے اس کے جذبات میں تموّج پیدا کرنے کا موجب ثابت ہوتے ہیں غرض جذبات کی رنگارنگی اور احساس کی بوقلمونی اس تغافل اور بے التفاتی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہر تغافل بیگانگی کی دلیل نہیں ہوتا اور ہر التفات میں شانِ کرم نہیں ہوتی۔ بعض اوقات جذبات کو اور بھڑکانے کے لئے بیگانگی کی روش اختیار کر لی جاتی ہے۔ سخی کی خاموشی گدا کے نغموں کے زیر و بم کو جنم دیتی ہے اور کریم کا عدمِ التفات سائل کے سینے کو سوز بخشتا ہے وُہ اور چیختا ہے اور چلّاتا ہے تاکہ کریم متوجّہ ہو۔ بعض اوقات کریم کا التفات اور سخی کی توجّہ گدا کے سینے کے سوز کی موت کا ذریعہ بن جاتی ہے وہ عطا کا دامن دراز کرتا ہے تو گدا بھیک لینے کے بعد کسی اور دروازے کی طرف متوجّہ ہو جاتا ہے اُس کے ان رسیلے اور روح کو وجد میں لانے والے نغموں کا تسلسل ختم ہو جاتا ہے۔

حمد و ثنا

انسان کو مختلف شعوب و قبائل میں بانٹنے کے بعد قدرت نے ناک نقشہ بھی مختلف عطا کیا ہے۔ ایک کا چہرہ دُوسرے سے نہیں ملتا۔ ایک کی صُورت دُوسرے سے مختلف ہے

عادات وخصائل اور انداز و اطوار کے اعتبار سے بھی انسانوں کی کئی قسمیں ہیں افکار و خیالات میں یک رنگی نہیں۔ جذبات بھی متنوّع پائے ہیں۔ شاعر کی دنیا اپنی ہے کسان کی اپنی کہیں لطافت ہے اور کہیں صلابت اور یہ سلسلہ اولادِ آدمؑ کی طرح بڑا وسیع و عریض ہے زمین و آسمان کے درمیان پھیلی ہوئی اللہ تعالےٰ کی قدرتوں کے جلووں کو کسی ایک رنگ اور لباس میں محدود و محصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہر جلوہ شانِ یکتائی کا مظہر ہے اور کثرت کے ان شیون و مظاہر میں ایک عظیم اور وحدہٗ لاشریک ذات کی قدرتوں کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، ذرّے، صحرا، پہاڑ اور باغ و بوستان اگر مختلف اور متنوّع نہ ہوتے تو تخلیق کا وہ حسن و جمال صورت پذیر نہ ہو سکتا۔ جو صانع کی ان گنت عظمتوں اور قدرتوں کا نقشِ جمیل کہلاتا ہے۔ صفات کی رنگا رنگی بھی کبھی ذات کی عظمتوں کی آئینہ دار بن جاتی ہے اور کائنات کی مختلف بہاریں بھی اس چمن کے مالی کی تخلیقی قوّتوں کی غمّازی کرتی ہیں۔ ہر جلوہ ایک نئی شان کا پتہ دیتا ہے صبح کے مناظر بھی دلولہ انگیز ہیں اور شام کی رنگینیاں بھی دلکش اور نظر افروز، انکار نہ نور کا ممکن ہے اور نہ ظلمت کا، کیوں کہ سیاہی اور سفیدی دونوں شانِ جلالی و جمالی کے ظہور کے لئے معرضِ وجود میں لائی گئی ہیں۔ مختصر یہ کہ ذرّے سے لے کر آفتاب و مہتاب تک کا یہ جہاں ایک مینا بازار ہے کہیں پست ہے اور کہیں بلند، کہیں نور ہے اور کہیں ظلمت، اور ان مختلف اور متضاد کیفیتوں کی آمیزش ہی سے کائنات کے نقش کو رنگینیاں اور رعنائیاں ملی ہیں۔ مصوّر کا موئے قلم اس کی ذہنی کیفیتوں کے تابع ہوتا ہے وہ ایک ہی رنگ سے جلوے نہیں تراشتا مختلف رنگوں کی آمیزش سے تصویر بنا کر بھی حیران کر دیتا ہے۔ حیرت عظیم فنکار کے فن کا عطیہ ہوتی ہے کوئی نقش اگر حیران نہ کر سکے تو وہ عظیم فنکار کی عظمتوں کا آئینہ نہیں ہو سکتا۔ انبیاء علیہم السلام چونکہ اس راز سے آگاہ تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے اپنے عہد کی جابر اور قاہر قوّتوں کے سامنے جب دلائلِ ربوبیّت کو بیان کیا تو قوت و عظمت کے اظہار کے لئے وہی چیزیں منتخب کیں جو حیرت انگیز اور تعجب خیز تھیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے سامنے ربوبیتِ کاملہ کا ذکر کیا تو وہ کوئی محدود اور محسوب ربوبیت نہ تھی۔ زمین و آسمان کا رب بھی اپنے پروردگار کو بتایا اور مشرق و مغرب کی ربوبیت بھی اسی کا کرشمۂ قدرت ظاہر کی۔ ایک ربوبیتِ مکانی تھی اور ایک زمانی، مقصود یہ تھا کہ زمان و مکان کا پروردگار میرا رب ہے۔ بات آگے بڑھی تو فرمایا کہ میرا رب ہر چیز کو تخلیق کا لباس پہنا کر ہدایت بخشتا ہے۔ یعنی عناصر کو تخلیق کرنے کے بعد آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا۔ انہیں تخلیق کا مقصود بھی بتا دیا گیا ہے۔ چنانچہ آگ کو معلوم ہے کہ اس کی تخلیق کا مقصود جلانا ہے، اور پانی جانتا ہے کہ اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ نبیؑ کے دلائل ہیں جو وہ اپنے رب کے بڑے حریف فرعون کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

نمرود کے سامنے پیش کئے جانے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دلائل کی بھی یہی حیثیت ہے۔ وہ بھی عظیم ہی نہیں حیران کن بھی ہیں۔ اسی لئے کہا گیا کہ کافر مبہوت ہو گیا۔ عظیم صنّاع، خالق اور مصوّر کی تخلیقی عظمتیں دیکھ کر بیگانے ہی مبہوت نہیں ہوتے، اپنے بھی حیران رہ جاتے ہیں اور یہی حیرت، عظمتِ فن کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ اعترافِ حقیقت کہلاتی ہے۔ خراجِ تحسین کا نام پاتی ہے۔ فن اگر حیرت عطا نہ کر سکے تو ادھورا کہلائے گا۔ ناتمام سمجھا جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام کی حمد و ثنا اسی لئے عظیم تر درجہ رکھتی ہے کہ وہ رب تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو زیادہ جانتے ہیں اسی نسبت سے ثنا کرتے ہیں اور ہماری ثنا اس نوعیت کی نہیں۔

ربّانی تاثّرات

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ نماز کی دوسری رکعت میں اگر کوئی التحیات کے بعد درود شریف پڑھ لے تو اس پر سجدۂ سہو لازم آ جاتا ہے۔ چوتھی رکعت میں اسے سجدہ ادا کرنا ہوگا۔ امامؒ نے جب شروع میں یہ فتویٰ دیا تو بعض لوگوں نے کہا کہ رسولؐ اور

آلِ رسولؐ پر درود پڑھنے کے باعث سجدۂ سہو کیسے لازم ہو گیا ؟ یہ تو افضل ترین عبادت ہے۔ یہ سوال چونکہ جذباتی انداز میں اٹھایا گیا تھا اس لئے امامؒ نے بھی جواب میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ فرمایا کہ سجدۂ سہو درود شریف پڑھنے پر لازم نہیں آتا۔ یہ تو سزا ہے بھول چوک کی، ان بارگاہوں میں تو حضورِ قلب کے ساتھ اور غایت درجہ خشوع و خضوع سے درود شریف پیش کرنا چاہیئے یہ غفلت کیسی ؟ سجدۂ سہو کی سزا میں غفلت پر دے رہا ہوں تاکہ کوئی غافل نہ ہونے پائے۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کا نظریہ ہے جو پوری امت میں امامِ اعظمؒ کے نام سے موسوم ہیں۔ امامؒ اگر اس حقیقت سے پردہ نہ اٹھاتے تو دوسرے لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہی نہ ہوتی۔ مجتہد جب کوئی مسئلہ بیان کرتا ہے تو علت اسی کی نظر میں ہوتی ہے۔ دلائل و براہین وہ عوام کے سامنے پیش نہیں کرتا، اور ہر دلیل کو ہر انسان سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔ ہاں ائمہؒ کے درمیان جب کوئی نزاع رونما ہوا ہے تو انہوں نے اپنے دلائل بیان کئے ہیں اور دوسرے کے سنے ہیں اور اسی نوع کے کسی مسئلے کے متعلق اگر عوام کی طرف سے اعتراض کیا گیا ہے تو ان بزرگوں نے مخاطب کے فہم و ذکا اور علمی استعداد کے مطابق جواب دے کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے۔ عوام کے سامنے وہ جوابات پیش نہیں کئے گئے جن کا خالصتاً علمی مباحث سے تعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت بھی یہی ہے۔ وہ بھی ہر ایک کے ساتھ یکساں لب و لہجے میں بات نہیں کرتا۔ کافروں کے ساتھ اندازِ خطاب اور ہے اور مومنوں کے ساتھ اور، مومنوں کو بھی قرآن تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک قسم کو ظالم علی النفس کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ ایک کو مقتصد کہا گیا ہے اور ایک کو سابقٌ بالخیرات کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی یہ تینوں قسمیں دنیا ہی میں اپنے اپنے مقامات و درجات کے اعتبار سے مختلف نہیں اخروی زندگی میں بھی انکے مقامات و درجات مختلف ہونگے۔ پہلا گروہ جو نفسانی خواہشات کو کچل کر رب تعالےٰ کی رضا کا طالب ہوتا ہے۔ وہ بھی فائز المرام ہے۔ میانہ روی اور اعتدال کی راہ اختیار کرنیوالے کو بھی مقبولوں کی صف میں

جگہ دی گئی ہے لیکن سابِقٌ بِالخیرات کی اور شان ہے۔ یہ صدّیقین ہیں جو تمام مصلحتوں کو نظر انداز کر کے صدّیق رضی کی طرح خدا کی راہ میں گھر لٹا دیتے ہیں اور مقامِ صدّیق پر کھڑے ہو کر رب تعالیٰ کی قدرت کا تماشا دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر آنے والے کے ساتھ میزبان یکساں سلوک نہیں کرتا۔ بعض کو مہمان داری کے ظاہری آداب و رسوم کے ساتھ نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور بعض کے سامنے کلیجہ نکال کر رکھ دینے سے بھی ذوق آسودہ نہیں ہوتا۔ مہمان جو رتبہ، مقام اور جو شان لے کر وارد ہوتا ہے وہی میزبان کو متاثر کرتی ہے۔ ربّانی تاثرات کا بھی یہی حال ہے۔ اسی لئے آخرت کے بعض مہمانوں کے لئے کہا گیا ہے کہ میں آگے بڑھ کر جنت کے ہر دروازے پر ان کا استقبال کروں گا۔ ان کے لئے جنت کے دروازے کھلے رہیں گے اور انہیں عرش کے سائے کے نیچے جگہ دی جائے گی۔

ہر مہمان، میزبان کا دل نہیں لوٹ سکتا۔ جو میزبان کے لئے لٹ جائے اپنا سب کچھ نثار کر دے۔ وہ مہمان بن کر آجائے تو کیفیتیں اور ہوتی ہیں۔ اس وقت مہمان داری کے اصول بدل جاتے ہیں۔ رسوم و قیود کی دنیا ختم ہو جاتی ہے یہ ملاقات دو مشتاق روحوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ جہاں ذوق و شوق کے سوا کچھ نہیں ہوتا لطافت ہی مہمان ہوتی ہے اور لطافت ہی میزبان، معانی و مطالب کا ایک جہان ہوتا ہے۔ جو دونوں کے گرد رقص کرتا ہے۔

جمال کی داد

سفر میں انسان کو دو طرح کی کیفیات پیش آتی ہیں۔ ایک کیفیت کا تعلق حواسِ ظاہری سے ہوتا ہے اور ایک کا حواسِ باطنی سے۔ ظاہر، سفر کی ظاہری کیفیت سے متاثر ہوتا ہے اور باطن، باطنی کیفیت کا اثر اور نتیجہ کہلاتا ہے۔ سردی گرمی دھوپ چھاؤں بدن کو متاثر کرتی ہیں اور احساسات کی دھوپ چھاؤں احساسات پر اثر انداز ہوتی ہے

احساس میں گرمی ہو تو موسم کی خنکی قدم نہیں روک سکتی - بلا کی سردی میں بھی انسان اپنی منزل کی طرف رواں دواں نظر آتا ہے - دل ہی بجھ گیا ہو تو موسم کی خوشگواری بھی کوئی ولولہ عطا نہیں کر سکتی سفر میں سازو سامان کی بجائے تابندہ جذبات کی ضرورت ہوتی ہے اور تابندہ جذبات کو دنیا کی کسی دُکان سے نہیں خریدا جا سکتا - یہ پونجی محبّت کی دکان سے ملتی ہے - منزل سے جس قدر شغف ہو گا - جذبات بھی اسی نسبت سے تاباں اور جوان ہوں گے - جذبات کا سارا رنگ، رُوپ منزل کا فیضان کہلاتا ہے - جذبات میں تندی اور تیزی ہو تو جان لینا چاہیئے کہ منزل نوازنے کے لئے بے قرار ہے، یہ تڑپ اُسی کی عطا ہے، یہ جذبہ اُسی کا عطیہّ ہے اور یہ ذوق و شوق اُسی کے قاصد اور پیامبر ہیں جو منزل کی طرف کشاں کشاں لیئے جاتے ہیں کوئی مقناطیسی قوّت نہ کھینچے تو کون کھنچتا ہے ؟ سفر میں لذّت و کیفیّت کا ہونا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ منزل مسافر سے بے خبر نہیں، دونوں میں گہرا ربط ہے - ایک کو دوسرے سے آگاہی ہے - چاہت کا رشتہ دونوں میں قائم ہے جو راہ میں بھی لذتیں اور کیفیتیں بکھیر رہا ہے - مسافر کی نظر منزل پر ہے اور منزل کی مسافر پر ۔ یہ شناسائی ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی - منزل کے حسن و جمال میں مبتلا ہو کر سفر کرنے والے اور یوں ہی قدم اٹھانے والے کے احساسات میں ہم آہنگی نہیں ہو سکتی - دونوں کے احساسات و مدرکات جداگانہ ہوں گے - خبر کو ذریعہ بنا کر چلنے والا اُس مسافر کے احوال و کیفیات سے بے خبر ہوتا ہے جو جمال کا پروردہ ہو جس کی نظر جمال پر ہو جس کا مقصودِ حیات جمال کے سوا کچھ نہ ہو ایسے مسافر کو جمال ملتا ہے - دید کی لذتیں عطا ہوتی ہیں اور جو محض منزل کی خبر پا کر رختِ سفر باندھے اُس پر حُسنِ منزل کے راز آشکار نہیں ہوتے - منزل پر پہنچ کر بھی اس کی نظر جمال آشنا نہیں ہوتی بلکہ اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ نے کبھی آنکھ اٹھا کر مال و منال کی طرف نہیں دیکھا نہ اُس کی آرزو کی - اُن کی نظر جمالِ محبوبؐ پر تھی - نعمت مل

جانے کے بعد طالبِ صادق کو نعمت کے شکر ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ اِدھر اُدھر کہاں دیکھتا ہے؟ بدر و حنین کی رزم گاہوں میں صحابہ رضی کی مشغولیت دراصل جمال کا شکر تھی نعمت جتنی عظیم ہو، شکر بھی اسی نسبت سے کیا جاتا ہے۔ صحابہ رضی کو چونکہ جمالِ رسول ص کی صورت میں جو نعمت ملی تھی وہ بے پایاں تھی، اسی لئے ان کا شکر بھی بے پایاں تھا۔ حد نہ جمال کی تھی نہ دادگروں کی۔ داد دینے والے جان و مال کا اثاثہ لٹا کر بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ نعمت کا شکر ادا نہیں ہو سکا۔ جمال کے نئے نئے مفاہیم اُن پر اسی لئے واضح ہو رہے تھے کہ وہ سچے دادگر تھے۔ جھوٹی داد دینے والے پر تو کوئی معمولی فنکار بھی اپنے فن کی لطافتیں آشکار نہیں کرتا، اُس سے اغماض برتتا ہے۔ جمال کی لذتیں چونکہ بیان کرنے والی چیز نہیں، صرف محسوس کی جاتی ہیں، اسی لئے صحابہ رضی نے ان کی وضاحت کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، جان اور مال سے داد دی۔ اصحابِ صفہ رضی کا چبوترے پر بیٹھ رہنا بھی جمال کی داد تھی اور ہر صاحبِ جمال کو چونکہ اپنے جمال کے دادگر عزیز ہوتے ہیں اسی لئے حضور ص کو اصحابِ صفہ بے حد عزیز تھے۔ اُن کی طرف نظر اُٹھتی تھی تو محبت سے لبریز، اور دستِ کرم اٹھتا تھا تو عطا سے معمور، داد کا کمال کبھی محویت کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ تحیر بھی داد بن جاتا ہے۔ اصحابِ صفہ رضی کا وہ تحیر انتہائی داد تھا جس نے انہیں دنیا سے بیگانہ بنا دیا تھا۔ طور پر کلیم اللہ کی بے ہوشی بھی ایک داد تھی اور چبوترے پر اصحابِ صفہ رضی کی محویت بھی داد کی ایک صورت، داد کا کمال ہر جگہ ظاہر ہے۔

سرخوشِ نشۂ دیدار نظر آتے ہیں
آئینے پشت بہ دیوار نظر آتے ہیں

جمال کی عطائیں

صحابہ رضی معجزات دیکھ کر ایمان نہیں لائے معجزہ عاجز بنا دیتا ہے اور عاجز بنا کر لایا جائے

تو انسان میں ولولہ انگیز جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔ وہ سرفروشی کی شان نہیں دکھا سکتا جان دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ سرفروشی، جان بازی اور جاں نثاری کے جذبات کی تخلیق جمال سے ہوتی ہے۔ جمال ہی اُن کا پروردگار بنتا ہے۔ چنانچہ صحابہؓ کے تمام تر جذبات جمال کے پروردہ تھے۔ جمال ہی نے ان کی تخلیق کی تھی۔ جمال ہی ان کا پروردگار بنا تھا اور جمال ہی نے انہیں مستی اور سرشاری عطا کی تھی۔

جمال کی عطائیں عقل کی عطاؤں سے مختلف ہوتی ہیں۔ عقل کی عطائیں مستی نہیں ہوتی۔ بے خودی اور سرشاری کا اس میں شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ صحابہؓ کی عقل کو مغلوب کر کے لایا جاتا تو بدر و حنین کی فضاؤں میں مستیاں کہاں سے آتیں؟ محبّت کا والہانہ رقص کون دیکھ سکتا؟ محبت جلوہ گر کہاں ہوتی۔ عشق کو سرفرازیاں کیسے ملتیں؟ یہ تو سب جمال کا فیضان تھا۔ جمال کی عطائیں تھیں۔ جمال کے کرشمے تھے۔ جمال کے کرشموں کو عقل نہ کبھی پہنچی ہے نہ پہنچ سکے گی۔ جمال کی عطائیں غیر محدود ہوتی ہیں۔ انہیں زوال نہیں آسکتا۔ وہ زوال پذیر ہونے والی چیز نہیں۔

عقل کا اسیر شکار ہونے کے بعد رہائی چاہتا ہے۔ لیکن جمال کے اسیر کو رہائی مطلوب نہیں ہوتی۔ اُس کی قید کے دن ان گنت ہوتے ہیں اُن کا شمار ممکن نہیں ہوتا۔ ممکنات کی دنیا عقل کی دنیا کہلاتی ہے۔ جمال کے پرستار کی دنیا ممکنات کی دُنیا سے ماورا ہوتی ہے وہاں کوئی چیز ناممکن نہیں۔ وہ ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے صحابہؓ ممکنات اور ناممکنات کی بحثوں میں نہ پڑتے تھے۔ وہ جمال کے پروردہ تھے۔ ان کا وجود خود معجزے کی حیثیت رکھتا تھا اسی لئے وہ محالات کو ممکنات میں لے آتے تھے۔ عقل کا پروردہ ممکنات کی دُنیا سے آگے نہیں گزر سکتا۔ وہ سود و زیاں کے چکّروں میں پڑا رہتا ہے۔ چکّر ہی اُس کا مقدّر ہوتے ہیں۔ مستی اُسے نصیب نہیں ہوتی۔ مستی کا تعلّق دل سے ہے۔ یہ دل کی غذا ہے دل کو ملتی ہے۔ عقل میں مستی کا گذر ممکن نہیں۔ وہ خود بے کیف ہے جو عطا کرتی ہے وہ بھی بے کیفی

کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ زخم کھا کر دعا دینا دل کا شیوہ ہے دل اسیر ہو جاتا ہے تو اسیری کے ایّام کو غنیمت جان کر دعا گو بن جاتا ہے۔ اس احساس سے تڑپنے لگتا ہے کہ میں تیر اندازی کی نظروں کے قابل نہ تھا، اُس کا کرم ہے کہ مجھے قابلِ توجہ سمجھا۔ ہر کسک اُسے نئی لذت عطا کرتی ہے۔ نئی زندگی بخشتی ہے۔ عقل کی دنیا میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ وہاں کسک زندگی عطا نہیں کرتی۔ لذت نہیں بخشتی۔ صحابہؓ کا ہر زخم دعا گو تھا۔ سپاس گزار تھا اور یہی سپاس گزاری ان کے رب کو پسند تھی۔ انہیں نئی نئی لذتیں مل رہی تھیں۔ ہر تیر نئی لذتوں کا خالق بن کر سینے میں پیوست ہوتا تھا۔ سپاس گزاری ہی سے انعامات فزوں ہوتے ہیں وہ ان نعمتوں کے سپاس گزار تھے۔ اسی لئے یہ نعمتیں انہیں جھولیاں بھر کر مل رہی تھیں۔ قدر ناشناس کو نعمت کون دیتا ہے؟ اور یہ تو ازلی ابدی اور سرمدی نعمتیں تھیں۔ یہ سپاس گزاری کے بغیر کیسے مل سکتی تھیں؟ سپاس گزار دراصل اُن کا وہ احساس تھا جو انہیں جمال کی لطافتوں نے عطا کیا تھا۔ لطیف کی عطا لطیف کے بغیر کیا ہو سکتی ہے؟ جمالِ نبوتؐ کی لطافتوں نے ان کے احساسات کو چونکہ غایت درجہ لطیف بنا دیا تھا۔ اسی لئے اُن پر لطیف عطائیں وارد ہو رہی تھیں۔ لطیف کا ورود بھی لطیف ہوتا ہے، نظر نہیں آتا لیکن محسوس ہوتا ہے احساسِ جمال خود نعمت ہے اس کی عطائیں کیسے نعمت نہ ہوں گی؟

تصوّر اور تصویر

اضطراب کی زندگی ہو یا سکون کی، دونوں میں بندے کو خدا کی یاد کی تعلیم دی گئی ہے رنج و راحت شادی و غم اور صحت و مرض کسی حالت میں بھی اس کی غفلت اور حق فراموشی کو جائز قرار نہیں دیا جاتا۔ حق فراموشی ایسا جرم ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن کچھ ایسے لوگ خدا کے سامنے لائے جائیں گے۔ جنہوں نے غفلت کو اپنا شعار بنا رکھا ہوگا۔ ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے دنیوی زندگی میں ہمیں کیوں بھلا

دیا؟ ہمیں کیوں یاد نہ کیا؟ جس کے جواب میں بعض اپنی بیماری اور طویل علالت کا عذر پیش کریں گے۔ لیکن خدا تعالٰے ایسے مریضوں کو ان کے سامنے پیش کرے گا۔ جو سخت مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے رب کی یاد سے غافل نہ ہوئے ہوں گے۔ ایسے ہی اور مصروفیتوں اور مصیبتوں کا ذکر کرنے والوں کے سامنے اسی نوعیت کے انسان لائے جائیں گے جو بے حد مصروف ہونے کے باوجود زندگی بھر غافل نہ رہے ہوں گے اور گوناگوں مشکلات نے انہیں غافل نہ ہونے دیا۔ انہیں پیش کرنے کے بعد خدا تعالٰے غافلین سے پوچھے گا کہ تم اس حال میں مبتلا تھے؟ ان پر غفلت طاری نہ ہوئی تو تمہاری غفلت کا کیا جواز ہے؟

دراصل درد غفلت کا باعث نہیں ہو سکتا، وہ تو بیداری عطا کرتا ہے اپنے خالق و مالک کو یاد کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ درد و غم میں ہمیشہ اُسی کی یاد آتی ہے جس سے قلبی لگاؤ ہو۔ جس میں دل اٹکا ہو، جو مونس و دمساز بننے کی قدرت و طاقت رکھتا ہو، جو غم کو خوشی میں بدل دینے کی صلاحیت کا مالک ہو۔ بلکہ دل سے ربط رکھنے والا نحیف و ناتواں بھی ہو، کمزور اور مضمحل بھی ہو، مصائب و آلام کو رفع کرنے کی قدرت نہ بھی رکھتا ہو تو انسان اسی کو پکارتا ہے، اُسی کو یاد کرتا ہے۔ ماں ضعیف و ناتواں بھی ہو، بچّے کو غم و آلام سے نجات دلانے کی صلاحیت نہ بھی رکھتی ہو تو بچّہ مصیبت کے وقت اُسی کو پکارتا ہے۔ اعانت و نصرت کا یہی مفہوم نہیں کہ کوئی ذات انسان کو غم و آلام سے نجات دلادے محبّت کی نظر سے دیکھ لینا بھی غمزدہ کی نصرت ہوتی ہے، اس کی اعانت کہلاتی ہے بلکہ قلبی لگاؤ رکھنے والی ذات کی نری موجودگی بھی غم و آلام کی زندگی میں ایسی تسکین بخشتی ہے جو بیگانوں کی نصرت نہیں بخش سکتی۔ تسکین اپنی ہی محبّت کی موجودگی کا نام ہے۔ خواہ وہ کسی رنگ میں ہو ماں کے روپ میں ہو یا عزیز و اقارب کے لباس میں۔ جس ذات پر محبّت کا یقین ہو، وُہ مصیبت کی زندگی میں تسکین کا موجب ہوتی ہے۔ نرے پاس بیٹھ لینے سے، بات کر لینے سے

دیکھ لینے سے وہ تسکین ملتی ہے جو کسی اور صورت میں متصوّر نہیں ہو سکتی۔

تصوّر ہی جب تصویر بن کر سامنے آجائے تو یہ بھی سکون کی ساعتیں ہوتی ہیں۔ غم میں کریم ذات کا تصوّر بھی مزا دینے لگتا ہے۔ تصوّر غم و آلام کی شدّت کو کم ہی نہیں کر دیتا غم کی ساعتوں کو بھی حسین بنا دیتا ہے یار کا تصوّر جو حسن عطا کرتا ہے وہ در و دیوار کے نقش و نگار نہیں بخش سکتے۔ در و دیوار کے نقوش خاموش ہوتے ہیں اور یار کا تصوّر گویا وہ بولتا ہے، بات کرتا ہے۔ تسکین دیتا ہے، سہارا بخشتا ہے۔ ہم آغوشی کی لذتیں عطا کرتا ہے اور ایسے عالم میں غم و آلام کے بادل خود بخود چھٹنے لگتے ہیں۔ تصویر ساری توجّہ جذب کر لیتی ہے اور انسان ماحول کی کربناک ساعتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ غیر سے بے نیازی محبوبِ ذات کے تصوّر کی عطا ہوتی ہے اور اس عطا کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ دل میں اتری ہوئی تصویر دل سے جدا نہیں ہوتی، دل کو محویتیں عطا کرتی ہے۔ لذتیں بخشتی ہے، اور غیر سے بے گانہ بنا دیتی ہے جب یہ نشہ ذرا کم ہو تو انسان پکارنے لگتا ہے۔

خدا جانے تصوّر تھا ترا اعجاز تھا کیا تھا؟

تری تصویر کو میں نے بلایا ہے، وہ بولی ہے

غرض غم کی ساعتیں کریم ذات کی یاد سے حسین بن سکتی ہیں۔ یاد جب بھی آئے گی، کریم ذات کی صفات کو ساتھ لے کر آئے گی، یاد تنہا ہو ہی نہیں سکتی، اُس کے ساتھ تصویر بھی ہوتی ہے اور تسکین بھی۔ حسن بھی اور جمال بھی، لطف بھی اور کرم بھی، ناز بھی اور انداز بھی، عشوہ بھی اور غمزہ بھی، رعنائی بھی اور دلربائی بھی۔ جن صفات کی حامل ذات کی یاد ہو گی، اُسی کی صفات کو ساتھ لے کر آئے گی۔ تنہائی یاد میں ممکن ہی نہیں، تنہا تو وہ غیر سے بناتی ہے اور کریم ذات میں مشغول کر دیتی ہے۔ مشغولیّت اس کا فیضان ہوتا ہے۔ غم میں جب خدا کی یاد مونس بن جائے تو تنہائی اور بے دلی کیسی؟ وہ تو کیف و سرور کی ساعتیں ہوتی ہیں۔ اس وقت خدا بندے سے دور نہیں ہوتا، مذکور ذاکر کو تسکین دینے کے لئے پہلو میں آ بیٹھتا

ہے - پکارنے والے کی صدائیں سنتا ہے اور تسکین بخشتا ہے - ہر آواز میں تسکین ہوتی ہے، ہر آنسو تسکین بن جاتا ہے، ہر دھڑکن میں مزے آنے لگتے ہیں - آنسو، آواز اور دھڑکن سب اسی کی تسکین کے پیامبر بن جاتے ہیں -

رضا کے چمنستان

عبودیت نام ہے اپنے اختیارات سے دستبردار ہو جانے اور اپنے خالق و مالک کے اختیارات کو تسلیم کر لینے کا - جب تک اپنے اختیارات کی نفی نہ ہو اپنے خالق و مالک کے اختیارات کی برتری کا مزا نہیں آتا بندے اور رب میں ایک دائمی کشمکش جاری رہتی ہے جو انسان سے زندگی کا صبر و سکون چھین لیتی ہے - انسان اپنے رب کی رضا کو اپنی مرضی کے تابع بنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور خدا کا حکم جاری ہو کر رہتا ہے - ایسی صورت میں چونکہ خدا کا فیصلہ بندے کے فیصلے کے خلاف ہوتا ہے اس لئے وہ تڑپ اٹھتا ہے - چیخنے لگتا ہے - واویلا کرتا ہے اور شور و غوغے سے زندگی کے سارے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیتا ہے یہ بد ہی خدا کی نافرمانی کا نتیجہ ہوتی ہے - جو لوگ خدا کی رضا کو برضا و رغبت قبول کر لیتے ہیں - اپنی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ دیکھ کر برہم نہیں ہوتے بلکہ اسے اپنے حق میں نافع اور منفعت بخش جان کر خوش ہونے لگتے ہیں ان کی زندگی صبر و سکون کا گہوارہ بن جاتی ہے زندگی کے سمندر سے جو موج بھی اٹھتی ہے وہ نشاط پرور اور نشاط آفریں بن جاتی ہے ان موجوں کا خرام کسی اضطراب کا نتیجہ نہیں ہوتا - یہ خود نشاط کی پروردہ ہوتی ہیں اور نشاط ہی کی تخلیق کا باعث بنتی ہیں - نشاط نشاط کے بطن سے ظہور پاتی ہے نشاط بخشتی ہے - نشاط آشنا کر دیتی ہے غم و غصہ کی تخلیق سے نشاط آشنا جذبات پیدا نہیں ہو سکتے - مقربینِ حق کے متعلق قرآن میں یہ جو کہا گیا ہے کہ وہ کبھی حزن و ملال سے آشنا نہیں ہوتے - حزن و ملال کی گرد ان کے دامن کو نہیں چھو سکتی -

اُن کا دامن ازل سے پاک ہے اور ابد تک پاک رہے گا۔ تو اس کا یہی مفہوم ہے کہ وہ اپنے رب کے فیصلوں کو دیکھ کر کبھی ملول نہیں ہوتے رضا میں ڈھل جانے کے بعد انہیں ایسی طمانیت نصیب ہو جاتی ہے جو حزن و ملال کی شورشوں سے بہت دور ہوتی ہے۔ حزن و ملال کی اس دنیا تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ حزن و ملال سفلی جہان کی چیزیں ہیں۔ عالمِ علوی میں نہ حزن ہے نہ ملال۔ وہاں رضا کے پھول کھلے ہیں۔ رضا کے چمنستان لہلاتے ہیں، جن کی خوشبو روح کو مست کر دیتی ہے ایسے جہان میں حزن و ملال کا گذر کہاں؟

خدا کے مقبول بندے جو مصائب و آلام کی زندگی میں خوش و خرّم رہتے ہیں وہ رضا کی کمان سے نکلے ہوئے ہر تیر کو اپنے لئے نعمت جانتے ہیں جب وہ اس تیر کو سینے سے لگاتے ہیں اُسے یار کا تحفہ سمجھ کر خوش ہوتے ہیں تو اُن کی یہی خوشی اور خرّمی بارگاہِ حق میں قبول ہو جاتی ہے۔ رضا کے یہی تیر اور مزا دیتے ہیں اور کیفیتیں بخشتے ہیں اور ہر کیفیت ایک نئے جہان کی پروردگار بن جاتی ہے۔

عالمِ علوی کی فضائیں عالمِ سفلی کی فضاؤں کی طرح کثیف نہیں۔ وہ سراسر لطافت و نظافت سے عبارت ہیں۔ وہاں غم و آلام کے بادل سایہ افگن نہیں ہو سکتے۔ حزن و ملال کا گرد و غبار ان کی لطافت کو مجروح نہیں کر سکتا۔ وہاں تو رضا کے حسن و جمال کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ رضا کے آئینے میں صاحبِ جمال کا عکس نظر آتا ہے عکس کی دلکشی ناظر کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور اسے اِدھر اُدھر دیکھنے کی فرصت نہیں دیتی۔

محبّت کی بے قراری چونکہ رضا کے حصول کے لئے ہوتی ہے۔ اسی لئے نعمت کہلاتی ہے ہوس رضا کی گاہک ہی نہیں وہ اس بازار میں خریدار بن کر کبھی آئی ہی نہیں اسی لئے اس کی جھولی میں رضا کا سودا کبھی نہیں پڑا، اس نے یہ جنس کبھی نہیں خریدی اسی لئے اس باب میں اُس کی رائے معتبر نہیں، وہ محبّت کے بازار میں غیر معتبر سمجھی جاتی ہے اور محبّت کبھی خریدار بن کر ہوس کی منڈی میں نہیں گئی اس لئے اس کی وہاں کوئی جان پہچان نہیں۔ دونوں

میں نہ کبھی شناسائی ہوئی ہے اور نہ ہو گی۔ ایک کا قول دوسرے کے لیے غیر معتبر ہے ای لئے کہا گیا ہے کہ محبّت کا مال مطلوب ہو تو محبّت کی منڈی میں آنا چاہیئے یہاں ہوس کی عیّاریاں کام نہیں دیتیں، اس کا کھوٹ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس منڈی کے دلّال بھی سچّے ہیں اور اور خریداروں کا صدق بھی کذب کے احتمال سے پاک ہے۔ پاکیزگی ہی پاکیزگی کی گاہک بن کر آتی ہے اور پاکیزگی ہی نوازتی ہے۔

حجاب اور پردہ

بعض رشتے ازلی ہوتے ہیں، زمان و مکان کی دیوار اُن کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی سورج، چاند کا رشتہ بھی زمین سے ازلی ہے۔ ستارے بھی زمین سے ازلی تعلق رکھتے ہیں وہ اپنی ضوباریوں کے وقت انسانوں سے کوئی امتیاز نہیں برتتے۔ اسود و احمر دونوں پر اپنا نور ڈالتے ہیں۔ ان کی ضوباریوں کے لئے کوئی جگہ مخصوص نہیں، خدا کا نور کسی رنگ اور شکل یہ تو وہ کسی سے بخل نہیں برتتا، خدا کا نور لطیف ہے اور لطیف کا خاصہ ہے کہ وہ کثافت کا پابند نہیں ہوتا، جس رنگ اور جس شکل میں ظاہر ہو، آزاد ہوتا ہے۔ بھنگی بھی اگر گلاب کا پھول سونگھے تو اُسے خوشبو آئے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی استعداد کی کمی کے باعث خوشبو سے پوری طرح استفادہ نہ کر سکے۔ زنگی سے بھی آئینہ کوئی بیر نہیں رکھتا اسے اس کی صورت دکھا دیتا ہے۔ لطافت جہاں بھی ہو گی، فیّاض ہو گی۔ انسانی ذہن کی کھینچی ہوئی حدود اُسے پابند نہیں بنا سکتیں، نہ خوشبو محدود ہے نہ ہوا اور نہ آفتاب و ماہتاب کا نور، ہاں اگر کوئی آفتاب کے سامنے دیوار کھڑی کر دے تو آفتاب اسے نور بخشنے کے لئے نیچے نہیں اتر آتا، ہر عظیم ذات کی فطرت میں بے نیازی بھی ہوتی ہے، بے نیازی کو اس سے جدا کر دیا جائے تو اس کی عظمتیں مجروح ہو جاتی ہیں، جہاں عظمت ہو گی، وہاں ناز بھی ہو گا اور بے نیازی کی شان بھی۔ سابقہ جب بے نیاز سے ہو تو بے نیازی کام نہیں دیتی۔ وہاں عجز و نیاز ہی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ آفتاب کی

طرف پشت ہوگی، تو جمال نظر نہیں آئے گا۔ ہاں آفتاب کی موجودگی کا احساس ضرور ہوگا۔ ایسے ہی بعض لوگ ذاتِ واجب الوجود کی موجودگی کا احساس ہونے کے باوجود زندگی سے محروم رہتے ہیں۔ نہ ان کے دل میں جمال کی کوئی طلب پیدا ہوتی ہے، اور نہ آفتابِ جمال اپنے مقام سے نیچے اتر کر انہیں دعوتِ جمال دیتا ہے۔ جمال تو حصہ ہی نیازمندوں کا ہے۔ غافل اور جمال سے بے نیازی برتنے والا دیکھ بھی لے تو اس پر جمال کے وہ اسرار منکشف نہیں ہوتے جو دیدہ وروں کو نصیب ہوتے ہیں۔ پھول کا جمال بلبل کو مستیاں عطا کرتا ہے، اور زاغ و زغن کو دیکھ لینے کے باوجود بھی لذت آشنا نہیں بناتا۔ فریاد و فغاں صرف بلبل کا حصہ ہے۔ لذت کبھی فریاد و فغاں کی صورت میں بھی وارد ہوتی ہے۔

جمال کے سینکڑوں روپ اور رنگ ہیں وہ جس روپ میں آئے حسین معلوم ہوتا ہے، جس رنگ میں جلوہ گری کرے، دل کو لبھاتا ہے۔ بلالؓ کا جمال، حسین تھا، اسی لئے صدیقؓ کو خریدار بن کر آنا پڑا۔ ابوذر غفاریؓ اگر حسین نہ ہوتے تو علیؓ کو تین دن مہمانی کے فرائض سرانجام دینے کی کیا ضرورت تھی؟ بر قعے دو مختلف تھے، ایک غفار کے قبیلے کا سرخ و سفید اور ایک حبشی نژاد کالا ہے۔ لیکن حسن کی جلوہ گری دونوں میں تھی دونوں میں ایک ذات کا نور پرتو افگن تھا۔ اس لئے برقعے بھی حسین ہو گئے، دونوں کی عشق کی منڈی میں مانگ بڑھ گئی۔ صدیقؓ بھی خریدار بن کر آگئے اور علیؓ بھی۔ پردہ ہمیشہ پردہ دار کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسی کی شان کو آشکار کرتا ہے جو اندر چھپا ہو۔ اندر نور موجود ہو تو پیشانی بھی نور کی آئینہ دار بن جاتی ہے، اور گفتار و کردار میں بھی نور کی جھلک نظر آنے لگتی ہے، ہر حسین پردے میں اپنی خصوصیات لے کر آتا ہے۔ جمال بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے اور جلال بھی گفتار بھی اور کردار بھی، عشوہ اور غمزہ بھی، ناز اور نیاز بھی جفا بھی اور ادا بھی، لیکن جلال غیروں کے لئے ہوتا ہے اور جمال اپنوں کے لئے، اپنوں

کو اگر شانِ جلالی دکھائی بھی جاتی ہے، تو اور گرویدہ بنانے کے لئے اور لوٹنے کے لئے۔ اور غیروں کے لئے یہی جلال عذاب بن جاتا ہے، انہیں جلال کے ذریعے دُور رکھنا مقصود ہوتا ہے۔

خدا تعالےٰ جب اپنے دوستوں کو شانِ جلالی دکھاتا ہے، تو اس کے ذریعے آتشِ شوق کو بھڑکانا مقصود ہوتا ہے۔ غیروں کے لئے یہی جلال حجاب اور پردہ بن جاتا ہے، وہ اور دُور ہو جاتے ہیں۔ جلال بھی اگر مزا دے تو قرب کا ذریعہ ہے ورنہ حجاب اور پردہ، اور حجاب اور پردے میں شناسائی کی لذت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہاں شناسائی اور معرفت کے بعد جو حجاب ہوتا ہے، وہ بھی انعام کہلاتا ہے، کیوں کہ اس کے ذریعے دوری اور مہجوری مقصود نہیں ہوتی، بلکہ آتشِ شوق کو بھڑکا کر قریب لانا مقصود ہوتا ہے۔ مقربینِ حق حجاب میں رہ کر بھی بے مزا نہیں ہوتے۔ حجاب اُن کے لئے یار کے حسن کا آئینہ بن جاتا ہے، جس کے ذریعے پے در پے تجلّیوں کی بارش ہوتی ہے، اور وہ مزے لوٹتے ہیں۔ اس حجاب کی حیثیت طوُر کی ہوتی ہے۔ غیروں کے ساتھ یہ سلوک ممکن نہیں ہوتا، وہ تو حضور میں رہ کر بھی جمال کے مزے نہیں لوٹ سکتے۔ آخر ابو جہل بھی تو قریب تھا، کیا اس پر جمال آشکار ہو سکا؟ اور اویس قرنی دور رہ کر بھی بے مزا نہ ہو سکے! ایک لمحہ کے لئے بھی جمال اُن سے مستور نہ تھا۔

انسانی حیات

انسان جسم وروح اور عقل کے مجموعے کا نام ہے اور اِن تینوں کی غذائیں مختلف ہیں۔ جسم کی غذا آب ودانہ ہے۔ عقل کی استدلال اور روح کی یادِ الٰہی۔ جسم کو استدلال کی ضرورت نہیں۔ وہ استدلال سے اپنی بقا قائم نہیں رکھ سکتا۔ عقل آب ودانہ کی محتاج نہیں، وہ استدلال چاہتی ہے اور اسی پر اس کی نشوونما منحصر ہے اور ایسے ہی روح کی غذا اِن دونوں

سے جداگانہ ہے۔ یادِ الٰہی کی غذا ملتی رہے تو اس کی زندگی قائم رہتی ہے۔ اسے بقا نصیب ہوتی ہے۔ تاب و تواں ملتی ہے اور اس کی قوتیں اعجاز نمائی کے قابل ہو سکتی ہیں۔ کثیف کی غذا کثیف ہوتی ہے اور لطیف کی الطیف۔ روح چونکہ خالصتاً لطیف چیز ہے۔ اس کی تخلیق امرِ ربی سے ہوئی ہے، اس لئے امرِ ربی ہی کو اس کی غذا بنا دیا گیا ہے۔ عقل کی تخلیق عناصر سے ظہور پانے والے انسانی ڈھانچے کی صحت کی منت پذیر ہے اس لئے اس کی غذا روح کی غذا کی نسبت کم لطیف ہے۔ استدلال کو سنا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن روح کی غذا سماعت سے تعلق نہیں رکھتی۔ اور وہ بھی روح کی طرح سمجھ میں آنے والی چیز نہیں۔ اسے تو صرف روح ہی محسوس کر سکتی ہے۔ یادِ الٰہی جب روح میں پیوست ہو جاتی ہے تو روح کو طمانیت نصیب ہوتی ہے طمانیت یاد سے ملتی ہے۔ جسمانی غذاؤں کی فراوانی روحانی غذاؤں کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ فانی کی غذا بھی فانی ہے اور باقی کی باقی، ذکر مٹنے والی چیز نہیں۔ یہ ایک حیّ و قیوم ذات کی صفت ہے۔ ذات چونکہ باقی ہے اس لئے اس صفت کو بھی زوال نہیں، باقی سے وابستگی انسان کو بقا کی لذتوں سے آشنا کر دیتی ہے۔ مذکور کی ذات میں محویت کا نام ذکر ہے اور جب یہ محویت نصیب ہو جاتی ہے تو انسان حیّ و قیوم ذات کی پناہ میں آجاتا ہے باقی ذات کی پناہ دوام بخشتی ہے۔ دوام عطا کرتی ہے اور اس نعمت کا شکر انسان کو ایک دائمی کیفیت عطا کرتا ہے۔ اس کیفیت کو بھی شکر کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ جنت میں شکر ہوگا۔ صبر نہیں ہوگا۔ کیونکہ صبر بلا پر ہوتا ہے اور شکر عطا پر۔ جس ذکر نے انسان کو عطا کی منزل پر پہنچایا ہوگا وہ وہاں بھی انسان سے جدا نہ ہوگا۔ جدائی تو اجنبیوں میں ہوتی ہے اور شکر ہمیشہ سے انیس رہا تھا۔ رہبر بھی وہی تھا اور منزل کی معرفت بھی اسی نے عطا کی تھی۔ منزل پر پہنچ کر وہ کیسے جدا ہو جاتا؟ دل میں سمائی ہوئی اور احساسات کو لذت عطا کرنے والی چیز کو دل سے کون جدا کر سکتا ہے؟

جسم کی غذائیں اسی وقت تک کے لئے ہیں جب تک جسم موجود ہو اور عقل کی غذائیں بھی ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں، اس لئے کہ عقل بھی فانی ہے۔ اس کا انحصار بھی جسم

پر موقوف ہے۔ دلیل و برہان بھی مٹ جانے والی چیزیں ہیں۔ اس لئے کہ ان کا تعلق بھی عقل سے ہے۔ اخروی زندگی میں نہ دلیل ہو گی نہ برہان۔ وہاں تو مشاہدہ ہو گا اور مشاہدہ ہر دلیل کو باطل کر دیتا ہے۔ لیکن دلیل مشاہدے کو باطل نہیں کر سکتی یہ تو عالم ناسوت میں بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ دلیل مشاہدے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حالاں کہ یہاں ناظر و منظور دونوں فانی ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ مشاہدے کی کارفرمائی مسلّم ہوتی ہے لیکن آخرت کی منزل میں تو ناظر و منظور دونوں باقی ہوں گے روح کو بھی بقا نصیب ہو گی اور صاحبِ جمال ذات کا جمال بھی غیر فانی ہو گا۔ مشاہدے کی وسعتیں غیر فانی اور غیر محدود ہوں گی۔ ناظر بھی باقی ہو گا اور منظور بھی۔ عقبیٰ کی منزل کی ابتدا ہی ایسی بقا سے ہو گی۔ جو کبھی فنا پذیر نہ ہو گی بلکہ وہاں فنا کا تصور ہی ناپید ہو گا۔ ابدی حسن کی جلوہ گری غیر کی شرکت کو قبول نہ کرے گی۔ وہاں غیر کا گذر ممکن نہ ہو گا۔ محرم کی انجمن میں محرم بار پائے گا۔ سمع۔ بصر اور ایسی ہی دوسری قوتیں جن کا تعلق عناصر سے ترکیب پانے والے انسانی ڈھانچے سے ہے وہاں نہ ہوں گی۔ وہاں روح کے احساسات و مدرکات کام دیں گے۔ روح کی اپنی سماعت ہو گی اور اپنی بصارت۔ وجدان و شعور بھی اُس کا اپنا ہو گا اور احساس بھی اپنا۔ کیوں کہ فنا کے بطن سے ظہور پانے والی چیزیں بھی فانی ہوتی ہیں اور بقا کی دنیا کا ہر کرشمہ باقی رہتا ہے۔ نہ اس کے جلووں کو فنا ہے۔ نہ جلووں سے لذّت گیر ہونے والے احساس و شعور کو۔ فنا جو احساس و شعور عطا کرتی ہے وُہ فانی ہوتا ہے۔ بقا کے احساس و شعور کو موت نہیں وُہ مر نہیں سکتا۔ اس لئے کہ وُہ ایک باقی ذات کی عطا کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن میں یہ جو کہا گیا ہے کہ جو یہاں اندھا ہے وہاں بھی اندھا ہو گا۔ تو اس سے ظاہری بصارت مراد نہیں بلکہ باطن کی بصیرت مراد ہے۔ بصارت کا تعلق ظاہری حیات سے ہے اور بصیرت کا باطنی حیات سے۔ یہاں دل کو زندگی نہ مل سکے گی تو وہ وہاں بھی محروم رہے گا۔ محرومی اس کا مقدر بن جائے گی۔

حال و قال

محدود ذات عطا و بخشش کے وقت مستحق اور غیر مستحق میں امتیاز برتتی ہے کیونکہ اُسے اپنے خزانے کے کم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ غیر محدود ذات کو چونکہ ایسا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا اس لئے اس کی عطا کا دامن بھی دراز ہوتا ہے۔ مستحق اور غیر مستحق میں فرق یُوں بھی وہ اپنی شانِ کرم کے منافی سمجھتی ہے وہاں تو اسی کو مستحق سمجھا جاتا ہے جو کرم کی زد میں آجائے خود کو کرم کا اہل ثابت کر دے اور یہ ثبوت کبھی حال سے ہوتا ہے اور کبھی قال سے، کریم ذات کو حال پسند آجائے تو قال کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قال بھی کبھی مزا دے جاتا ہے بشرطیکہ سوز و درد کا حامل ہو بہر حال، قال کی اس وقت تک ضرورت باقی رہتی ہے جب تک حال قابلِ کرم نہیں بنتا، حال حسین و دلآویز ہو یا اس درجہ شکستہ ہو کہ کریم ذات کے لئے تغافل برتنا ممکن نہ رہ جائے تو قیل و قال نہ بھی ہو تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ حال کی شکستگی قال کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتی بلکہ شکستہ حال کی قال کے ذریعے وضاحت کی جائے تو بعض اوقات یہ وضاحت گراں معلوم ہونے لگتی ہے۔ حال کی شکستگی ہی جب حال کی مفسّر بن جائے تو ایسی ساعتیں کریم ذات کی بارگاہ میں مقبولیّت عطا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ عظیم ذات، خراج کی محتاج نہیں ہوتی اس کے رحم و کرم کو تو اداؤں کے ذریعے متحرک کیا جا سکتا ہے۔ بس صرف یہ یقین دلانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ میں بندہ ہوں اور آپ خواجہ ہیں۔ میری تمام ضرورتیں اور حاجتیں آپ ہی کے دامنِ کرم سے وابستہ ہیں۔ بندہ جب خواجہ کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو فائز المرام کہلاتا ہے خواجہ کی نظروں میں مقبول بننے کے بعد وہ اسی نسبت سے بیش و کم کی فکر سے آزاد ہو جاتا ہے جتنا اسے خواجہ کی نظروں میں مقام حاصل ہو جائے اور خواجہ کے اختیارات کی سلطنت وسیع ہو۔

حکمت کے موتی

گناہ ہیں حجابات ہوتے ہیں اسی لئے معصیت کار انسان نہ اپنے رب کے کلام سے لطف اندوز ہو سکتا ہے، نہ اسے عبادت ہی میں مزا آتا ہے۔ مراسمِ محبّت کی تکمیل کے لئے اور سلاسلِ ارتباط و اختلاط سے لطف اندوزی کی خاطر اُن حجابات کا اٹھنا ضروری ہوتا ہے جن کی موجودگی میں نہ کھل کر بات ہو سکتی ہے، نہ قرب ہی نصیب ہو سکتا ہے۔ حجاب نام ہی دُوری کا ہے۔ دو ذاتوں میں انتہائی قرب کے باوجود اگر دلوں کا فاصلہ موجود ہو تو ایسا قرب مفید نہیں ہوتا۔ قرب تو وہی سُود مند ثابت ہوتا ہے جو دلوں کے فاصلے طے ہونے کے بعد حاصل ہو۔ ایسے قرب میں ایک کے لئے دُوسرے کی بات کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ محبّت مفسّر بن کر مشکل سے مشکل مفہوم کو آسان بنا دیتی ہے۔ چنانچہ تکمیلِ تعلق کے بعد ایک ایسا مرحلہ بھی آجاتا ہے، جہاں لفظ و بیاں کی ضرورت باقی نہیں رہتی، مفاہیم خود بخود آشکارا ہونے لگتے ہیں۔ الفاظ کو نیا پیرایۂ بیان ملتا ہے، نطق کو نئی طرز عطا ہوتی ہے اور زبان حکمت کے موتی رولنے لگتی ہے۔ تعلق میں تو بے خبری ہو ہی نہیں سکتی۔ خبر تو نام ہی تعلق کے شاہد کا ہے۔ جیسی حسین ذات سے تعلق ہو گا، خبر بھی ویسی ہی حسین اور دل آویز ہو گی۔ قرآن فہمی کے لئے یہ جو تقویٰ شعاری کی شرط لگائی گئی ہے، یہ بلا سبب نہیں۔ حسین و جمیل آئینے ہی میں آفتاب کا نُور منعکس ہو سکتا ہے۔ اندھا خود کیا دیکھے گا اور دوسروں کو کیا خبر دے گا؟ لغت سے آگاہی الفاظ کے در و بست کی خبر تو ہو سکتی ہے، لیکن اُسے ذات سے تعلق کی دلیل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ذات سے تعلق کے بعد لغت نہیں بولتی، بلکہ تعلق بولتا ہے۔

ملکوتی تصوّرات

حضرت امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ نمازی اگر غلطی سے دوسری رکعت میں التحیات کے بعد درود شریف پڑھ لے تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہو جاتا ہے امام رح نے جب ابتدا میں یہ فتویٰ دیا تو بعض لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی اور انہوں نے امام رح سے سوال کیا کہ درود شریف پڑھنے سے سجدۂ سہو کیوں؟ یہ تو بڑی عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سجدۂ سہو درود شریف پڑھنے پر نہیں، یہ تو اس لیے ہے کہ یہ بھول کر کیوں پڑھا گیا۔ یہ تو پورے حضورِ قلب کے ساتھ پڑھنا چاہیئے۔ حضوری کے بغیر درود شریف پڑھنے پر امام رح کے نزدیک سجدۂ سہو لازم آجاتا ہے وہ غفلت کو معاف نہیں کرتے، یہ ان کی نظر ہے، ان کا قول ہے، ان کا فتویٰ ہے۔ اگر وہ اپنے اس نظریئے کی وضاحت نہ کرتے تو شاید ہم اس کی حقیقت تک نہ پہنچ سکتے۔ ملکوتی خیالات کی تشریح و توضیح کے لیے بھی انسان کو ملکوتی تصوّرات و جذبات کا حامل ہونا چاہیئے۔ صفات میں ملکوتی شان کی جھلک نہ ہو، جذبات میں پاکیزگی اور خیالات میں لطافت و نظافت نہ ہو تو انسان ربانی نظریات کا ترجمان نہیں بن سکتا۔

ذہن و فکر اور قلب و روح کی تطہیر اس راہ کی شرطِ اوّل ہے۔ انشراحِ صدر کی دولت میراثِ نبوّت ہے، یہ انہی لوگوں کو ملتی ہے جو پیمبرانہ صفات کے حامل ہوں۔ ابوجہل کی راہ پر چل کر اور ابولہب کا طرزِ عمل اختیار کرنے کے بعد جو لوگ ربّانی نظریات کی تشریح و توضیح کرنے کے لیے اٹھتے ہیں، وہ ہنگامی طور پر داد بھی وصول کر لیتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کو گمراہ کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن وہ ہدایت کی منزل کے رہبر نہیں ہو سکتے، اس مقصد کے لئے تقویٰ شعاری کی ضرورت ہوتی ہے۔

حقیقت آفریں

محنت میں اجرت ملتی ہے اور تعلق میں انعام، تحفہ، یار کی نشانی۔ تعلق کے تحفے کو عقل کے پیمانہ سے نہیں ناپا جاتا اس کا حجم اور قطر نہیں دیکھا جاتا وہ تو یار کے جمال کا آئینہ ہوتا ہے بادی النظر میں خواہ کتنا ہی قلیل اور فرد مایہ کیوں نہ ہو! قلیل وہ عقل کے نزدیک ہوتا ہے محبّت اسے قلیل نہیں جانتی۔ اگر کوئی اس کی طرف قلّت کی نسبت کر دے تو محبّت تڑپ اٹھتی ہے۔ بےچین ہو جاتی ہے۔ دراصل محبّت، تعلّق، رحمت اور شفقت کے انعامات مزدوروں اور تاجروں کے لیئے ہوتے ہی نہیں۔ تحفہ تو اس لیئے دیا جاتا ہے کہ لینے والا یہ سمجھ لے کہ وہ معطی کی یاد میں ہے اسے فراموش نہیں کیا گیا یہ اپنی عطا کا تذکرہ بنانے کے لئے دیا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعے یاد کیا جائے۔ محبت تسکین پائے۔ روح کو آسودگی حاصل ہو۔ دل کے شعلے جوان ہوں۔ تعلق کو ادر پائیداری نصیب ہو۔ عظیم عطا سے گر تو گدا بھی خوش ہو جاتا ہے اپنے منعم کے جود و کرم کا قصیدہ پڑھنے لگتا ہے۔ قلیل عطا اپنوں کے لیئے ہوتی ہے اور محبّت کے ہاتھوں سے پہنچا ہوا پھول بھی عظیم نعمت نظر آنے لگتا ہے۔ اس کی مہک میں اپنی محبت کی خوشبو محسوس ہونے لگتی ہے۔ گدا بارگاہِ جمال سے ایک پھول لے کر خوش نہیں ہو سکتا وہ تو زر و سیم چاہے گا، خلعتیں مانگے گا۔ محبت نے کبھی خلعت طلب نہیں کیا وہ تو شکستہ پیوند لے کر بھی رقص کرنے لگتی ہے۔ بارگاہِ جمال سے ملنے والا ایک تار بھی اسے خوش کر دیتا ہے۔ محبوب ذات کی کوئی عطا بے حقیقت نہیں ہو سکتی وہ تو حقیقت آفرین ہوتی ہے۔

جذبہ اور تجلّی

حضرت ابوہریرہ رضؓ کو حضورؐ نے ایک دن چھوڑ کر ملنے کی تاکید فرمائی تھی اور تیسرے دن ملنے کی وجہ یہ بیان فرمائی تھی کہ یوں محبّت میں زیادتی ہو گی۔ عشق کا جذبہ سرد نہیں ہونے پائے گا۔

رسالتؐ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ محبّت کو جوان دیکھنا چاہتے تھے۔ جذباتِ محبّت کی افسردگی یا کمی حضورؐ کو پسند نہ تھی۔ حضورؐ کو وہی محبت عزیز تھی جس کے شعلے جوان ہوں جو تند و تیز ہو محبت کی صہبا کی تندی اگر ختم ہو جائے تو اس کا رُوپ ڈھل جاتا ہے وہ جوان نہیں کہلاتی۔ روح و قلب پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اور اس سے معجزانہ کارناموں کا صدور ممکن نہیں ہوتا۔ معجزانہ کارنامے تو عشق و محبّت کا وہی جذبہ سر انجام دے سکتا ہے جو جوان ہو جس کی گرمی لوہے کو گداز کر دے پتھر دل کو جلا کر خاک کر دے۔ طُور پہ موسیٰ علیہ السّلام کے دل کی گرمی ہی تو تھی جس نے تجلّی کو بے نقاب کر دیا تھا تجلّی برقِ جمال بن کر طُور پر اتر آئی پتھروں کے جگر پانی ہو گئے طُور شعلہ بن گیا لیکن موسیٰ علیہ السلام کے بدن پر آنچ نہ آئی۔ تجلّی ایک ہی تھی۔ لیکن اس کے اثرات مختلف تھے۔ پتھروں نے اور اثر لیا اور کلیم اللہ نے اور کوئی خاکستر بن گیا۔ اور کوئی سلامت رہا۔ کسی کے ظاہر پر تجلّی اثر انداز ہوتی۔ اور کسی کے باطن پہ ظاہر والوں نے ظاہری اثر لیا۔ اور باطن والے نے باطنی۔ باطن والے کا باطن تجلّیات سے معمور ہو گیا۔ کوئی ٹھنڈا اور سرد جذبہ رب تعالیٰ کی تجلّیات کو کیا بے حجاب کرے گا؟ وہ تو بندے کے دل کی تجلّی کو دعوتِ خرام نہیں دے سکتا۔ خرام کی دعوت دل سے اٹھتی ہے، جذبہ بن کر نمودار ہوتی ہے اور تجلّیات کا مورد بنتی ہے۔ تجلّیات نتیجہ ہی جذبے کا ہیں۔ جذبے اور تجلّی کا بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ جذبہ ہو گا تو تجلّی وارد ہو گی بے دلی کے مقدر میں تجلّیات کہاں؟

ایمن اور طُور

تجلّی طُور پر بھی وہی تھی جب موسیٰ علیہ السّلام مدین سے مصر کی طرف لوٹتے ہوئے وادئ ایمن میں دیکھ چکے تھے۔ لیکن طُور کے اثرات مختلف تھے اور وادئ ایمن کے مختلف۔ وہاں تجلّی نے بلا طلب ظہور کیا تھا۔ اور طُور کی تجلّی موسیٰ علیہ السلام کے سوال کا جواب تھی۔ وہاں آئینۂ جمال ایمن تھا۔ اور یہاں طُور، آئینے کے مختلف ہونے کے باعث تجلّیات کے اثرات بھی مختلف ہو گئے۔ ایمن میں آگ نظر

آئی تو حواس متاثر نہ ہوئے ۔ آگ جلوہ تھی، تجلّی تھی۔ ایک نور جو حواس سے ورا اور عقل و فہم کی گرفت میں نہ آنے والی صورت۔ لیکن فروغِ تقلیب و نظر بنی ۔ جذبات کو نئی زندگی عطا کرنے کا موجب ثابت ہوئی ۔ اسی کے خنک سائے میں محبّت بھری گفتگو ہوئی ۔ انعامات پائے ۔ عصا اور یدِ بیضا ملا اور مستقبل کا پروگرام مرتّب ہوا ۔ ایمن آغاز تھا اور طُور انجام ۔ یہاں ترغیب و تحریص بھی تھی اور تسلّی بھی اور وہاں صرف انوار کی بارش، تجلّیات کا ظہور، راز و نیاز کی باتیں ۔ دونوں مقامات کی تفصیلات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا رنگ اور اثر جداگانہ تھا۔ اسی لئے مقامات کے اثرات سے بھی انکار ممکن نہیں۔ جلوہ جس نوع کا ہوگا مقام کو وہی خصوصیت عطا کرے گا ۔ حجرِ اسود کی بوسہ زنی کو بعض ظاہر بین مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں ۔ وہ جلوے اور مقام کے تعلق سے آگاہ نہیں ۔ جلوہ، مقام کو مکرّم بنا دیتا ہے ۔ اس کی ہیئت اور حیثیت بدل دیتا ہے کوہ ہو تو طور بن جاتا ہے ۔ وادی ہو تو ایمن کہلاتی ہے ۔ سنگ ہو تو حجرِ اسود نام پاتا ہے ۔ یہ انوار کی اثر آفرینی اور جلوے کی بے حجابی کا کرشمہ ہے ۔ یہی جلوہ دل میں اتر آئے تو دل خون کا لوتھڑا نہیں رہتا بلکہ حریمِ جمال کہلاتا ہے ۔ طورِ دل نام پاتا ہے اس کی خاک بھی بے شرر نہیں رہتی ۔

بدرِ منیر

ثنیّتہ الوداع کی وہ گھاٹی جو بعثتِ رسولؐ سے پہلے محض ایک علامت اور نشان کی حیثیت رکھتی تھی ۔ حضورؐ کے مدینہ آجانے کے بعد تاریخِ محبّت کا عنوان بن گئی ۔ رسالت کا بدرِ منیر مدینہ کے افق پر جلوہ بار ہونے سے پہلے اسی پر چمکا تھا ۔ یہیں اس کی شعاعیں پڑی تھیں ۔ اسی نے اس کا پہلا جلوہ دیکھا تھا ۔ اسی اعزاز و اکرام نے اسے محبّت کے طُور کی حیثیت دے دی ۔ مدینہ کی خواتین کی زبان پر محبّت کا جو پہلا زمزمہ نعتِ رسولؐ بن کر آیا تھا اس میں اس گھاٹی کا بھی ذکر تھا ۔ گھاٹی مذکور بن گئی ۔ خواتین کی محبت ذاکر تھی اور گھاٹی مذکورہ ،

وہ کہہ رہی تھیں بدرِ منیر اسی افق سے طلوع ہُوا ہے

اب ہم پر اللہ کا شکر واجب ہو گیا ہے کیونکہ آنے والا ایسی شان کے ساتھ آیا ہے جو دلکش ہے شیفتگی کا جو جذبہ، نعت بن کر فضاؤں میں نغمے بکھیر رہا تھا اس کی تخلیق محبّت کے بطون میں ہوئی تھی وہ محبت کا غمّاز تھا۔ عشق کا پروردگار بن کر ابھرا اور دلوں کو سوز آشنا کر گیا۔ رسالت نے اس کی پذیرائی کی۔ حضورؐ نے ان نغموں کو سنا۔ صدا کی معراج یہ ہے کہ وہ محبوب کے کانوں تک پہنچ جائے۔ محبوب اُسے سُن لے اور جب عشق کو یہ معلوم ہو کہ حسن متوّجہ ہے، گوش برآواز ہے تو وہ دل کا سارا درد انڈیل دیتا ہے، سراپا سوز بن جاتا ہے عقل اس کی لذت و کیفیت کو نہیں پہنچ سکتی۔ مدینے کی خواتین کی لذّت عطائے جمال تھی۔ حضورؐ خاموش تھے اور یہ خاموشی حضورؐ کی داد تھی۔ مدینے کی معصوم بچّیوں اور ان کی ہمنوا خواتین نے جن طربیہ اشعار کے ساتھ حضور علیہ السلام کا استقبال کیا تھا، اُن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نبوت کے مقام و منصب اور مفہوم سے وُہ پُوری طرح آشنا تھیں جو مفہوم علم و دانش کے مدّعیوں پر نہیں کھلا اور جس کے سمجھنے میں وہ سرگرداں نظر آتے ہیں وہ ان پر آشکار تھا وہ حضورؐ کو بدرِ منیر کہہ رہی تھیں اور اس کے لئے انہیں کسی دلیل کی ضرورت نہ تھی یہ اُن کی محبت کا فتویٰ تھا۔ ان کے ذوق کا معاملہ تھا۔ محبت کی دنیا میں جب محبت فتویٰ صادر کرتی ہے تو وہ غلط نہیں ہوتا۔ یہ علم کے فتویٰ کی طرح بدلتا نہیں، سند بن جاتا ہے، قبول ہوتا ہے، شایانِ نوازش بنتا ہے، دلوں کو زندگی عطا کرتا ہے۔ محبت کی بارگاہ سے صادر ہونے والے فتوے کو کبھی کسی نے مشکوک نگاہوں سے نہیں دیکھا اسے حق جانا ہے حق جان کر قبول کیا ہے چودھویں کا چاند غالباً سب سے پہلے حضورؐ کو مدینے کی بچیّوں نے کہا تھا۔ یہ احساس رب کی بارگاہ میں قبول ہو گیا۔ اسے دائمی شہرت مل گئی عقل اگر اس پر جزبز ہو تو وہ یہ خطاب چھین نہیں سکتی۔ مدینے کی بچیّوں نے بشریّت کے لباس میں آنے والے خدا کے محبوب کو دیکھا تو وُہ چیخ اٹھیں کہ یہ تو بدرِ منیر ہے۔ انصارؓ و مہاجرینؓ کی محبت نے یک زبان ہو کر فتویٰ دیا کہ

حق ہے اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ رسالت نے بھی اس نظریے کو غلط نہیں کہا۔ سنا اور قبول کیا۔ دلیل نہ کہنے والیوں نے دی، نہ سننے والوں نے مانگی۔ جو کہا قبول ہو گیا۔ سند پا گیا۔ دلوں سے نکلی ہوئی بات دلوں میں اتر گئی۔ جو مدینے کی بچیوں نے محسوس کیا تھا وہ دوسروں کو بھی محسوس ہونے لگا۔ وہ بھی ان جذبات سے کیف گیر ہونے لگے۔

مدینہ منورہ میں حضورؐ کی تشریف آوری کے وقت خواتین اور چھوٹی بچیوں نے بہجت و سرور کے عالم میں جو اشعار پڑھے تھے، اُن سے اُن کے نشاطیہ جذبات ہی کا اظہار نہ ہوتا تھا، بلکہ نبوت و رسالت کے باب میں اُن کا جو زاویۂ نگاہ تھا اُس کی بھی وضاحت ہوتی تھی۔ جذبہ جب لطیف بن جائے، احساسات میں تلاطم پیدا کر دے تو وہ اظہار کی راہیں تلاش کرنے لگتا ہے۔ شعر بھی اظہار و بیان کی ایک صورت ہے، یہ دل کا نغمہ ہے، روح کی آواز ہے۔ شعر کے آئینے میں ہم اُن لطیف تر جذبات کو بھی دیکھ سکتے ہیں جن کا صورت پذیر ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ آفتاب کا نور گرفت میں نہیں آتا لیکن آئینہ اُسے اپنے اندر لے کر واضح کرتا ہے تو اُس کی تپش و حرارت ناقابلِ برداشت بن جاتی ہے۔ غرض شعر احساس کا آئینہ ہے۔ جن احساسات کا اظہار حضورؐ کی تشریف آوری کے وقت مدینہ منورہ کی خواتین کی طرف سے اشعار کی صورت میں کیا گیا وہ اس اعتبار ہی سے اہم نہیں کہ وہ اُن لافانی ساعتوں کے آئینہ دار ہیں۔ جو مدنیوں کو نصیب ہوئی تھیں، ان کے ذریعے اُس منظر کی عکاسی کی گئی تھی جو غایت درجہ حسین تھا۔ بلکہ وہ ایمان واعتماد کے جلوؤں کو بھی واضح کرتے ہیں۔ خواتین نے یہ بھی کہا کہ آپ کی بعثت کا شکر ہم پہ اُس وقت تک واجب رہے گا جب تک زمین پر ایک بھی خدا کا نام لینے والا موجود ہو گا۔ یعنی جب تک نوعِ انسانی باقی ہے اُس وقت تک آپ کی بعثت کے شکر سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔ رب کا پکارنے والا یہ شکر ضرور ادا کرے گا۔

مدنی خواتین نے رسالت کا خیر مقدم کرتے وقت اپنے نعتیہ اشعار کے ذریعے یہ تو بتا دیا کہ بعثتِ رسولؐ کا شکر قیامت تک ہونا چاہیئے۔ لیکن شُکر کی نوعیت نہیں بتائی کہ یہ کیسے

ہونا چاہیئے ؟ غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں اس لئے محسوس نہیں ہوئی کہ شکر کے تمام مظاہر اُن کی نظروں کے سامنے تھے۔ حضورؐ کی تشریف آوری کی خبر سُن کر مدینہ منورہ کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ لوگ اجلے لباس میں ملبوس تھے۔ اُن کے چہروں پر مسرت کا نور تھا۔ خواتین شعر پڑھ رہی تھیں، اُن کی آواز کے ساتھ معصوم بچیوں کے نعت کے ترانے ملکر فضاؤں کو مسحور بنا رہے تھے، جوانوں کے دلوں کا کیف و سرور نیزہ بازی اور فنونِ حرب کے مظاہروں کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ غرض یہاں شعر و نغمہ بھی تھا اور حرب و ضرب کے مظاہرے بھی، مسرت کی لہریں بھی اور خوشیوں کا نور بھی، جلوس بھی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ بھی، اور یہ سب عشقِ رسولؐ کی کرشمہ سازیاں تھیں۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی غیر محمود نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ یہ صاحبِ مقامِ محمود کی محبت کا فیضان تھا۔ محبّت اپنی جلوہ گری کے لئے کئی رنگ بدلتی ہے، کئی روپوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ دلیل مانگتی نہیں دلیل دیتی ہے۔ اس کی تو یہ شان ہے کہ جو کہہ دے وہ دلیل بن جائے۔ جو جلوہ دکھا دے وہ برہان کی حیثیت اختیار کرلے۔ صاف ظاہر ہے کہ مدینے میں آمدِ رسولؐ کے موقع پر صحابہؓ اور صحابیاتؓ کی محبّت نے جو رنگ بدلا، جو وضع اختیار کی وہ دلائل و براہین کی منّت پذیر نہ تھی۔ محبّت کا تند و تیز جذبہ اٹھا اور مدینہ والوں کو مست و سرشار بنا گیا۔

توحید اور رسالت

تخلیق کسی کے سامنے پیش ہی اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ تخلیق کی داد دے، اسے سراہے۔ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا تو اُس کا مقصود بھی یہی تھا۔ اُن سے بھی داد طلب کی گئی۔ آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدے بھی داد ہی کی ایک صُورت تھی۔ تخلیق چونکہ بہت اعلیٰ تھی۔ اس لئے داد بھی اعلیٰ چاہی۔ سجدے سے بڑھ کر اور کیا داد ہوسکتی

ہے ؟ کسی مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھ کر اگر کوئی سجدے میں گر پڑے تو مصوّر کا دل باغ باغ ہو جائے گا۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر داد کی کوئی صُورت متصوّر نہیں ہو سکتی ۔ سجدہ ، غایتِ داد کا نام ہے ۔ فرشتوں کا سجدہ غایتِ داد تھی ۔ ابلیس کو یہ تصویر پسند نہ آئی ۔ اُس کا اعتراض یہ تھا کہ یہ مٹّی سے بنائی گئی ہے ۔ حالانکہ مٹّی سے ایسی صُورت بنا دینا کمال درجے کی صنّاعی تھی ۔ وہ مٹّی سے گزر کر تصویر کی خوبیوں تک نہ پہنچ سکا اور مردود قرار پایا ، لیکن فرشتوں نے مٹّی میں اپنے رب کی شان دیکھ لی ۔ ابلیس ہی پر کچھ موقوف نہیں ، ہر مغرور اور سرکش جب بھی کوئی شاہکار دیکھتا ہے تو تابناک اور جاذب پہلوؤں کو نظر انداز کر کے کمزور پہلوؤں کی تلاش میں لگ جاتا ہے ۔ تاکہ فنکار کی عظمتوں کا اعتراف نہ کرنا پڑے ، اس کی نظر اعلیٰ پر نہیں ، اسفل پر ہوتی ہے ۔ قریشِ مکّہ کو بھی قدرت کے آخری شاہکار میں کوئی خوبی نظر نہ آئی ۔ لے دے کے انہوں نے بشریت کو موضوعِ کلام بنا لیا ۔ ابلیس کے لئے مٹّی حجاب بن گئی اور مشرکین ، بشریّت سے آگے نہ دیکھ سکے ۔ حالانکہ فنکار کا فن جب تک ظہور پذیر ہو کر سامنے نہ آئے وہ اپنی ذات کی تعریف و توصیف سے خوش ہوتا ہے اور جب فن تصویر بن جائے ، عظمتیں ، شاہکار کا لباس پہن لیں ، مصوّر تصویر کے پردے میں نظر آنے لگے تو ایسے وقت میں شاہکار سے اغماض برتنا ظلم ہوتا ہے ۔

روح کی اطاعت

عظیم بارگاہ سے وابستگی کے بعد کچھ آداب اور قرینے اختیار کرنے پڑتے ہیں ۔ کچھ آداب کی پابندی آئینی حیثیت رکھتی ہے جن سے انحراف آئین سے انحراف کے مترادف ہوتا ہے اور بعض چیزیں ذوقی اور وجدانی ہوتی ہیں ۔ جن کی آئین کی کسی کتاب میں تشریح نہیں ملتی ۔ دل ہی ان کا معلم بنتا ہے اور دل ہی ان کی پاسداری پر مجبور کرتا ہے ۔ آئینی تعلق اور روحی تعلق میں یہ بنیادی فرق ہے کہ ایک قانون کے رشتے میں بندھا ہوتا

ہے اور ایک احساسات کی دنیا سے عبارت کہلاتا ہے۔ احساسات ہی اس کے پروردگار بنتے ہیں اور احساسات ہی اُسے جلا بخشتے ہیں۔

قانون کی دنیا محدود ہے اور احساسات کی دُنیا لامحدود، اس لئے ان تعلقات کے دائرے بھی بڑے وسیع اور خیال و فکر کی دسترس سے بالا ہوتے ہیں۔ روح میں اترنے والی ذات کا احترام الگ چیز ہے آئینی اور قانونی احترام سے اسے کوئی نسبت نہیں۔ اور اگر انسان روح اور قلب میں بسنے والی ذات کے احترام کو بھی محدود کرنے لگے، اسے بھی آئین اور قانون کے پیمانوں سے ناپنے لگے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ دل کی غیر محدود وسعتوں سے باخبر نہیں، وہ احساسات کی دنیا کو محدود کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بلالؓ کا سوز ہو یا صہیبِ رومیؓ کا اضطراب، یہ غیر قانونی چیزیں ہیں۔ قلب و روح کے طور پر طلوع ہونے والی تجلیاں ہیں جنہیں محدود نہیں کہا جا سکتا۔ محدود تو فانی کی صفت ہوتی ہے، باقی کی صفت کو فنا کہاں؟ جسمِ انسانی محدود ہے، اس لئے اس کی اطاعت بھی محدود ہے۔ روح کی اطاعت لازوال ہے وہ یہاں بھی ساجد اور شاکر ہے اور قیدِ ہستی سے آزاد ہونے کے بعد بھی ساجد و شاکر رہے گی۔

حسن و عشق

ایک کامل و مکمل ذات جو مختلف صفاتِ کمالیہ کی جامع ہو، اپنے حسن و جمال کی جلوہ گری کے لئے ایک ہی صفت کو منتخب نہیں کرتی، مختلف صفات کے آئینے اس کے جمال کے آئینے کہلاتے ہیں۔ جن میں اس کے جمال کو دیکھا جا سکتا ہے اور ان سے لذت و کیفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔ حسن کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ مختلف آئینے چاہتا ہے، مختلف رنگوں اور صورتوں میں جلوہ گری کرتا ہے تاکہ اس کی معرفت حاصل ہو سکے، اس کا جمال دیکھا جا سکے، اس کے عشووں اور غمزوں کے مزے لوٹے جا سکیں۔ یک رنگی اسے پسند نہیں ہوتی کیونکہ وہ اس کا کلی عرفان

عطا نہیں کر سکتی۔ عرفان عطا کرنے کے لئے اُسے مختلف لباس بدلنے پڑتے ہیں، مختلف رنگوں اور صورتوں میں ظاہر ہونا پڑتا ہے۔ کبھی اس کا لباس شوخ ہوتا ہے اور کبھی سادہ و رنگین، مقصود ہر لباس سے جلوہ نمائی ہوتی ہے۔ جلوہ گری کے یہ انداز اسے پسند ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لباس کی تعریف کی جائے تو وہ خوش ہو جاتا ہے۔ اس کے لباس کی نفی اس کے ذوق کی نفی کہلاتی ہے۔ حسن بے نیاز نہ ہو تو عشق تکمیل نہ پا سکے عشق کے جذبات کا سارا مدوجزر حسن کی بے نیازیوں کا منت پذیر ہوتا ہے۔ جذبات کے سمندر میں لہریں اٹھتی ہی اس وقت ہیں جب حسن بیگانگی کی خو اختیار کر لیتا ہے۔ بیگانہ بن جاتا ہے تغافل کی آگ سے احساسات کو جلا ڈالتا ہے۔ جذبات کو آتش نیا دیتا ہے۔ حضور علیہ السلام پر کچھ مدت کے لئے وحی کا آنا بند ہو گیا تو غیروں نے طعنے دینے شروع کر دیئے کہ محمد کے رب نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ اب جبرئیلؑ وحی لے کر نہیں آتے۔ خیر اس عالم میں حضورؐ پر تو جو گزری سو گزری لیکن عشق بھی مطمئن نہ رہ سکا، وہ بھی مضطرب ہو گیا۔ قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا جانے لگا کہ ایسی کوئی بات نہیں، آپ ہمارے تغافل سے کوئی اثر قبول نہ کریں۔ یہ تو اک ادا تھی لبھانے کے لئے، جذبات کو تابندگی عطا کرنے کے لئے، ورنہ آپ کوئی چھوڑنے والی چیز ہیں؟ ہماری ہر عطا آپؐ کے لئے ہے، ہر بخشش کے آپ حقدار ہیں، حسن کے جذبات کا یہ طوفان عشق کا پیدا کردہ تھا، کیونکہ حضورؐ نے جذبات کی اسی کشمکش اور بوقلمونی میں ایک رات تہجد کی نماز ادا نہ کی تھی۔

احوال و آثار

انسان جو مختلف احوال و کیفیات کے مجموعے کا نام ہے، ایک ہی کیفیت سے بہرہ ور نہیں ہوتا۔ اس پر انوار بھی برستے ہیں، احوال بھی پیش آتے ہیں اور آثار کا ظہور بھی ہوتا ہے۔ انوار، احوال اور آثار ایک ہی قبیل کی چیزیں نہیں، ان کا مختلف جہانوں سے

تعلق ہے۔ انوار، عالمِ ملکوت کی چیز ہیں۔ احوال عالمِ جبروت سے تعلق رکھتے ہیں اور آثار عالمِ ملک سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان سب کے ظہور کے لئے بھی ایک ہی جگہ متعین نہیں۔ انوار کے نزول کا مقام روح ہے۔ یہ روح ہی پر نازل ہوتے ہیں۔ احوال کا تعلق دل سے ہے اور آثار اعضاو جوارح سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک ہی تجلی مختلف مقامات سے گذرنے کے بعد مختلف نام پاتی ہے۔ عالمِ ملکوت سے نکل کر روح پر وارد ہوئی تو انوار کہلائی۔ جبروت کے پردوں سے چھن کر دل پر اثرانداز ہوئی تو اُسے احوال کا نام دیا گیا اور ملک کی مملکت سے گزر کر اعضاو جوارح میں جلوہ ریز ہوئی تو آثار کہلائی۔ سمندر کا پانی اُڑ کر ہواؤں میں پہنچ جانے کے بعد مون سون کہلاتا ہے۔ برس کر وہی بارش بن جاتا ہے۔ کہیں اس کی حیثیت اوس کی ہوتی ہے کہیں ژالوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایک ہی حقیقت کے مختلف روپ دھار لینے کے بعد اس کے نام مختلف ہو جاتے ہیں۔ اثرات میں بھی فرق آجاتا ہے لیکن اس کی ماہیت نہیں بدلتی۔ تجلّی کے وقت انسان کی روح انوار سے دوچار ہو یا دل احوال کی لذّت محسوس کرے، خواہ اعضاو جوارح میں آثار محسوس ہوں۔ یہ سب تجلّیٔ الٰہی کی کرشمہ سازیاں ہوتی ہیں۔ ایسے عالم میں جو لذّت نصیب ہو اُسے رحمتِ الٰہیہ کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ رحمت کا یہ وقت خصوصی انعام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے ضائع ہونے سے بچانا چاہیئے جو ذکر مزا دے، جو اسم لذّت عطا کرے، اس کی تکرار جاری رہنی چاہیئے۔ تاکہ لذّت کا تسلسل نہ ٹوٹنے پائے۔ یار ایک دروازے سے آئے تو اُسے دوسرے دروازے سے آنے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا گھر والے کے ذرّہ گرامی ذات کی تشریف آوری کا شکر لازم ہوتا ہے۔

مصنوعات اور معجزات

خدا تعالیٰ بدیع السّمٰوٰت والارض ہے بدیع کہتے ہی اُسے ہیں جس کی تخلیق کی مثال ممکن نہ ہو۔ چنانچہ زمین و آسمان میں خدا تعالیٰ کی بنائی ہوئی جو چیزیں بھی ہیں ان کا جواب ممکن نہیں۔

نہ سورج بن سکتا ہے نہ ستارے، نہ پہاڑوں کی تخلیق ممکن ہے اور نہ کسی جاندار کی۔ قدرت کی مصنوعات میں انسان کتنا بھی تصرف کرلے، اُن جیسی ایک چیز نہیں بنا سکتا۔ تصرف دوسری چیز ہے اور عدم سے وجود میں لے آنا اور بات، دونوں میں بڑا فرق ہے ؎

وہد نطفہ را صورتے چوں پری کہ کرد است بر آب صورت گری

عطارؒ نے یہ شعر کہہ کر نری شاعری ہی نہیں کی، ایک بہت بڑی حقیقت کی غمازی بھی کی ہے۔ پانی پر صورت گری ممکن نہیں اور رب تعالےٰ نے پانی کے ایک قطرے کو انسان کی صورت عطا کردی۔ اسے حسین وجمیل بنا دیا۔ اور اُس میں بے پناہ قوتیں بھر دیں۔ یہ خاکی پتلا قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کو لے کر خواہ کتنی ہی ڈینگیں مارنے لگے، بدیع کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔ بدیع کی تخلیق کل بھی یکتا تھی اور آج بھی شانِ یکتائی کی آئینہ دار ہے اپنی صفتِ تخلیق میں مشارکت، ذاتِ وحدہٗ لاشریک کو کل بھی گوارا نہ تھی اور آج بھی گوارا نہیں۔ ہاں! وہ صناعی کی صلاحیتیں تو بخشتا ہے۔ لیکن بدیع نہیں بننے دیتا۔ انبیاءؑ کو معجزات دیئے گئے ہیں اور وہ بھی شانِ یکتائی کے آئینہ دار ہیں۔ انسانی فکر وتدبیر، مُردے کو زندگی عطا نہیں کرسکتی۔ بے جان قالب میں جان نہیں ڈال سکتی۔ لیکن عیسٰی علیہ السلام کے ہاتھ پر اِس قدرتِ کاملہ کا ظہور بھی ہوا۔ وہ مُردوں کو زندہ کردیتے تھے۔ نبیؑ کی تخلیق چونکہ کائناتِ ارضی وسماوی میں تمام تخلیقات کی نسبت اعلیٰ اور ارفع ہوتی ہے اِسی لئے اُسے ایسی قوتیں بھی بخشی جاتی ہیں جو اسے اپنے ابنائے جنس سے ممیز وممتاز کردیتی ہیں۔

غیب وحضور

دین کا دو قسم کے امور سے تعلق ہے۔ ایک وہ جنہیں ہم اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعے معلوم کرسکتے ہیں اور ایک قسم وُہ ہے جس کا خالصتاً غیبی امور سے تعلق ہے۔ حواسِ خمسہ کی اُن تک رسائی ممکن نہیں۔ حواس خواہ کتنے بھی توانا اور مضبوط کیوں نہ ہوں، اُن کی کُنہ وحقیقت معلوم کرنے

سے قاصر ہیں، اُن کا تعلق انسان کے اُس یقین و اعتماد سے ہوتا ہے جسے ایمان کا نام دیا گیا ہے۔ حواس کی دنیا خواہ کتنی بھی وسیع و عریض کیوں نہ ہو، وہ مادی دنیا کہلائے گی اور روح کے احساسات و مدرکات کو سمجھنا اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ مادہ تو ابھی تک روح ہی کو نہیں سمجھ سکا، وہ اُس کے جہان کی بے کراں وسعتوں کو کیا سمجھے گا؟ وحی والہام کا تعلق روحانی دنیا سے ہے۔ روح کے احساسات و مدرکات اُسے سمجھتے ہیں۔ حشر نشر بہشت و دوزخ، برزخ و معاد اور ایسے ہی امورِ غیبیہ سے تعلق رکھنے والی چیزیں روح کے جہان کی چیزیں ہیں۔ روح مسلمان ہو جاتی ہے تو انہیں سمجھنے لگتی ہے۔ ان پر ایمان لے آتی ہے۔ ایمان کا تعلق انسان کی روح سے ہے۔ دل سے ہے۔ دل میں ایمان راسخ نہ ہو تو عالمِ غیب کیا؟ عالمِ شہادت بھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ حضورؐ کی ذات عالمِ شہادت سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ سراسر دلیل و برہان تھی۔ نور و ہدایت تھی۔ لیکن بایں ہمہ عقل کے بچاری اُسے نہ سمجھ سکے۔ اُس پر ایمان نہ لا سکے۔ قرآن بھی عالمِ شہادت کی چیز تھی، اُس کے اعجاز نے انہیں عاجز بنا دیا لیکن وہ ایمان نہ لائے۔ مادہ نور کو نہ سمجھ سکا، نگاہوں سے چھپی ہوئی چیزوں پہ ایمان لانا تو خیر بہت بعد کی بات ہے، وہ تو عالمِ شہادت کو دیکھ کر بھی قائل نہ ہو سکے۔ جسے ظاہر مطمئن نہ کر سکے، اُسے باطن سے کیا آگاہی ہو سکتی ہے؟ محبت کی دنیا کا نور ہمیشہ یار کی تجلّی گاہ تک پہنچتا ہے وہ وہاں کی خبر لاتا ہے، اپنا پیغام پہنچاتا ہے اور یار کا پیغام سنتا ہے سُننا اور سنانا، دیکھنا اور دکھانا، ازل سے اُس کا معمول ہے۔ نہ وہ کبھی بے خبر رہا ہے، نہ بے خبری کا ماتم کیا ہے۔ یار کی خبر اُسے ہوا اور صبا کے ذریعے بھی پہنچتی ہے۔ ہوا اور صبا دونوں محبت کے قاصد ہیں۔ دونوں پیغام رسانی کے فرائض سرانجام دیتے ہیں، اور اس سلسلے میں انہیں کبھی عار محسوس نہیں ہوتی۔ محبت کی بارگاہ کے قاصد بن کر دونوں نے ہمیشہ ناز کیا ہے۔ اس چاکری پہ دونوں اِتراتے ہیں۔ دونوں ناز کرتے ہیں۔ ناز اور نیاز کی بارگاہوں تک آمد و رفت نازکی چیزیں ہیں۔ عقل کی بارگاہ میں یہ صورت ممکن نہیں۔ وہاں ناز نہیں ہوتا، کبر ہوتا ہے۔ کبر

کی تخلیق نفس میں ہوتی ہے اور نازِ جمالِ دوست کا پروردہ کہلاتا ہے، اور نیاز تو عقل کے حصے کی چیز ہی نہیں، یہ متاع تو ازل میں محبت نے اپنی جھولی میں ڈال لی تھی۔ غیر کو وہ دیکھنے کی اجازت بھی نہیں دیتی۔ کیوں کہ یہ عطیۂ دوست ہے، دوست کے قدموں ہی میں نثار کرنے والی چیز ہے۔ ناز و نیاز کا سلسلہ بڑھ جاتا ہے تو غیب بھی حضور معلوم ہونے لگتا ہے۔ حضور بن جاتا ہے۔ ان دیکھی چیزیں بھی نظر آنے لگتی ہیں۔ محسوس ہونے لگتی ہیں احساسات روحانی چیزیں ہیں، مادی نہیں، اسی لئے صحابہؓ کو غیبی امور میں کبھی کوئی شبہ نہیں ہوا۔ اُن کا غیب حضور بن چکا تھا۔ عالمِ غیب کو وہ اپنی محبت کے نور سے عالمِ شہادت کی طرح ظاہر اور آشکارا دیکھ رہے تھے۔ اُن کا غیب ہماری نسبت سے غیب ہے، ورنہ وہ آشکارا ہو چکا تھا۔ محبت نے بڑھ کر حریمِ جمال کے پردے اُلٹ دیئے تھے اور عقل یہاں تک پہنچنا تو درکنار اِس کا باور بھی نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ وہ بے یقین ہے، محبت کے خیابانوں کا کوئی خنک جھونکا اُس کے تپتے ہوئے صحراؤں میں کبھی نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ سے تپتی ہے اور تپتی رہے گی، اور جمالِ یار کے خنک سائے محبت کا مقدر ہیں۔ وہ اِن کی خنکی میں تسکین پاتی ہے کیوں کہ وہ صاحبِ یقین ہے، صاحبِ ایمان ہے۔ ریگ زاروں میں بھی چلی جائے تو اپنے خنک سایوں سے اُنہیں آسودہ بنا دیتی ہے۔ تپتے ہوئے ذرّے بھی اُس کے دامن میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ عقل کیا پناہ عطا کرے گی؛ اُسے تو ابھی تک خود شکوک و شبہات سے پناہ نہیں مل سکی اور نہ وہ پناہ کی جویاں کر محبت کے دامن میں آنے کے لئے تیّار ہے، کیوں کہ وہ خودسر ہے۔ مغرور ہے ذ، سے پناہ نہیں مل سکتی۔

منزل کے انوار

کسی منزل کے لئے جو سفر اختیار کیا جاتا ہے اپنی غایت کو پہنچنے کے بعد ہی وہ نتائج سے

آگاہ نہیں کرتا۔ آغازِ سفر کے ساتھ بھی مسافر کے دل پر منزل کے پَر تو پڑنے لگتے ہیں اور وہ اُن لذّات و کیفیّات سے بہرہ ور ہونے لگتا ہے جو منزل کے نتائج و ثمرات کہلاتے ہیں منزل حسین ہو تو دل ابتدا ہی میں نوری کیفیّت کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ ظلماتی منزل کی کیفیات بھی مسافر کے دل سے دُور نہیں رہتیں۔ ہر کیفیّت منزل کی مخبر بھی ہوتی ہے اور راہنما بھی۔ روشنی پروانے کو شمع کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہی نہیں بنتی، شمع کے جمال کی لذتیں بھی عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روشنی سے گذرتے وقت بھی پروانے کا دل عشق کے سوز و ساز سے معمور ہوتا ہے، نورانی کیفیّات کا ہالہ اُسے محیط ہوتا ہے جو لذّت و کیفیّت کا تسلسل ٹوٹنے نہیں دیتا، اور یہی تسلسل اُسے واصلِ مراد ہونے سے پہلے بھی مست و سرشار رکھتا ہے۔ منزل پہ پہنچ کر اور شمع کے جمال سے منکیف ہونے کے بعد پروانے کے جس رقص کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اُس کی کیفیات سفر کے دوران پروان چڑھتی ہیں۔ سفر ہی میں جذبات کو نئی زندگی ملتی ہے اور امنگوں کو وہ عروج نصیب ہوتا ہے جو رقص پر منتج ہوتا ہے۔ جاں نثاری کی لذت کو بھی اِن جذبات سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ سفر اور منزل کے مابین اگر ایک گہرا ربط ہے، دونوں دست و گریباں کی حیثیت رکھتے ہیں تو دونوں کی کیفیات کے رشتے کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا، ایک آغاز ہے اور ایک انجام، ایک اجمال ہے اور ایک تفصیل، سفر ہی میں کوئی لذّت نہ ہو تو منزل کیا لذّتیں عطا کرے گی؟ مومن کی زندگی کا سفر اِس لئے پُر کیف اور نشاط آمیز ہوتا ہے کہ اُس کا دل منزل کے انوار سے معمور ہوتا ہے، عقبیٰ کی منزل کے پَرتو اُس کے روح و قلب کو محیط ہوتے ہیں جو اُسے شکستہ خاطر اور مغموم نہیں ہونے دیتے۔ مصائب و آلام کی آندھیوں میں بھی اُس کے عزم کے وہ چراغ روشن رہتے ہیں، جنہیں حسنِ منزل کے انوار کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

کافر کے دل میں، چونکہ عقبیٰ کی منزل کے لئے کوئی تڑپ اور امنگ نہیں ہوتی، اس لئے

اُس کی روح نہ انوار کو محسوس کر سکتی ہے، نہ اُن سے لذت گیر ہو سکتی ہے۔ ایک ہی راہ ایک انسان کے لئے نئی نئی لذات و کیفیات کی خالق بن جاتی ہے اور دوسرے کے لئے اُس میں کوئی جاذبیت و کشش نہیں ہوتی۔ پروانے کو شمع کی طرف بڑھنے میں جو کیفیت نصیب ہوتی ہے وُہ اُسی کا حصّہ ہے۔ مہبطِ انوار اُسی کا سینہ ہوتا ہے تجلّیات اُسی کے جلو میں ہوتی ہیں۔ کسی دوسرے پتنگے کے لئے اُن کا سمجھنا یا اُن سے کیف گیر ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ کیف گیری اور لذت شناسی تو دل کے فعل ہیں۔ دل کسی راہ کی قدر و منزلت سے آگاہ ہی نہ ہو تو اُسے لذّت کیا ملے گی؟ راہ کی لذّت اس امر کی دلیل ہوتی ہے کہ مسافر منزل کی اہمیّت سے بے خبر نہیں، کیوں کہ کوئی منزل بے خبروں کے دل پہ اپنے انوار نہیں ڈالتی، حُسن کی فطرت ازل سے مستور رہی ہے اور وُہ اپنے جمال کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ انوار وہیں ڈالے جاتے ہیں جہاں اپنی طرف بلانا مقصود ہو۔ لذّتیں وہیں بخشی جاتی ہیں جہاں نوازنے کا ارادہ ہوتا ہے لذّت خواہ طلب کی ہو یا ذکر کی، نُور کے سوا کچھ نہیں۔ نور ظلمتوں میں روشنی کے لیے دیا جاتا ہے تاکہ راہیں منوّر ہو سکیں اور آنے والے کو منزل کا سراغ مل سکے۔ نور کے ملنے کا شکر یہ سفر ہے، سفر سے لذات فزوں ہوتی ہیں، اور فاصلے بھی مٹنے شروع ہو جاتے ہیں۔ لذّات کا زیر و بم ہمیشہ سفر کا منّت پذیر ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ ہم اپنی طرف آنے والے کے لئے کئی راہیں کھول دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ ہر راہ کی لذّت انہی مسافروں کیلئے ہے جو اس سے گذرتے ہیں۔

خاموشی اور گویائی

عظیم قوتوں کی مالک و مختار ذات کی غلامی میں آجانے کے بعد انسان اپنی ضرورتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کی ضرورتوں کی وہی ضامن و کفیل بن جاتی ہے۔ آقا غلام سے جو خدمت لینا چاہتا ہے اسی کے حسبِ حال اسباب مہیّا کر دیتا ہے۔ یہ ناممکن ہے

کہ کوئی دانش مند مالک اپنے ملازم کو بازار سے سودا سلف لانے کے لئے بھیجے اور اسے قیمت ادا کرنے کی صلاحیت سے محروم رکھے۔ خدمت لینا مقصود ہوتی ہے تو صلاحیت ضرور دی جاتی ہے۔ صلاحیت کا دائرہ کسی خاص شعبے تک محدود نہیں! جو بھی خدمت لینا مقصود ہو، اس کی صلاحیت سے نوازا جاتا ہے، اور جہاں کوئی فریضہ سر انجام دینے کی خدمت نہ سونپی جائے وہاں صلاحیت سے نوازنا ضروری نہیں ہوتا۔ جو غلام بلاوجہ کسی صلاحیت کا تقاضا کرے وہ مالک کے عتاب کا مورد بنتا ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ بلاوجہ خدا سے تقاضا درست نہیں۔ تقاضا استحقاق کا مقتضی ہوتا ہے اور بندے کا بارگاہ صمدیت میں بجز بندگی کے کوئی حق نہیں بنتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ایک چرواہے کی حیثیت سے مدین کے جنگل میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چراتے تھے تو ان کی زبان میں لکنت تھی وہ صاف بات نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جب وادیٔ ایمن میں بھڑکتی ہوئی آگ کو فروزاں دیکھ کر شعلہ لینے کے لئے گئے اور نبوت سے سرفراز کر دیئے گئے، تو اُن کے قلب پر الہام ہوا کہ ہم سے فصیح البیانی کی آرزو کرو۔ چنانچہ انہوں نے آرزو کی کہ میری زبان کی لکنت دور کر دی جائے۔ بکریاں چرانے کے لئے فصیح البیانی کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے کلیم اللہ کو سماعت میں امرت گھول دینے والی گویائی عطا نہ کی گئی۔ لیکن جب رشد و ہدایت کے منصب پر مامور کر کے فرعون کی طرف بھیجنے کا وقت آیا تو وہ فصیح البیانی بھی بخش دی گئی، جو منصب ارشاد کے لئے ضروری تھی۔ وہی زبان جو بکریاں چراتے وقت لکنت کا مورد تھی۔ اب فصاحت و بلاغت کا مخزن بن گئی۔ عہد طفولیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام جب فرعون کی آغوش میں پرورش پا رہے تھے، تو انہوں نے ایک دفعہ فرعون سے بات کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اُن کی زبان دہکتے ہوئے کوئلوں سے جلا دی گئی۔ غیرت حق کو یہ منظور نہ ہوا کہ ہمارا کلیم غیر سے بات کرے کوئلوں سے زبان جلا کر اپنے ساتھ بات کرنے والے کلیم کو غیر سے بات کرنے سے روک دیا گیا۔ لیکن جب منصب تبلیغ پر مامور کئے گئے تو زبان کی یہی گرہ کھول دی گئی۔ بست

اور کشاد، خاموشی اور گویائی دونوں من جانب اللہ تھیں۔ جب غیر کے ساتھ کلام کرنے سے باز رکھنا مقصود تھا تو خاموشی دے دی گئی اور جب رسول کی حیثیت سے باتیں کرنے کا وقت آیا، تو گویائی عطا فرما دی۔ عطا اور منع، دونوں مقصودِ فطرت تھیں۔ دونوں حکمت و مصلحت کے عین مطابق تھیں۔ جب تک منصبِ رسالت نہ ملا کلیم اللہ نے گویائی کی آرزو نہ کی۔ لکنت کو مصلحت جان کر خاموشی اختیار کر رکھی۔ الہام نے وادیٔ ایمن میں روح پر نازل ہو کر گویائی طلب کرنے پر آمادہ کیا تو گویائی کے طلب گار بن کر تکلم پر قدرت کی بھیک مانگنے لگے۔ اللہ تعالےٰ کے مقدس نبی سے بڑھ کر مشیّتِ ربانی کا کون شناسا ہو سکتا ہے؟ خاموشی مطلوب تھی تو خاموش ہو گئے۔ گویائی کو پسند فرمایا تو گویائی کی طلب کرنے لگے طلب بھی ادھر سے تھی اور خاموشی بھی اُدھر سے۔ کلیمؑ تو دونوں عنایتوں کے مورد بنے ہوئے تھے۔ خاموشی کو بھی عنایت جان کر سینے سے لگایا اور گویائی کو بھی یار کا تحفہ سمجھ کر قبول کیا۔

قبولیت دونوں جگہ تھی، خاموشی میں بھی، اور گویائی میں بھی، خاموشی بھی مقبول تھی اور گویائی بھی محبوب، محبوب کی کونسی عطا غیر محبوب ہو سکتی ہے؟ وہ جو فرعون کی غرقابی کے وقت ایک شخص ہلاک ہونے سے بچ گیا تھا، اور جس کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے استفسار بھی کیا تھا کہ الٰہ العالمین! یہ شخص کیسے بچ گیا یہ تو میری نقل اتار کر میرا مذاق اڑاتا تھا؟ تو یہی جواب ملا تھا کہ کلیم! یار کا نقّال بھی ہمیں پسند ہے۔ جب یہ تیری طرح ہکلا کر باتیں کرتا تھا تو ہمیں بھلا معلوم ہوتا تھا اسے کیسے ہلاک کر دیا جاتا؟ یہ تو تیری ادا کا امین ہے۔

کلیمؑ اللہ کو لکنت چونکہ عطیّے کے طور پر دی گئی تھی اس لئے جہاں اس کی شان کی جھلک دیکھی اُسے بھی عطا کا مورد بنا لیا۔ موتی خواہ گرا پڑا ملے یا جوہری کی دکان سے دستیاب ہو، بہرحال موتی ہوتا ہے اور قیمت پاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے نقّال کی جھولی میں بھی ادا کا جو موتی تھا وہ اگرچہ کسی جوہری کا عطیّہ نہ تھا۔ لیکن تھا موتی، اسی لئے قیمت پا گیا۔

رنگ اور لباس

شاہ کے دربار میں یوں تو بہت سے نوکر چاکر ہوتے ہیں لیکن ان میں ایک مسخرہ بھی ہوتا ہے اور دربار کی ساری رونقیں مسخرے کے دم قدم سے ہوتی ہیں اُسے جُدا کر دیا جائے تو سارا رنگِ محفل پھیکا پڑ جاتا ہے۔

ساقی، مغنّی، مطرب، شاعر، صورت گر، داستان گو، فراش اور حاجب و دربان کی طرح مسخرے کے ذمے کوئی خاص خدمت نہیں ہوتی، وہ صرف روپ دھارتا ہے، ادائیں دکھاتا اور دیکھاتا ہے، روتا ہے، رُلاتا ہے، ہنستا ہے اور ہنساتا ہے۔ تڑپتا ہے اور تڑپاتا ہے۔ اور اس کے یہ سارے روپ رنگ شاہ کی خوشنودیٔ مزاج کے لئے ہوتے ہیں مسخرے کے مزاج کا سارا مدّوجزر شاہ کے مزاج کے مدّوجزر کا عکس اور پرتو ہوتا ہے اور شاہ کے مزاج میں جو تموّج پیدا ہو اُس کی خالق بھی مسخرے کی زندہ دلی بنتی ہے نشاط کے جذبات کو نشاط کے جذبات کے ذریعے ہی ابھارا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسخرہ جلال کو جمال میں بدل دیتا ہے۔ قہر و غضب کو عطا و کرم کی صورت میں لے آتا ہے اُسے جو مزاج شناسی عطا ہوتی ہے، وہی اُسے روپ اور رنگ بخشتی ہے۔ شاہ کو جلال میں دیکھتا ہے تو سراپا عجز و نیاز بن جاتا ہے مائل بہ کرم دیکھتا ہے تو اترانے لگتا ہے، ناز کرتا ہے، ناز کرتے وقت بسا اوقات وہ شاہ کی عبا اور قبا کو بھی چھو جاتا ہے۔ شوخی سے شانے پہ کبھی ہاتھ مار دیتا ہے۔ اور یہ شوخی بری معلوم نہیں ہوتی بلکہ محفل کو کشت زارِ زعفران بنا دیتی ہے شاہ کے ہونٹوں پر تبسّم آجاتا ہے۔ اس کی نگاہیں مسکرانے لگتی ہیں۔ دوسرا کوئی ملازم ایسی شوخی نہیں دکھا سکتا۔ ساقی کے ذمّے جو خدمت ہو وہ وہی انجام دے گا۔ شاعر اپنا وظیفۂ حیات ادا کرے گا اور مغنّی اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ آگے بڑھ کر شانے پہ ہاتھ مارنے کی سعادت اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ناز کرنے کی توفیق صرف مسخرے کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ ضرورت پڑنے پہ ساقی گری بھی کرتا ہے مغنّی و

مطرب کا بھیس بھی بدلتا ہے۔ شاعر کی نقالی بھی کرتا ہے۔ جاروب کشی سے بھی اُسے عار محسوس نہیں ہوتی۔ جاروب کش بننے سے وہ شرماتا نہیں۔ شرم تو اسے اس وقت آتی ہے جب وہ اداؤں سے شاہ کا دل نہ لُبھا سکے۔ اِس کے دل میں کوئی موجِ نشاط پیدا نہ کر سکے۔ دوسرے ملازموں کی طرح اس کی تنخواہ بھی مقرر نہیں ہوتی۔ وہ انعام پاتا ہے ایک ہی ادا دکھا کر جھولی بھر کر اٹھالے جاتا ہے جو تنخواہ داروں کو زندگی بھر نصیب نہیں ہوتا۔ انعام مسخرے کا مقدر ہوتا ہے اور تنخواہ ملازموں کا حصّہ۔

عشق بارگاہِ صمدیت کا مسخرہ ہے۔ وہ تنخواہ دار نہیں، انعام پانے والا ہے اس نے محبت کی بارگاہ سے ہمیشہ انعام پایا ہے ادائیں دکھائی ہیں اور محبت کا دل لوٹا ہے وہ لیٹرا ہے اُس نے لُٹ کر یہ منصب حاصل کیا ہے۔ جاروب کش بنا ہے تو پھر بھی نوازا گیا ہے مغنّی اور مطرب کے روپ میں آیا ہے تو پھر بھی محروم نہیں رہا۔

ساقی گری کے وقت بھی اُس پر رحمت کے دروازے کھلے ہیں۔ حاجب و دربان کا بھیس بدلنے کے بعد بھی وہ عطا و کرم کا مورد بنا ہے۔ ہر رنگ اور ہر لباس میں اس پہ عطا ہوتی ہے تنخواہ نہ اُس نے کبھی مانگی ہے، نہ ملی ہے اور عطا کو اس کی جھولی سے کوئی نہیں چھین سکا۔

یادوں کے دیپ

انسان کی تخلیق عبادت کے لئے ہوئی ہے اور عبادت وہی مقبول ہو سکتی ہے جو معبود کی عظمتوں کو جاننے اور پہچاننے کے بعد کی جائے۔ عبادت لذّتِ حضوری کا دوسرا نام ہے، جو عبادت حضورِ قلب کے بغیر ہوگی وہ جہالت کا نتیجہ تو کہلا سکتی ہے۔ معرفت کا ثمر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے عبادت سے پہلے عرفانِ ذات کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اور حضورِ قلب کے بغیر کی جانے والی عبادت کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی بلکہ اُسے خسران اور نقصان کا ذریعہ بتایا گیا ہے عبادت ایک ایسا پُل ہے جس سے گذر کر عابد معبود سے مل سکتا ہے۔ عابد و معبود کی ملاقات ہی کا نام

عبادت ہے ۔ اسی لئے نماز کو معراج المومنین کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ نماز میں انسان کے تمام اعضاء جوارح عابد بن جاتے ہیں۔ احساسات کی دنیا بیدار ہو جاتی ہے اور بیداری ہی میں کسی ذی عظمت ذات کی ملاقات کا مزا آسکتا ہے۔ سوئے ہوئے انسان سے تو کوئی انسان بھی ملنے کے لئے نہیں آتا۔ اپنے خالق و مالک سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نیند کے متوالے اور غافل انسان کے پاس آکر جلوے بکھیرنے لگے گا۔ جلوہ تو دید کا حق ہے۔ احساس کی لذت ہے شعور کو مست کر دینے والا جام ہے۔ غفلت میں اس جام کی مستی کا کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے؟ لطیف ذات کے جلوے چونکہ روح و قلب پر وارد ہوتے ہیں اسی لئے روح و قلب کی بیداری کو عبادت میں اوّلیت کا مقام حاصل ہے۔ محبت چونکہ ازل سے بیدار ہے، اُس پر کسی حال میں غفلت طاری نہیں ہوتی۔ بیداری میں بھی وہ محبوب کے حسن و جمال کی ذاکر رہتی ہے اور خواب میں بھی جمالِ یار کے پر تو دیکھتی ہے اسی لئے اُس کے بغیر عبادت لذّت و کیفیت کا گہوارہ نہیں بن سکتی۔ عقل کی عبادت اور دل کی عبادت میں فرق ہے عقل عبادت کے آداب سے واقف نہیں، اسی لئے لذّت سے خالی رہتی ہے۔ اور محبت سراسر عبادت ہے عقل معینہ اوقات میں بھی اختصار چاہتی ہے، بچنے کی کوشش کرتی ہے اور محبت ازلی ذاکر ہے۔ اُس کی عبادت کے اوقات معین نہیں۔ وہ ہمہ وقت عابد رہنا چاہتی ہے۔ وہ ذاکر ہے، اُس کا ذکر محدود نہیں، اُس کی زبان بھی ذاکر ہے اور خیال بھی۔ ذکر ہی میں وہ تسکین پاتی ہے۔ یاد اُس کی عبادت ہے، اور ذکر تسبیح و مناجات۔ تسبیح و مناجات سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہو جائے، تو تڑپ اٹھتی ہے۔ اُس کا جہان ویران ہو جاتا ہے۔ ہر ذات کو اپنے جمال کا ذاکر پسند ہوتا ہے۔ صحابہؓ خدا کو اسی لئے پسند تھے کہ وہ کثیر ذکر کرتے تھے کثرت سے یاد میں رہتے تھے۔ یاد دل کا دھڑکا ہے اور جب دل ذاکر بن جائے تو پھر ذکر دل سے جدا نہیں ہوتا۔ دل میں تسکین بن کر آ بیٹھتا ہے۔ نئے نئے جلووں سے دل کو زندگی بخشتا ہے۔ دل کی زندگی یادِ الٰہی ہے۔ یاد جتنی قوی اور مضبوط ہوگی، اُسی نسبت سے زندگی عطا

کرے گی۔ صحابہؓ کے دل اس لئے قوی تھے کہ وہ ذاکر تھے۔ شاغل تھے۔ عابد تھے، ساجد تھے جبیں کا سجدہ رد ہو سکتا ہے، لیکن دل کا سجدہ رد نہیں ہوتا، کیونکہ وہ محبت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ اُس میں ریا کا شائبہ نہیں ہوتا۔ ریا کار تو عقل ہے۔ دل نہیں، عقل عابد بن کر بھی ریاکاری سے باز نہیں آتی۔ دھوکہ دینا چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ دھوکے باز ہے اور دل شہید ناز بن جانے کے بعد دھوکہ نہیں دیتا، بلکہ محبت کی راہ میں دھوکہ کھاتے ہیں، جسے مزا آتا ہے۔ وہ یار کی ہر بات کی تاویل کرتا ہے۔ کوئی بات مزاج کے خلاف بھی ہو تو وہ یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ یار تو ایسا جفاکار نہ تھا مجھی سے کوئی خطا ہو گئی ہو گی، جس کی سزا بھگت رہا ہوں اور یہی حسنِ ظن اُسے محبوب کی بارگاہ میں اور زیادہ مقرب بنا دیتا ہے اور زیادہ قرب عطا کرتا ہے۔ سوءِ ظن میں مبتلا ہو جانے سے کسی ذات کا قرب نہیں ملتا۔ قرب خوش گمانی کا نتیجہ ہوتا ہے اور خوش گمانی تعلق کے استحکام سے پیدا ہوتی ہے۔ محبت ازل سے اِسی لئے مقبول ہے کہ وہ خوش گمان ہے۔ محبوب کی ذات پر بد گمانی کرنا جانتی ہی نہیں اس عذاب میں مبتلا تو عقل ہے، جو خوش گمانی کو سادہ لوحی کا نام دے کر پھبتیاں کستی ہے اسی لئے محبت کی راہ میں دھوکہ کھانے کی لذت سے محروم ہے۔ یار کا پیغام نہ بھی آئے تو محبت یہ کہہ کر دل کو تسلی دینے لگتی ہے کہ میرا خط نہ پہنچا ہو گا۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ دوست میری پریشانی سے آگاہ ہو کر حال پوچھنے کے لئے نہ آتا۔ وہ اور پیغام بھیجتی ہے، اور نامے لکھتی ہے۔ اُس کا انتظار سراسر لذت ہوتا ہے ہر آہٹ پہ اُسے یار کے آنے کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ اور عقل ان لذات کا مزا نہیں چکھ سکتی۔ عارفینِ حق کا انتظار بھی رحمت ہوتا ہے، وہ انہیں اور مسرور کر دیتا ہے۔ اور اُن کی پکار کا سلسلہ طویل ہو جاتا ہے، اور عقل کی پکار ایسے عالم میں طویل نہیں ہوتی۔ وہ یاد کی بساط لپیٹ دیتی ہے۔ اُس کے ظرف میں، یاد کی بساط کو پھیلانے اور وسعتیں دینے کی گنجائش نہیں، اس لئے کہ اُس کا ظرف محدود ہے۔ اُس کی دنیا تنگ ہے جہاں یادوں کے دیپ نہیں جل سکتے۔

ہدیٰ اور ہویٰ

اسلام نے اتباعِ ہدیٰ کی تعلیم دی ہے اور اتباعِ ہویٰ سے روکا ہے ہدیٰ نام ہے آسمانی ہدایت کا اور ہویٰ نفسانی خواہش ہے۔ ہدایت کی پیروی کرتے وقت انسان کی حیثیت متبع ہوتی ہے۔ خواہش کا بندہ بن کر وہ محکوم نہیں رہتا بلکہ خود حاکم اور فرماں روا بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ جذبہ نفس کے تابع ہوتا ہے اور نفس کی بندگی دراصل اپنی ہی ذات کی بندگی ہوتی ہے نفس پرستی خود پرستی ہے اور اس میں ایک ایسی لذت ہے جو انسان کو ہدایت کی طرف نہیں آنے دیتی ہدایت کی زندگی میں اپنی خواہشات چھوڑ کر ہادی کی حاکمیت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا پڑتا ہے۔ نفس لاکھ روکے، حسرت لاکھ دامن پھیلائے، آرزوؤں اور تمناؤں کا خون ہو، ارمان کچلے جائیں، مسرتیں پامال ہوں لیکن ہدیٰ کی راہ چھوڑ کر ہویٰ کی پیروی ممکن نہیں ہوتی۔ خواہش کا بندہ ہدایت کی راہ اختیار نہیں کرسکتا۔ ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک عیار اور چالاک انسان ہویٰ اور ہدیٰ میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے وہ خود کو یہ فریب دینے کی کوشش کرتا ہے کہ نفس کی بندگی کی میں نے جو راہ اختیار کر رکھی ہے دراصل یہی ہدایت کی راہ ہے حالانکہ ہدیٰ اور ہویٰ دو متضاد چیزیں ہیں ایک کا دوسری سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک نفسانی چیز ہے اور ایک ربانی، ایک کی اطاعت کی تعلیم دی گئی ہے اور ایک سے روکا گیا ہے، خواہش جب معبود بن جائے، زندگی اسی محور کے گرد گردش کرنے لگے تو ہدایت کے رستے مسدود ہو جاتے ہیں

ظلوم و جہول

فرشتہ نیابتِ الٰہی کے لئے موزوں نہ تھا یہ منصب تو اسی ظلوم و جہول کو زیب دیتا تھا جو نفسانی خواہشات کو کچل سکے، نفس کو بدلگامیوں سے روک سکے، جذبات پر قابو پا سکے،

فرشتے میں نہ خواہش ہے نہ جذبہ، وہ ظلوم وجہول کے منصب پر کیسے فائز ہو سکتا ہے، ظلوم بننے کے لئے نفس پر ظلم لازمی ہے اور جہول اسی وقت کہلا سکتا ہے۔ جب ماسوا اللہ سے بیگانگی اختیار کرلے۔ فرشتہ تو علائق کے بندھن میں اسیر ہی نہیں، وہ تعلق کا کون سا رشتہ منقطع کرکے جہول کہلا سکتا ہے؟ یہ تو انسان ہی کی شان ہے کہ وہ جذبات کے بہتے ہوئے دھارے کا رخ موڑ کے اپنے مجد و شرف کا اظہار کر سکتا ہے جب تک اپنے جذبات کی قربانی دے کر سامنے والی ذات کے جذبات و احساسات کا احترام نہیں کیا جاتا، تعلق کا حسن آشکار نہیں ہوتا۔ خود غرض اور مفاد پرست انسان دوست کے دل میں جگہ نہیں پا سکتا۔ تعلق کا سارا حسن تو آشکار ہی اس وقت ہوتا ہے، جب محبوب ذات کے لئے تیر کھا کر دل سے مرحبا کی صدا نکلنے لگے، قدم پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھنے لگیں ایسے تعلقات محبت کی جان اور عشق و مستی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ محبت کو انہی سے فروغ ملتا ہے عشق کی داستانیں انہی سے مرتب ہوتی ہیں۔ فرشتہ مطیع ہے لیکن سرمست نہیں، شہید محبت بننے کے لئے پے در پے محبت کے تیر کھانے پڑتے ہیں۔ کئی وادیوں سے گذرنا پڑتا ہے، کئی بیابانوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ تب کہیں جا کر ظلوم وجہول کی منزل آتی ہے، محبوب دیوانہ کہہ کر پکارنے لگے تو سمجھو ظلوم وجہول کی منزل آگئی ؎

قند آمیختہ باگل نہ علاج دل ماست — بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند

ایسے خطابات فرزانوں کو تو نہیں ملتے، عقل کے خطابات بھی فرزانگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ نہ ظلوم وجہول کہلا سکتی ہے نہ اس کی معنویت کو سمجھ کر لذت گیر ہو سکتی ہے۔

تبشیر اور تنذیر

کچھ لوگ ہی اللہ کو محبوب نہیں ہوتے بعض مقامات بھی ذی عظمت ہوتے ہیں انہی مقامات سے جنت البقیع بھی ہے۔ احادیث میں جنت البقیع کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضور علیہ السلام رات کے وقت اٹھ کر بقیع جاتے اور وہاں دفن ہونے والوں کے لئے مغفرت کی دعا فرماتے

بسا اوقات خدا تعالیٰ حضورؐ کو بیدار کر کے بقیع بھیج دیتا تاکہ حضورؐ اہلِ بقیع کے لئے مغفرت طلب فرمائیں۔ مغفور کے لئے مغفرت طلب فرمانا نورٌ علیٰ نور ہے۔ وہ تو پہلے ہی مغفور تھے۔ لیکن ان پر انعامات کی بارش کرتے وقت نہ ربانی ذوق آسودہ ہوتا تھا نہ حضورؐ کا جی بھرتا تھا حضورؐ مزید مانگ رہے تھے اور خدا تعالیٰ مزید عطا کر رہا تھا۔ اور یہ ان کی اس سعی و کوشش کا نتیجہ تھا۔ جو اُن سے خدا کی راہ میں عمل میں آئی سعی و کوشش بھی چونکہ بے پایاں تھی اس لئے اجر بھی بے پایاں مل رہا تھا۔ مانگنے والی ذات بھی کہہ رہی تھی کہ مزید عطا ہو اور دینے والا بھی کہہ رہا تھا۔ کہ اور مانگو رب اور کرم کے مستحق ہیں۔ دعائیں بھی وفور تھا۔ اور عطائیں بھی بے قراری۔ ذوق نہ اُدھر سیراب ہوتا تھا نہ ادھر اور عطا کا مور د بننے والے دو گونہ عنایات سے بہرہ یاب ہو رہے تھے رب کی عنایات سے بھی اور رسولؐ کی عنایات سے بھی۔ دونوں کی عنایتیں جنت البقیع کے ساکنوں پر محیط تھیں یوں تو رحمتِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی خواب گاہ سے اٹھ کر جنت البقیع چلے جانا ہی کوئی کم نعمت نہ تھا لیکن راتوں کو اٹھ اٹھ کر بکثرت اور پے در پے جانا ہی اس امر کا شاہد ہے کہ رحمت انہیں نوازنے کے لئے بے قرار تھی، جنت البقیع کے ساکنوں کو حضور علیہ السلام نے قول و عمل دونوں سے نوازا ہے اور دونوں جگہ جذبات کی فراوانی نظر آتی ہے جو اُس تعلقِ خاطر کو ظاہر کرتی ہے جو حضورؐ کو ان سے تھا فانی محبت صرف فنا کی وادیوں تک کام دے سکتی ہے۔ لیکن باقی رہنے والی ذات کی محبت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ کسی مرحلے پر بھی انسان کو تنہا نہیں چھوڑتی۔ دنیا ہو یا آخرت، نزع کا عالم ہو یا قبر کی تنہائی حشر کا میدان ہو یا پل صراط اور میزان کا کٹھن مرحلہ وہ ہر جگہ نصرت کے لئے پہنچتی ہے ہر جگہ انیس جان بنتی ہے۔ مزاج پوچھتی ہے، غمخواری کرتی ہے اور دلاسا دیتی ہے۔ رات کی تنہائیوں میں حضور علیہ السلام کا بقیع میں جانا بھی اسی قبیل سے تھا۔ محبت فاتحہ خواں بھی دعا زمزمہ بن کر لبِ پیغمبرؐ پہ آ رہی تھی۔ کیفیات کا وفور رحمت و بخشش کی التجاؤں کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا اور محبت جب دعا بن جائے تو اُس کے انداز بڑے کھلے ہوتے ہیں۔ وہ اجابت کو شکار کر لیتی ہے۔ رحمت کو غیب سے حضور میں لے آتی ہے وہ خود صاحبِ حضور ہے اس لئے حضوری

عطا کرتی ہے التجا کی صورت میں اس کا پھیلا ہوا دامن خالی نہیں رہتا۔ بقیع میں دامن پھیلایا جا رہا تھا اپنے لئے نہیں، اپنی محبت کے آبگینوں کیلئے، محبت کو فروغ نصیب ہو رہا تھا۔ عشق کو جوانی مل رہی تھی حسن جب عشق کے لئے دعاگو بن جائے تو یہ قبولیت کی ساعتیں ہوتی ہیں اور عشق کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں کہ حسن دامن پھیلا دے۔ دعا کے لئے اُس کے ہاتھ اُٹھنے لگیں۔ حدیثِ نبویؐ کے مطابق سب سے پہلے حشر کے دن حضور علیہ السلام اُٹھیں گے۔ پھر صدیقؓ و فاروقؓ اور پھر اہلِ بقیعؓ! اہلِ بقیعؓ کے متعلق یہ ارشادِ نبوت بھی ہے کہ وہ حشر میں آئیں گے تو اُن کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح روشن ہوں گے، اُن کے چہروں کی شعاعوں سے حشر کا میدان جگمگانے لگے گا۔ زبانِ نبوت سے اہلِ بقیعؓ کی غایت درجہ تعریف و توصیف سن کر اور اُن سے حضورؐ کا غیر معمولی شغف دیکھ کر ایک صحابیؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہؐ! یہ لوگ ہمارے بھائی تھے جو ایمان لائے۔ قول اور عمل سے انہوں نے آپ کی تصدیق کی۔ ایثار کیا۔ ثابت قدمی دکھائی۔ لیکن اسی راہ پہ ہم بھی گامزن ہیں لیکن انہیں آپ ہم سے افضل قرار دے رہے ہیں، حضورؐ نے فرمایا کہ ان لوگوں کو دنیا میں اپنی محنت کا پھل نہیں ملا اور تم لوگوں کا معاملہ ابھی معلّق ہے، معلوم نہیں میرے بعد کیا صورتِ حال پیدا ہو اور کیا کیا فتنے اُٹھیں؟ یہ اسلوبِ بیان بھی اہلِ بقیعؓ سے تعلقِ خاطر کا اظہار کر رہا ہے۔ اُن کی پیشانیوں سے پھوٹنے والی نور کی شعاعیں جو حشر کی فضاؤں کو منوّر کریں گی، انہیں ابھی سے حضورؐ کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور اپنے بعد پیش آنے والے حالات و کوائف سے لاعلمی کا اظہار فرمایا جا رہا ہے۔ ایک مقامِ تبشیر ہے اور ایک مقامِ تنذیر۔ بشارتوں سے انہیں نوازا جا رہا ہے۔ جو اپنا فرض ادا کر کے اپنے مالکِ حقیقی کے پاس پہنچ چکے ہیں اور فتنوں سے انہیں خبردار کیا جا رہا ہے جو ابھی تک امتحان گاہِ دنیا میں ہیں جن کے فرائض ابھی تشنۂ تکمیل ہیں۔ ایک گروہ کی تکمیل کی حسرت ہے اور ایک کی تکمیل کی مسرت، مسرت رسولؐ کا ذریعہ اہلِ بقیعؓ ہیں جو حضورؐ کی زندگی ہی میں خائب المرام ہو چکے اور جو حضورؐ کے بعد حالات سے دوچار ہونے والے تھے انہیں متنبہ کیا گیا کہ میں حشر میں نیکوکاروں کو یوں پہچان لوں گا جیسے تم لوگ اپنے مشکی اور چنکلیان گھوڑوں کو پہچانتے ہو۔

ربّانی اشارے

کلام کسی شاعر کا ہو یا ادیب کا، اُس میں وضاحت ہی نہیں ہوتی رمز و ایما سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اشارے اور کنائے فصاحت و بلاغت کی جان ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے کلام کو سطحیت سے بچایا جاتا ہے۔ الفاظ و بیان میں اک نئی روح پھونک دی جاتی ہے۔ جو صرف اہلِ دل اور اہلِ نظر ہی کو نظر آسکتی ہے۔ ذوقِ سلیم سے محروم اور معنویّت کی دنیا سے ناآشنا لوگ نہ اِس جہان میں جھانک کر دیکھ سکتے ہیں۔ نہ کوئی ایسا تاثر لے سکتے ہیں جو انہیں محظوظ و شگفتہ کر سکے۔ یہ دولت اہلِ دل کا حصہ ہوتی ہے۔

رمز و ایما کا وجود کبھی دو ذاتوں کے تعلّق کے اظہار کے لئے بھی ہوتا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ دونوں میں کیا ربط اور تعلّق ہے؟

کلامِ ربانی میں بے شمار اشارے اور کنائے ہیں اور یہ اشارے کنائے معانی کی دنیا تک ہی محدود نہیں، الفاظ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ سَعَوْا کے بعد بعض جگہ الف ہے اور بعض جگہ نہیں۔ صَلٰوۃ اور حَیٰوۃ کو بعض جگہ واؤ سے لکھا گیا ہے اور بعض جگہ الف سے، یعنی صَلَاۃ اور حَیَاتِکُم۔ مائۃ میں الف زائد ہے اور فئۃ میں نہیں۔ بایید میں بظاہر ایک ی زائد ہے جو پڑھی نہیں جاتی۔

غرض قرآن حکیم میں ایسے بے شمار نظائر و امثال موجود ہیں۔ جن کی تفصیل کے لئے یہاں گنجائش نہیں۔ انہیں جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ کیا ایسے اشارے بے فائدہ ہیں؟ حضورؐ انہیں نہ سمجھتے تو یہ نازل نہ کئے جاتے۔ ان کا نزول رسالت کی عظمت کا آئینہ دار ہے عقل یہاں بے بس ہے، لغت عاجز، علم بے نصیب اور بے توفیق۔ کیوں کہ یہ نبوّت کا جہان ہے۔ ربّانی اشارے ہیں جو ما و شما کے لئے نہیں۔

نبیؑ اور وحی

ہر نبیؑ پر اُسی کی قوم کی زبان میں وحی نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ تورات و انجیل، زبور اور قرآن اِس پر شاہد ہیں۔ ایک نبیؑ بھی ایسا نہیں ہوا جس کی وحی کی زبان اُس کی قوم کی زبان سے الگ ہو، نبیؑ کی اپنی زبان بھی قومی زبان رہی ہے۔ اور اس کی وحی کی زبان بھی قومی زبان سے مختلف نہیں ہوئی۔ بایں ہمہ نبیؑ کو وحی کا ترجمان بنایا گیا ہے۔ وحی کے سمجھنے کے لئے محض زبان دانی کافی ہوتی تو انبیاءؑ کی بعثت کی ضرورت نہ تھی لوگ خود بخود وحی کا مفہوم سمجھ لیتے۔ شعیب علیہ السلام جو اپنی قوم ہی کے ایک فرد تھے، ان کی بولی بھی وہی تھی۔ لیکن قوم نے اُن کی زبان سے ربّانی کلام سن کر کہا کہ آپؑ کی بیشتر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ حضرت شعیبؑ ملکی زبان ہی میں مخاطب تھے لیکن وہ لوگ ربّانی کلام کا مفہوم نہ سمجھ سکے۔ ربوبیّت کا جو تصوّر موسیٰؑ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے پیش کیا تھا وہ اسے نہ سمجھ سکا اور چیخ اٹھا کہ ربُّ العٰلمین کیا چیز ہے؟ اور حضرت موسیٰؑ کو یہ مفہوم سمجھانے کے لئے مختلف اسالیبِ بیان اختیار کرنے پڑے۔ جن کا تذکرہ قرآنِ حکیم میں موجود ہے۔ نمرود کو بھی رب کا مفہوم سمجھ نہ آیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کئی مثالیں دینی پڑیں۔ متمرّد اور سرکش انسان تفصیل کو بھی نہیں سمجھتا اور سلیم فطرت رکھنے والے کے لئے اجمال بھی کافی ہوتا ہے صدیقؓ کے لئے اجمال کافی تھا اور ابوجہل کے لئے تفصیل بھی مکتفی نہ ہو سکی۔ نبی کی ایک توضیح اپنوں کے لئے ہوتی ہے اور ایک بیگانوں کے لئے۔ شرح و بیان کے ذریعے وہ اپنوں کی آتشِ شوق کو بھڑکاتا ہے، انہیں لذّت آشنا کر دیتا ہے۔ لیکن بیگانوں کے سامنے کی جانے والی شرح کا یہ مقصد نہیں ہوتا۔ وہ تو لذّت کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

اعمال اور افعال

اعمال کا اطلاق افعال ہی پر نہیں ہوتا۔ خیال، جذبہ اور احساس بھی اعمال کی مختلف صورتیں ہیں،

بلکہ انہیں ظاہری اعمال کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ دل سے ابھرنے والے جذبات اور ذہن و فکر میں آنے والے خیالات کو باطنی اعمال کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ احساس بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔ اس کا تعلق بھی انسان کی باطنی دنیا سے ہے۔ ظاہری اعمال میں ردّ و قبول دونوں کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ لیکن باطنی اعمال ہر حال میں حسنِ قبول پاتے ہیں کیوں کہ ان میں ریا کا شائبہ نہیں ہوتا۔ ان اعمال کو صرف رب تعالیٰ کی ذات ہی دیکھ سکتی ہے۔ اسی لئے حضورؐ کی زبانِ وحی ترجمان سے ہم تک یہ الفاظ پہنچے ہیں کہ مومن کی نیت اس کے اعمال سے بہتر ہے۔ عمل بدن کے فعل کا نام ہے اور نیت دل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ اسے دل کا فعل بھی کہا جاتا ہے۔ بدن کے اعمال کا حسن و قبح بھی نیت کے حسن و قبح پہ موقوف ہے نیت اچھی ہو تو عمل بُرا ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے ہی بری نیت سے اچھے عمل کی توقّع نہیں کی جا سکتی۔

اچھا عمل ہی نیکیوں کی جنت میں زندہ و پائندہ نہیں رہتا۔ جذبہ اور احساس بھی اگر نیک ہوں تو اپنی نیکیوں کی جنت میں ابد الآباد تک زندہ رہتے ہیں، بدعمل یہاں اور وہاں دونوں جہانوں میں بدی کے جہنم میں رہنے والی چیز ہے۔ یہاں بدکردار لعنتوں کا مستحق بن جاتا ہے اور وہاں اُس کے لئے شعلے ہوں گے۔ بدی کے آغاز سے لے کر اُخروی زندگی کی سرحدوں تک اُس کے لئے شعلے ہی شعلے ہیں کہیں گفتار کی آگ شعلہ بن کر لپکتی ہے اور کہیں کردار کی آگ بھڑک اٹھتی ہے

جذبہ، خیال اور احساس بھی محو ہو جانے والی اور مٹنے والی چیزیں نہیں۔ رحمت تو اس جنس پر نثار ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ اِن میں رحمت کو کھینچنے کی صلاحیت موجود ہو۔ بہت سے لوگوں نے زندگی میں حج نہ کیا ہو گا۔ لیکن حشر کے دن اُن کے نامۂ عمل میں حج کا ثواب درج ہو گا۔ کیوں کہ ان کی زندگی حج کی حسرت میں کٹی ہو گی۔ ایسے ہی بعض بدیوں کا ارتکاب نہ کرنے والوں کے دامن میں بدیوں کا انبار ہو گا۔ جن بدیوں کے ارتکاب کے لئے وہ منصوبے بناتے رہے ہوں گے وہی اُن کے دامن میں ڈال دی جائیں گی۔

ربانی ارشاد کے مطابق جو مجرم حشر کے دن عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے، اُن میں دل

بھی شامل ہوگا۔ دل میں جو غلط جذبات پرورش پاتے ہیں، دل سے انہی کے متعلق استفسار ہوگا۔ آنکھ کان سے بھی محاسبہ ہوگا۔ کیوں کہ ان دونوں کی حیثیت پاسبان اور نگہبان کی ہے۔ آنکھ اور کان جو دیکھ کر اور سن کر دل کو اطلاع دیتے ہیں۔ دل اسی کے مطابق اثر پذیر ہوتا ہے اور اس کے جذبات انہی اطلاعات کا اثر اور نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی لیئے اصل مجرم کے ساتھ ان غلط اطلاعات دینے والوں کو بھی دل کے ساتھ عدالت کے کٹہرے میں طلب کیا جائے گا۔ اور ان سے بھی سوالات ہوں گے کہ تم نے غلط اطلاعات کیوں دیں؟ ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء و جوارح کے افعال چونکہ قلبی جذبات کے تابع ہوتے ہیں اس لیئے ان کی حیثیت شاہد اور گواہ کی ہوگی۔ انہیں بھی عدالت میں طلب کیا جائے گا تو اس لیئے نہیں کہ یہ مجرم ہوں گے۔ بلکہ اس لیئے کہ ان کی گواہی مطلوب ہوگی۔ جرم کے اثرات جو جسم و روح پر مرتب ہوتے ہیں۔ انہی سے حیات اثر قبول کرتی ہے۔ اچھے برے اعمال و افعال کا جسم و روح پر اثر پڑتا ہے۔ خواہ یہ اعمال و افعال ظاہری ہوں یا باطنی، صغیرہ ہوں یا کبیرہ، نظر آنے والے ہوں یا اُن کا تعلق خالصتاً انسان کی باطنی کیفیت سے ہو۔

حدیث شریف میں یہ جو آیا ہے کہ انسان کے بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جس کی صحت اور عدم صحت پر حیاتِ انسانی کا مدار ہے تو اس کا مصداق دل ہی ہے۔ یہی خون اور گوشت کا لوتھڑا انسان کی عظمتوں کا موجب بھی بنتا ہے اور اسے قعرِ مذلت میں بھی پھینک دیتا ہے۔ دنیوی زندگی کی صحت کا مدار ہی دل کی صحت پر نہیں آخروی زندگی کی صحت بھی اسی پر موقوف ہے اور اسلام کی نظر میں صحتمند جسم وہ نہیں جو فربہ اور توانا ہو۔ اس کا معاصی کی بیماریوں سے محفوظ ہونا ضروری ہے۔

تغیّر اور سکون

زندگی مختلف احوال و کیفیات کے مجموعے کا نام ہے۔ ان میں سے کوئی کیفیت بھی دائمی نہیں، سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ سب حباب کی طرح ابھر کر مٹ جاتی ہیں اور ایک کیفیت کی جگہ دوسری کیفیت لے لیتی ہے۔ ثبات و قرار کسی کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ مہد سے لحد تک انسان کا دل گوناگوں احوال و

کیفیات کا مخزن بنا رہتا ہے کبھی خوشی دل پر محیط ہوتی ہے اور کبھی غم اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ رنج اور راحت اضطراب اور سکون، کیف اور بے کیفی زندگی کے چمنستان کی بہار و خزاں ہی کے مختلف نام ہیں برگ و بار بھی انسان کو ملتے ہیں اور اسے محروم بھی ہونا پڑتا ہے۔ بہار کی شادابیاں بھی اس کے دامن میں آتی ہیں اور خزاں کے یاس آفریں مناظر سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔ دوام نہ اُسے ہے نہ اِسے۔ حیّ و قیوّم اور تغیرات کی دنیا سے ماورا ایک ہی ذات ہے جو اپنی قدرتوں اور مصلحتوں کے ساتھ، ہر آن متغیّر ہونے والا اور بدلنے والا یہ کارخانہ چلا رہی ہے اور تمام تغیرات اسی کی مشیّت اور ارادے سے ظہور پاتے ہیں کوئی انہیں پسند کرے یا نہ کرے وہ کسی کی خواہش اور مرضی کے مطابق ہوں یا نہ ہوں ان کی تغیر پذیر رفتار میں فرق نہیں آتا۔ مومن اِن تغیرات کو دیکھ کر اپنے رب کی حکمت و مصلحت پہ ایمان لے آتا ہے اور منافق چیخ اٹھتا ہے کہ یہ کیوں ہوا۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ گویا وہ بندگی کا دعویدار ہونے کے باوجود بندگی کے مفہوم و معنی سے آگاہ نہیں ہوتا۔ بندہ ہو کر اپنے رب کو اپنی مشیّت کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتا کہ میں اُس ذات کو مشورہ دینے کی کوشش کر رہا ہوں جو مشورے سے بے نیاز ہے غرض اس کی زندگی ذہنی و قلبی پریشانیوں کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اسے وہ سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہوتا جو رضا کی بندگی اختیار کر لینے والوں کو میسر ہوتا ہے نفس کے مطالبات پورے ہو جانے کی صورت میں تو کوئی انسان اپنے رب کی بغاوت نہیں کر سکتا۔ بغاوت کے جذبات تو وہیں پھوٹتے ہیں جہاں نفسانی خواہشات پامال ہو رہی ہوں، آرزوؤں کے دامن سے خون ٹپک رہا ہو اور تمناؤں کے باغ و بوستان اُجڑ رہے ہوں۔ آرزوؤں کی پامالی کے وقت اگر زبان ذاکر اور قلب شاکر نصیب ہو تو یہ بڑا کرم ہوتا ہے۔ یہ دولت خاصانِ بارگاہ کا حصّہ ہے جو زبان سے کھوکھلے نعرے لگانے والوں کو نصیب نہیں ہوتی، اسی مقام پر صدیق اور زندیق میں فرق معلوم ہوتا ہے ورنہ مسرتوں کی زندگی میں اپنے پروردگار کی عبودیت کا دعویٰ کر کے اس سے رشتہ قائم رکھنے کا مدعی بن جانا کیا مشکل ہے؟ مشکل تو وہاں آپڑتی ہے۔ جہاں دامن تار تار ہو، زندگی کے افق پر امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دے اور زبان اپنے رب کی حمد و ثنا میں مصروف ہو، ابتداء میں اپنے رب سے جو رشتہ قائم کیا تھا وہ ٹوٹنے نہ پائے۔

غم، وہ عطیہ سمجھ کر عطا کرے تو اُسے گرم جوشی کے ساتھ سینے سے لگایا جائے جیسے اس کی عطا کردہ نعمتوں کو لگایا تھا اور ان پر فرحت و شادمانی کا اظہار کیا گیا تھا جب غم بھی خوشی کی طرح مزا دینے لگے ستم بھی کرم معلوم ہو۔ جفا بھی عطا کا درجہ حاصل کر لے تو انسان پر عبودیت کے معنی کھلتے ہیں۔ وہ عبد اور بندہ کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اس وقت اسے تسکین کی دولت نصیب ہوتی ہے رنج آلام اور شدائد و مصائب اس کی تسکین نہیں چھین سکتے۔

صحابہؓ کو بدر و حنین میں بھی تسکین نصیب تھی تیر سینے میں پیوست ہو کر بھی تسکین نہ چھین سکے روح کو بھی آرام رہا اور دل کو بھی اور جان بھی لذات کا گہوارہ بنی رہی۔ صحابہؓ کی تسکین رب کا عطیہ تھی۔ یہ اُنھیں اُن کے رب نے عطا کی تھی۔ اسے کون چھین سکتا تھا؟ اور یہ صلہ تھا اُن کی اُن جاں کاہیوں کا جو انہیں اپنے رب کی راہ میں نصیب ہو رہی تھیں۔ لطیف ذات کے عطیے بھی لطیف ہوتے ہیں، انہیں نہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ وہ گرفت میں آ سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ابوجہل اپنی تمام ترذہانت و فطانت کے باوجود نہ صحابہؓ کی روحانی لذتوں کا اندازہ لگا سکا اور نہ اپنی قوت و شوکت کے باوجود انھیں صحابہؓ سے جدا کر سکا۔ جسم و جان میں جدائی بھی ہوئی تو وہ نفوس قدسیہ ان لذات کو دامن میں سمیٹ کر ساتھ لے گئے کیونکہ وہ باقی ذات کی عطا تھی جسے فنا نہ تھی، ابد تک ساتھ رہنے والی چیز دنیا میں کیسے رہ جاتی؟

عطا کے معجزات

سخا اور عطا دو مختلف قبیل کی چیزیں ہیں ۔ ظاہر: ظاہری اسباب و علل سے متاثر ہو، تو سخا ظہور میں آتی ہے لیکن عطا کے محرکات یقیناً سخا کے محرکات سے مختلف ہوتے ہیں۔ عطا غالباً باطنی محرکات کا نتیجہ ہوتی ہے عطا کے لئے ظاہری محرکات کی ضرورت نہیں۔ باطن سے کوئی تند و تیز موج اٹھے تو وہ عطا کی صورت اختیار کر لیتی ہے

سخا چونکہ ظاہری فعل ہے، اس لئے اس کے پیمانے بھی محدود ہیں۔ یہ ناپ تول کر کی جاتی ہے اور

اندازے سے کبھی باہر نہیں ہوتی۔ عطا میں نہ ناپ ہے نہ تول، آندھی اور طوفان بن کر ظاہر ہوتی ہے اور اُس کا ظرف، ذوق اور زور اپنا ہوتا ہے۔ جو متاثر ہونے کی بجائے متاثر کرتا ہے۔ جو سامنے آتا ہے اُسے بہا کر لے جاتا ہے۔ طوفان کو لایا نہیں جاتا وہ خود آتا ہے اور اپنا زور دکھا کر فرد ہوتا ہے۔ اسے اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ اُس کی زد میں آنے والا قوی ہے یا ضعیف، طاقت ور ہے یا کمزور، وہ تو ہر حال میں اپنا اثر دکھا کر رہتا ہے۔

عطا بھی چوں کہ اسی قبیل کی چیز ہے، اسی لئے وہ ظہور کے وقت اپنا اثر دکھا کر رہتی ہے۔ اپنا رنگ جماتی ہے اور اپنے معجزات سے حیران و ششدر کر دیتی ہے۔ سخا میں حیرت نہیں ہوتی اور عطا سراسر حیرانی ہے، یہ حیران بنا کر چھوڑتی ہے۔ تحیّر کی لذّتیں عطا کرتی ہے، تحیّر عطا کا لازمی نتیجہ ہے اور سخا میں نہ تحیّر ہے، نہ حیرانی۔ اس لئے کہ وہ عقل کے عین مطابق ہوتی ہے۔ قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز نہیں کرتی اور عطا میں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون؛ وہ جو کرشمہ دکھاوے، وہ قاعدہ اور قانون بن جاتا ہے۔ لیکن عطا کے قاعدے اور قانون صرف عطا کا مورد بننے والوں کے لئے ہوتے ہیں۔ سخا کی دنیا اُن کی معجز نمائیوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ سخا چونکہ گدائی سعی و کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے، اسی لئے اُس میں مستی بھی نہیں ہوتی، اور عطا منعم کے سلوک سے ظہور پاتی ہے، اس لئے وہ مقدار میں کم ہونے کے باوجود مست و سرشار کر دیتی ہے، اِس لئے کہ وہ خلافِ توقع ظہور پذیر ہوتی ہے اور سخا چوں کہ توقع کے مطابق ہوتی ہے، توقع ہی سخا کو معرضِ ظہور میں لاتی ہے، اِس لئے وہ ذوق کو سیراب نہیں کر سکتی۔ گدا جو طلب قائم کر لیتا ہے، وہ پوری نہیں ہوتی تو اُسے مایوس ہونا پڑتا ہے اور عطا کا مورد بننے والے کے دل میں چوں کہ پہلے سے کوئی طلب نہیں ہوتی اس لئے تھوڑی سی عطا بھی اسے مایوس نہیں ہونے دیتی۔ خاصانِ بارگاہ کی بندگی چونکہ مزدوری کی حیثیت نہیں رکھتی، اِس لئے اُن کے دل طلب سے خالی ہوتے ہیں۔ تھوڑی عطا بھی ظاہر ہو جائے تو وہ مست ہو جاتے ہیں کہ یہ سراسر انعام ہے ہم اس غرض سے تو بارگاہ میں نہ آئے تھے۔ ہمارا مقصود تو صرف رضا طلبی تھا۔ سائل، سخا کے بعد سخا کے دروازے سے وابستہ نہیں رہ سکتا۔ طلبی کی آرزو تو سخا کے دروازے پر لے جاتی ہے

اور عطا کا مورد بننے والا دروازہ نہیں چھوڑتا۔ اُس کی نظر منعم کے جمال پر ہوتی ہے سخا بھیک منگوں کو ملتی ہے، اور عطا جمال کے دادگروں کا حصہ ہے اور عطا ضروری نہیں مال و دولت ہی کی صورت میں ظاہر ہو۔ کبھی تبسم کی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے، کبھی عشوہ و غمزہ بھی عطا بن کر مدہوش کر دیتا ہے، نیم نگاہی رگ رگ میں نشہ بن کر دوڑنے لگتی ہے۔ دزدیدہ نظر کے تیر بھی جگر میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ سیرابی اور ذوق کی آسودگی عطا کے معجزات ہیں۔ سخا میں بے کیفی کے سوا کیا ہے؟ وہاں تو نہ کیف ہوتا ہے نہ سرور، نہ نشہ نہ مدہوشی، نہ تحیر نہ حیرانی، نہ راز نہ نیاز، راز و نیاز عطا کے کرشمے ہیں۔ سوز و ساز بھی اسی قبیل سے عبارت ہے۔ یہ دولت بیگانوں کو نہیں ملتی۔ اُن کی جھولی میں تو ٹکڑا ڈال کر روانہ کر دیا جاتا ہے اور راز و نیاز اور چھیڑ چھاڑ کے لئے اپنوں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ اولیاءؒ اور انبیاءؑ کے انعامات عوام کے انعامات سے مختلف ہوتے ہیں۔ عوام انعامات میں بھی خوش نہیں ہوتے اور خواص تہی دامن ہونے کے باوجود بھی خوش رہتے ہیں۔ عطا کے مزے انہی کے لئے ہیں اور عوام کے لئے عامیانہ سلوک۔

مجمعُ البحرین

حضرت موسیٰؑ کو خضر کی تلاش تھی اور حضرت عمرؓ اور علیؓ کو اویس قرنیؒ کی۔ اُن کا سفر ربانی فیصلے کے مطابق تھا اور ان کی جستجو حضورؐ کے فرمان کے مطابق۔ انہیں خدا نے بھیجا تھا اور انہیں رسولؐ خدا نے۔ خضرؑ علیہم اللہ کو مجمع البحرین پر ملے تھے اور اویس قرنیؒ سے علیؓ و عمرؓ کی ملاقات دریا کے کنارے ہوئی تھی۔ موسیٰؑ اور خضرؑ کے نظریات مختلف تھے۔ ایک پروردۂ وحی تھے اور ایک پروردۂ الہام، دونوں کی دنیا مختلف تھی۔ لیکن اویس قرنیؒ عمرؓ اور علیؓ کے ہمنوا تھے، یہاں کوئی اختلاف نہ تھا۔ موسیٰؑ اور خضرؑ ایک ہی کشتی میں بیٹھ کر بھی متحد الخیال نہ ہو سکے۔ دونوں میں تکرار جاری رہی تاآنکہ سفر تمام ہو گیا۔ لیکن اصحابِ رسولؐ اور اویس قرنیؒ کی ملاقات میں یہ بات نہ تھی۔ یہاں وحدتِ خیال و فکر تھی مسلک ایک تھا

نظریہ ایک تھا اور مقصودِ حیات یک بھی کوئی اختلاف نہ تھا۔ یہاں دریا بھی ایک تھا اور وہاں
مجمع البحرین جو دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ کا نام ہے۔ دریا موسیٰؑ بھی تھے اور خضرؑ بھی ایک
وحی کا دریا تھا اور ایک الہام کا۔ ایک کا دیار وحی کے انوار برستے تھے اور ایک کی دنیا الہام
کے بادلوں سے سیراب تھی۔ مجمع البحرین پر دونوں کی ملاقات سے صاف واضح تھا کہ انجام
کار صاحبِ وحی اور صاحبِ الہام متحد الخیال ہو جائیں گے۔ وحی اور الہام کے دریاؤں میں
کوئی اختلاف باقی نہ رہے گا۔ غرض موسیٰؑ اور خضرؑ کی دنیا میں کثرت تھی۔ کشتی، بچہ اور دیوار
اسی کثرت کے مظاہر تھے۔ اویسِ قرنیؒ کی دنیا میں وحدت تھی۔ یہاں اختلاف کیسے راہ پاسکتا
تھا۔ باہمی جو گفتگو ہوئی وہ وحدت کی شان کی آئینہ دار تھی۔ بات چیت کے درمیان استفسارات
تو ہوئے۔ کبھی اویسِ قرنیؒ کی طرف سے اور کبھی اصحابؓ رسولؐ کی طرف سے لیکن استفسار اور
اختلاف میں فرق ہے۔ استفسار یگانگت کی علامت ہوتا ہے اور اختلاف دوئی کا مظہر۔

موسیٰؑ اور خضرؑ کی ملاقات کے وقت تحائف کا تبادلہ نہ ہوا تھا۔ نہ کچھ لیا گیا نہ دیا گیا۔
بس مشاہدات و تجربات کی دنیا تھی۔ جس سے موسیٰ علیہ السلام کو گذار دیا گیا۔ لیکن اویس قرنیؒ
اور عمرؓ و علیؓ کی ملاقات میں سیر بھی تھی اور تحائف بھی۔ لدنی علم کی جلوہ فشانی سے بھی یہ سیر
خالی نہ تھی۔ اویسِ قرنی کو دور رہ کر جمالِ رسولؐ کے جو جلوے نصیب تھے جب انہوں نے
ان کا ذکر کیا تو زندگی بھر جمالِ رسولؐ سے فیضیاب ہونے والے صحابہؓ بھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے
کہ ان کا علم اور مشاہدہ کس قدر وسیع ہے؟ اس مشاہدے اور غلبۂ حال نے انہیں بارگاہِ رسولؐ
میں حاضری کی فرصت نہ دی ورنہ ماں کی محبت کہاں دامن گیر ہو سکتی تھی؟ خرقۂ رسولؐ عمرؓ
اور علیؓ نے ان کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ ان کی طرف سے تحفہ تھا اور اویسِ قرنی نے دعا دی
جو پوری امت کی مغفرت اور بخشش کے لئے تھی۔ حضورؐ نے دونوں صحابہ سے فرمایا تھا۔ کہ
خرقہ اویسؒ کو پہنا دینا اور ان سے میری امت کی بخشش و مغفرت کے لئے دعا کرانا۔ یہ ہو سکتا
ہے کہ حضورؐ نے حضرت اویسؒ سے دعا کرانے کے لئے کیوں کہا؟ آپؐ کی دعا کافی نہ تھی

دعا ہر جگہ احتیاج کی علامت نہیں ہوتی ۔ اسی طرح عظمت والی ذات کی عظمت شان ظاہر کرنے کیلئے ہوتی ہے یہاں بھی اویس کی عظمتِ شان کا اظہار مقصود تھا ۔ اس طرح امت کو یہ تعلیم دی گئی کہ دعا کسی اہم چیز ہے ۔ خرقۂ رسالت کا تحفہ تھا اور دعا اویسؓ کا ہدیۂ نیاز و گداز جس میں جان کی نشان بھی تھی جبھی تو انہوں نے اپنے رب سے یہ کہا کہ جب تک میری دعا قبول نہ ہوگی خرقہ نہ پہنوں گا ۔ یہ اندازِ کلام ناز کا غماز ہے ۔ اسی لئے اس کی پذیرائی بھی ہوتی محبت کا رشتہ اور تعلق کا احساس جب ناز کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ تو نظر انداز نہیں ہوتا ، قبول ہوتا ہے ۔ نازِ عبودیت کا دوسرا نام معراجِ محبت ہے ۔ محبت معراج کو پہنچے گی تو ناز بھی ہوگا اور اسے سرفرازیاں بھی ملیں گی ۔

موسیٰ علیہ السلام کو خضرؑ کی تلاش کے لئے بھیجا گیا تھا تو انہیں خضرؑ کے متعلق تفصیل معلومات فراہم نہ کی گئیں ، نہ یہ بتایا گیا کہ اُن کی شکل و صورت کیسی ہوگی ، ناک نقشہ کیا ہوگا انداز و اطوار کیسے ہوں گے ، حد یہ ہے کہ نام تک نہ بتایا گیا ۔ صرف اتنا کہا گیا کہ وہ بندگی کے مقام پر نازاں ہے ۔ رحمت اس کے جلو میں ہے اور اسے ہم نے علم لدنی عطا کیا ہے ۔ اویسِ قرنیؓ کی حضورؐ نے پوری تفصیل بتائی ۔ نام بھی بتایا ، ٹھکانے کا پتہ بھی دیا ، یہ بھی فرمایا کہ وہ فربہ جسم اور میانہ قد کا ہوگا ، بال لمبے ہوں گے ، اُس کے بائیں پہلو اور ہاتھ کی ہتھیلی پہ درہم کے برابر چمکتا ہوا نشان ہوگا ۔ ربیعہ اور مضر کے قبیلے کی بکریوں کی تعداد کے مطابق میری امت کی شفاعت کرائے گا خضرؑ کی رحمت اُن کی ذات کے لئے تھی لیکن امتِ محمدیہ کے خضر اویس قرنیؓ کی رحمت کا تعلق حضورؐ کی تمام امت سے ہے جبھی تو حضورؐ نے فرمایا کہ اُن سے میری امت کے لئے دعا کی درخواست کرنا ۔ غرضیکہ اُن کی رحمت دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کے لئے ہے ۔ علم کا یہ عالم تھا کہ اور احد میں دندان مبارک شہید ہوا تو قرن میں تمام دانت نکال دیئے یہ پیغام ہے کہ کون گیا تھا ، دانت مبارک شہید ہونے کی خبر کس نے دی تھی ؟ عمرؓ اور علیؓ نے جب یہ پوچھا کہ اس غلبۂ محبت کے

باوجود آپؓ حضورؐ کی زیارت کے لئے کیوں نہیں آئے؟ تو فرمانے لگے کہ آپ نے زیارت کی ہے تو بتاؤ کہ حضورؐ کے ابرو پیوستہ تھے یا کشادہ؟ پھر خود ہی جمالِ پاک کی شرح کرنے لگے۔ یہ علم لدنی نہ تھا تو اور کیا تھا؛ خضرؑ اور اویسؓ کی زندگیوں میں کئی وجوہ سے مماثلت پائی جاتی ہے خضرؑ بھی مستور تھے اور اویسؓ بھی مستور، لیکن خضرؑ میں مستی نہ تھی اور اویسؓ مست تھے۔ یہاں حال کا غلبہ تھا جمال کے جلوے تھے، دامن ملا تھا تو تار تار، خون سے دامن رنگین بھی تھا۔ خضرؑ ان کیفیتوں سے شناسا نہ تھے۔ نہ محبت کی شوریدگی نصیب ہوئی نہ عشق کے تیر کھائے۔

خضرؑ کی دنیا علم کی دنیا تھی اور اویسؓ عشق کے جہاں کے باسی۔ خضرؑ کا علم مشاہدۂ مخلوق تک محدود تھا۔ مشاہدۂ حق کے سلسلے میں اُن سے کوئی بات ظہور میں نہیں آئی کشتی بھی اسی علم کی مظہر تھی۔ مقتول بچّے کا معاملہ بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا تھا اور دیوارِ یتیم کے قصے کو بھی کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اویسؓ کے علم کی رسائی جمالِ محبوبؐ کی تجلیوں تک تھی۔ خضرؑ نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے جہان کی سیر کرانے کے بعد هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ کہا تو اس میں ایک تلخ احساس پایا جاتا تھا۔ علیحدگی کے وقت موسیٰ علیہ السلام خضری علوم سے بہرہ ور ہونے کے باوجود کوئی زیادہ خوش نہ تھے۔ اُن کی طبیعت پہ تکدر کا اثر تھا جبھی تو انہوں نے احتراز کی ضرورت محسوس کی لیکن اویسؓ نے جب اصحابِ رسولؐ کو رخصت کیا تو دونوں طرف کیف کا عالم تھا۔ یہاں رخصت کرتے وقت جو جملہ کہا گیا وہ یہ تھا کہ اب آپ تشریف لے جائیے قیامت قریب ہے اور مجھے توشۂ آخرت کی فکر دامن گیر ہے، یہ کہا اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ صحابہؓ جب اُن کے پاس پہنچے تو اس وقت بھی وہ نماز میں تھے۔ گویا ملاقات کی ابتدا بھی مشاہدۂ حق سے ہوئی اور انتہا بھی مشاہدۂ حق پر۔ اس لئے کہ نماز معراج المومنین ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے خضرؑ کو عبادت میں مشغول نہیں دیکھا اور نہ انہوں نے اپنے رب کی لقا کا شوق ظاہر کیا۔ اویسؓ کی ساری حالت ذوق و شوق سے عبارت تھی، جو کہا وہ ذوق تھا اور جو کیا وہ بھی عینِ ذوق۔ غرض وہ موسیٰ علیہ السلام کے خضرؑ کا معاملہ تھا اور یہ امتِ محمدیہ کے خضرؑ کی داستان، کئی معاملات میں

خضرؑ سے مشابہ ہونے کے، باوجود حضرت اویسؓ ممیز و ممتاز نظر آتے ہیں۔ اُن کا علم موسےٰ علیہ السلام کے لیئے تھا۔ اور اویسؓ آخرت کے سنوارنے کا مشورہ دے رہے تھے۔

مجمع البحرین پر موسیٰؑ اور خضرؑ کی ملاقات کا ذریعہ ایک مچھلی بنی تھی۔ لیکن ملکِ دلیری کے دو شیر عمرؓ اور علیؓ جب اُمتِ محمدیہ کے حضرت اویس قرنیؓ کی ملاقات کے لئے روانہ ہوئے تو اُن کے پاس مچھلی نہ تھی۔ بلکہ اُن کا زادِ سفر جذبہ شوق تھا۔ یہی عشق رہنما بن کر انہیں اویسِ قرنیؓ کے پاس لے گیا۔ یہ کہیں نہ بھولے نہ بھٹکے۔ منزل اُن کی آغوش میں آگئی۔ یہ قرن پہنچ گئے۔ اویسؓ کی صحبت سے ہمکنار ہوگئے۔ مچھلی کا ماجرا دوسری نوعیت کا ہے۔ یہ کلیم اللہؑ نے آغازِ سفر ہی میں بھُون کر توشہ دان میں رکھ لی تھی۔ تاکہ سفر میں غذا کا کام دے۔ چنانچہ ایک مقام پر پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے ساتھی نوجوان یوشعؑ سے مچھلی کھانے کے لئے طلب کی تو وہ بولا کہ مچھلی زندہ ہو کر دریا کی تہ میں اُتر گئی ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام اور یوشعؑ دونوں واپس لوٹ آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تاثر یہ تھا کہ جہاں مچھلی کو زندگی ملی ہے وہی خضرؑ کا مقام ہے۔ مقربؑ کی جلوہ گاہ کے فیوض فنا ہونے والوں کو دوبارہ زندگی عطا کر دیتے ہیں۔ یوشعؑ نے جب موسیٰ علیہ السلام کو مچھلی کے غائب ہونے کی اطلاع دی تو وہ بہت رنجیدہ ہوئے۔ ان کا قلق و اضطراب مچھلی کے غائب ہونے کے باعث نہ تھا۔ بلکہ احساس یہ تھا کہ منزل نگاہوں سے دُور ہوگئی جب تک مجمع البحرین کی منزل نہ آئی کلیم اللہ نے سفر کی تھکن محسوس نہ کی۔ لیکن جب منزل گم ہوگئی تو دوری منزل کا احساس خلش بن کر پریشان کرنے لگا۔ یوشعؑ کو موسیٰ علیہ السلام نے ابتدائے سفر ہی میں شریکِ سفر کر لیا تھا۔ تاکہ راہ میں پیش آنے والے مشاہدات سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ مشاہدات کی صورت میں جو نعمت موسیٰ علیہ السلام کو ملے۔ اس سے وہ تنہا لطف اندوز نہ ہوں بلکہ اُن کا ایک ساتھی بھی حصّہ گیر بنے۔ یہی یوشعؑ، موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کی تعلیمات کو پھیلانے اور اُن کے پیام کو عام کرنے کا ذریعہ ثابت ہوئے۔ انہیں کلیم اللہ کی روحانی وراثت ملی۔

موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مجمع البحرین کی طرف سفر کرنے والے حضرت یوشع کو تو موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے بعد ان کی تعلیمات کو فروغ دینے کی سعادت نصیب ہوئی لیکن اویس قرنیؓ کی طرف جانے والے عمرؓ اور علیؓ حضورؐ کی ظاہری حیاتِ طیبہ ہی میں مبلغِ اسلام تھے۔ ان کے رشد و ہدایت کا سلسلہ بڑا وسیع تھا۔ انہوں نے مکہ ہی میں حضورؐ کے زیر سایہ رہ کر تبلیغ نہ کی، مدینہ میں بھی ان کی حیثیت معلّم کی تھی۔ رسولؐ کی اقتدا میں انہوں نے ہجرت بھی کی۔ غزوات میں بھی اپنی محبت کا ثبوت بہم پہنچایا۔ اُن کے مشاہدات کا سلسلہ محدود نہ تھا، ہر اُفق پر انہوں نے نبوّت کا جلوہ دیکھا۔ ہر محاذ پر وہ حضورؐ کے شریکِ حال رہے۔ یوشعؑ کو ایسی سعادتیں نصیب نہ تھیں۔ کلیم اللہ نے مجمع البحرین سے آگے گزر کر مچھلی طلب کی تو وہ اعتذار کرنے لگے کہ وہ بھول گیا۔ شیطان نے مجھے بھلا دیا اور میں آپ کو مچھلی کے زندہ ہونے کی خبر نہ دے سکا۔ لیکن صرف یہی نہیں کہ عمرؓ اور علیؓ، اویس قرنیؓ کی طرف جاتے ہوئے راہ میں کہیں نہ بھولے، بلکہ اُن کی زندگی کا تمام تر سفر، ہدایت کی راہ پر چلتے ہوئے اور اپنے پیچھے مشعل کی طرح فروزاں نقوشِ پا چھوڑتے ہوئے گزرا۔ یوشعؑ کا یہ کہنا کہ مجھے شیطان نے بھلا دیا، اس امر کی دلیل نہیں کہ نبیؑ کے مقرّب پر شیطان کا اثر ہو سکتا ہے وہ اسے گمراہ کر سکتا ہے۔ مقربینِ حق شیطانی اثرات سے محفوظ ہوتے ہیں۔ شیطان ان پر غلبہ نہیں پا سکتا۔ مقرّب جب اپنی بھول چوک کو شیطان کی طرف منسوب کرے۔ تو اس کے کچھ اور معنی ہوتے ہیں۔ شیطان چونکہ منبعِ شر ہے، ہر شر کا صدور اسی کی طرف سے ہوتا ہے اس لئے مقرّب اپنی فروگذاشت کو رب تعالےٰ کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ منبعِ خیر اور مصدرِ خیر ہے۔ مقربین اپنی لغزش کو منبعِ شر ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ اُن کا اندازِ فکر اور اندازِ نگاہ ہے جو اُن کی عبودیت کی دلیل ہے۔ ورنہ مقرّب کہاں اور شیطانی اثرات کہاں؟ وہ تو رب تعالےٰ کی تحویل میں ہوتا ہے، رحمت اس کی حفاظت کرتی ہے

مریمؑ اور زکریاؑ

عمران کی عورت نے نذر مانی تھی کہ میرے گھر اولاد پیدا پیدا ہوئی تو اُسے مسجدِ اقصیٰ کے لئے وقف کردوں گی۔ جب مریمؑ پیدا ہوئیں تو وہ گھبرائی کہ لڑکی کیسے وقف کروں! لڑکا ہوتا تو نذر کے قابل بھی سمجھا جاتا۔ لیکن خدا تعالےٰ نے یہ نذر قبول کرلی۔ اور قبولیت کی عمران کی عورت کو اطلاع دے دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اطلاع خواب کے ذریعے دی گئی تھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا تعالےٰ بیداری میں اطلاع دینے پر قادر نہیں۔ عمل کی قبولیت اور مردودیت کا اندازہ قلبی کیفیت سے بھی لگایا جاتا ہے۔ قلب میں انشراح پیدا ہونے لگے رُوح لذت محسوس کرے اور دل میں پے درپے نشاط کی موجیں اُٹھنے لگیں تو یہ عمل کی قبولیت کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ مردود عمل میں انشراح نہیں ہوتا بلکہ انقباض ہوتا ہے۔ بہرحال قرآن میں اطلاع کی تفصیل موجود نہیں۔ خدا نے جیسے چاہا اطلاع دیدی۔

حضرتِ مریمؑ کو خدا کی پناہ میں آنے کے بعد مسجدِ اقصیٰ کا مقدس ترین مقام مل گیا مسجدِ اقصیٰ کے عابدین و زاہدین میں جب یہ اختلاف رونما ہوا کہ مریمؑ کس کی تحویل میں رہے تو قرعہ اندازی کی گئی۔ یہ مقبولیت کی علامت تھی کہ حضرت زکریاؑ کا نام نکلا۔ یہ ربانی ارشاد ہے کہ حضرت زکریاؑ جب مریمؑ کو ایک محفوظ حجرے میں چھوڑ کر جاتے۔ تو مریمؑ کے پاس غیب سے رزق آتا۔ یہ حیرت زا منظر دیکھ کر حضرتِ زکریاؑ نے سوال کیا کہ یہ کہاں سے آتا ہے۔ مریمؑ بولیں کہ خدا کے پاس سے! ظاہر ہے کہ حضرت زکریاؑ کا سوال ذریعے کے متعلق تھا۔ ورنہ خدا کے نبیؑ سے زیادہ اس حقیقت کو کون سمجھ سکتا ہے۔ کہ رازق خدا کی ذات ہے۔ حضرت مریمؑ نے ذریعے کی نفی کرکے بتا دیا کہ رزق کسی وسیلے اور ذریعے کے بغیر براہِ راست خدا تعالےٰ کے پاس سے آتا ہے۔ یہ کرشمۂ قدرت دیکھ کر حضرت

زکریاؑ بھی اپنے رب سے دعا کرنے لگے۔ کہ انہیں بیٹا عطا ہو۔ مریمؑ کے غیبی رزق کے مشاہدے سے انہیں بھی تحریک ہوئی۔ وہ بھی ہاتھ پھیلا کر بیٹا مانگنے لگے۔ حالانکہ ضعیفی کا یہ عہد بالعموم ایسی دعاؤں کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ لیکن وہ رب تعالیٰ کی قدرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ مریمؑ کو حضرتِ زکریاؑ کی تحویل میں آجانے کے بعد عظمت ملی تھی۔ اور مریمؑ کے پاس آنے والے غیبی رزق کے مشاہدے نے حضرتِ زکریاؑ کے لئے رب تعالیٰ کی رحمتوں کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ ضعیفی میں بچے کا مل جانا انہیں آسان نظر آنے لگا حضرت زکریاؑ کو بیٹے کی بشارت دی گئی۔ یہ کہا گیا کہ اُس کا نام یحییٰؑ ہوگا وہ ہمارے فرمان کی تصدیق کرے گا۔ اُس میں سرداری کی شان ہو گی۔ کمال درجے کا منتظم اور نبیؑ ہو گا۔ اُس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ تو زکریاؑ کا دِل مسرتوں سے لبریز ہوگیا۔ بے اختیار بول پڑے کہ میرے گھر لڑکا کیسے پیدا ہو گا!؟ میں ضعیف ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے! بظاہر امید کے ساتھ دعا کرنے والے زکریا علیہ السلام کی زبان سے بیٹے کی بشارت پا لینے کے بعد "کیسے" کے الفاظ حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اُن میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ انسان پر جب غیر متوقع طور پر اچانک اور دفعتاً کوئی کرم ہونے لگتا ہے تو وہ تڑپ اُٹھتا ہے کہ یہ کیا ہوا۔ کیونکر ہوا! ایسے الفاظ اپنے محسن کی عظمت کے منافی نہیں ہوتے بلکہ عظمتوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جن کے ذریعے اپنے معطی اور اپنے کریم کی عظمتوں اور عنایتوں کو آشکار کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کسی کریم نے ایسی پکار کو کبھی اپنی عظمت کے منافی نہیں جانا بلکہ ایسا والہانہ پن کریم ذاتوں کے دِلوں میں بھی بہجت و سرور کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ دراصل جو کرم حیران نہ کر دے وہ کرم نہیں ہوتا۔ کرم کی تو شان ہی یہ ہے کہ وہ حیرتوں میں ڈبو دیتا ہے۔ رب تعالیٰ جو زکریاؑ کی کیفیت سے واقف تھا۔ زکریاؑ سے محبت بھرے انداز میں مخاطب ہو کر فرمانے لگا! کہ زکریاؑ! ایسا ہی ہو گا ہم ایسا ہی کریں گے۔ ہم ایسا کرنے پر قادر ہیں۔

زکریا علیہ السلام نے صرف پاکیزہ بیٹے کی آرزو کی تھی لیکن جن صفات کے بیٹے کی بشارت سے انہیں نوازا گیا۔ اُن کی تو انہوں نے طلب نہ کی تھی۔ یہ خالصتاً رب تعالےٰ کی عطا تھی۔ جو گوناگون انعامات کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اور زکریا سپاس گزاری کے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے رب کی حمد و ثنا کرنے لگے۔ حضرت زکریا اپنے رب سے دعا مانگتے وقت بڑی رازداری سے کام لے رہے تھے تاکہ لوگ ضعیفی میں بچے کی آرزو کرنے کو خلافِ عقل جان کر اُن کا مذاق نہ اُڑائیں۔ دعا میں جو گداز تھا۔ وہ اِن الفاظ سے ظاہر ہے کہ پروردگار! میری ہڈیاں گل چکی ہیں اور سر بڑھاپے سے بھڑک اُٹھا ہے۔ میں کبھی دعا مانگ کر تجھ سے محروم نہیں رہا۔ دعا کا سوز ہی رحمت کو متحرک کرتا ہے اور زکریا کے الفاظ تو سوز و درد میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بیچارگی کے احساس کی جو جھلک دعا میں نظر آرہی ہے وہ خود رحمت ہے کیسے قبول نہ ہوتی!

حضرت زکریا ایسا بچہ چاہتے تھے جو اُن کا وارث بن سکے۔ وراثت سے اُن کی مراد دینوی مال و منال کی وراثت نہ تھی کیونکہ دینوی مال انبیاءؑ کی وراثت نہیں ہوتا اور نہ وہ ایسی چیز کی حفاظت کی آرزو کرتے ہیں۔ اُن کی میراث وہی ربّانی نور تھا جو انہیں اپنے رب سے ملا تھا اور جسے وہ دنیا میں پھیلانا چاہتے تھے۔ حضرت زکریا نے دعا کے لئے رازدارانہ طریقہ اختیار کیا تھا اور حضرت مریم نے بھی مناجات کے لئے مسجدِ اقصےٰ کے شرقی حصّے کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ پسِ پردہ بیٹھ کر وہ مناجات میں مصروف تھیں۔ رازداری کا عالم یہاں بھی تھا۔ کیونکہ مناجات بھی بندے اور اُس کے رب کے درمیان راز کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی شخص دوست سے باتیں کرتے وقت غیر کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ خلوت چاہتا ہے تاکہ کھل کر بات کر سکے اور دوست کی سُن سکے۔ حضور علیہ السلام کی غارِ حرا کی زندگی بھی بلا سبب نہ تھی۔ یہ خلوت گزینی بھی راز و نیاز کی حیثیت رکھتی تھی اسی لئے اس کے اسرار آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکے۔ خدا جانتا ہے کہ غارِ حرا میں کیا تھا۔ یا وہ ذات جانتی

ہے جس نے اپنے سوز و درد کے اظہار کے لئے ایسی ویران اور خاموش جگہ کو منتخب کیا - جو رہگذر عام نہ تھی - یہ مقام خدا کو بھی پسند آ گیا - اسی لئے پہلی وحی کا نزول یہیں ہوا - مریمؑ کا شرقی گوشہ بھی خدا کو پسند آ گیا - یہیں فرشتہ بشری صورت میں آیا - جسے دیکھ کر مریم علیہا السلام ڈر گئیں اور بولیں اگر تو کوئی پاکباز انسان ہے تو میں تجھ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں - جبریلؑ بولے کہ میں تیرے رب کا بھیجا ہوا قاصد ہوں - اس لئے آیا ہوں کہ تجھے پاکیزہ بچہ عطا کروں - یہ عطا و بخشش اگرچہ رب کی طرف سے تھی - لیکن نمائندہ بن کر آنے والے کا اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا بھی چنداں حیرت انگیز نہیں - ایسے مواقع پر بالعموم ایسے مجازات روا رکھے جاتے ہیں - نظر معطی پر رہتی ہے - عطا بھی اسی کی ہوتی ہے - البتہ نمائندہ بھی غیر وقیع قرار نہیں پاتا - اس کے اختیارات میں صاحب عطا کے اختیارات کی جھلک دیکھ کر یک گونہ لذت محسوس ہونے لگتی ہے - عظیم ذات کا نمائندہ ہمیشہ ذی اختیار ہوتا ہے - گھسیارے کے نمائندے میں اختیار کی کیا شان ہو گی ؟ اس کا تو لب و لہجہ ... بھی بے بسی کا غماز ہوتا ہے اور عظمت والی ذات کے نمائندے کے لب و لہجے میں بھی عظمت کی شان جلوہ گر ہوتی ہے

فرشتے کی زبان سے بچےؑ کی پیدائش کا مژدہ سن کر مریمؑ نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ مجھے تو کسی بشر نے چھوا تک نہیں - فرشتے نے یہ نہیں کہا کہ اب تمہارا نکاح کر دیا جائے گا - بلکہ وہی بات کہی جو زکریاؑ کے جواب میں کہی تھی - وہاں بھی یہی کہا گیا تھا کہ ایسے ہی ہو گا - یہ کام رب تعالٰی کے نزدیک مشکل نہیں - یہاں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا - مریمؑ کی طرف بشارت لے کر آنے والے فرشتے کو رب نے اپنی روح کہا ہے - روح چونکہ نظر آنے والی چیز نہیں سراسر لطافت ہی لطافت ہے - اسی لئے فرشتے کو بشری صورت میں متمثل ہونا پڑا - فرشتہ اصلی صورت میں آتا تو شاید مریمؑ اسے نہ دیکھ سکتیں اور اس کی آمد کا وہ مقصد فوت ہو جاتا جس کے لئے فرشتے کو مامور کیا گیا تھا - بشارت کا فریضہ سرانجام دینے کے لئے اور مریمؑ کو ایک نئے مشاہدے سے

گزارنے کے لئے فرشتے کو ملکیت کے مقام سے اتر کر بشریت کے مقام پر آنا پڑا۔ مقام دونوں رفیع تھے۔ رضا کی وادی میں عروج و نزول کوئی نئی چیزیں نہیں۔ یہاں عروج بھی ہوتا ہے اور نزول بھی، عروج بھی عروج عطا کرنے والی ذات کی عظمتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور نزول سے بھی اس کی قدرتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ جلوہ گری دونوں جگہ عظیم ذات کی ہوتی ہے۔ فرشتے کا بشری قالب میں ڈھلنا خدا تعالےٰ کی رضا کے لئے تھا۔ اسی لئے روح قرار دے دیا گیا۔ روح کا عطیہ بھی چونکہ لطیف ہوتا ہے۔ اسی لئے روح کی نسبت نے انہیں بھی روح اللہ کے نام سے موسوم کر دیا۔ فرشتے سے روحانی فیض پانے کے بعد مریمؑ امید سے ہو گئیں تو انہیں اپنا مستقر تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ مسجدِ اقصےٰ کا مشرقی مقام جو اُن کا مستقر تھا وہاں سے اٹھ کر وہ ایسی جگہ آ گئیں جو وہاں سے دور تھی اور جہاں مسجدِ اقصیٰ کے زاہدوں اور زائروں کی نظر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ مسجدِ اقصیٰ کی جگہ اب اُن کے لئے جائے امن نہ ہو سکتی تھی۔ ہر شخص کے دل میں یہ خیال گزر سکتا تھا کہ ایک ایسی دوشیزہ جس نے اپنی تمام تر زندگی عبادت و ریاضت کے لئے وقف کر رکھی ہے اور اِس مقصد کے لئے اُس نے مسجدِ اقصیٰ کو اپنا مستقر بنا لیا ہے۔ یکایک حاملہ کیسے ہو گئی؟ کتنے خطرے اور وسوسے پیدا ہو سکتے تھے۔ جن سے بچنے کے لئے مریمؑ نے علیحدگی اختیار کر لی۔ چنانچہ بچے کی پیدائش کے وقت وہ ایک کھجور کے نیچے آ گئیں۔ یہیں خدا کا حکم پورا ہوا اور عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہو گئے۔ زچگی کے عالم میں اُن کا قلق و اضطراب حد سے گزر چکا تھا۔ اور وہ کہہ رہی تھیں کاش میں مر گئی ہوتی۔ میرا نام و نشان مٹ گیا ہوتا یہ سارا قلق و اضطراب انہیں اس احساس نے بخشا تھا۔ کہ میری گود ہری بھری دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے۔ میں انہیں کیا جواب دوں گی؟ بچّے کی پیدائش اگر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کا نتیجہ ہوتی تو انہیں اِس اضطراب سے دوچار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

احساسِ ندامت ہی انہیں مقدّس مقام سے دُور لے آیا تھا۔ اور اسی نے انہیں قلق و

اضطراب سے آشنا کردیا تھا۔ اسی عالم میں انہیں فرشتے کی آواز سنائی دی جو تسلّی و تشفّی کے الفاظ سے معمور تھی۔ مریمؑ سے کہا گیا کہ کھجور کے تنے کو ہلاؤ اس سے کھجوریں برسیں گی۔ انہیں کھاؤ اور اُس چشمے سے پانی پیو جو تمہارے قریب جاری کر دیا گیا ہے۔ چشمہ بھی کرشمۂ قدرت کا ظہور تھا اور کھجوروں کی تازگی بھی رضا کے خیابانوں کے پھل کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ نعمتیں اور عطاؤں کے یہ معجزات اس ذات کے لئے تھے جو پیکرِ تسلیم و رضا تھی۔ اُس کے احساسِ ندامت کو کم کرنے کے لئے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اگر تم کسی انسان کو دیکھو تو اس سے کہہ دو کہ میں نے بات نہ کرنے کا روزہ رکھ چھوڑا ہے۔ اسی عالم میں وہ اپنی قوم کے پاس آگئیں جو اُسے دیکھ کر بھڑک اٹھی۔ ہر طرف سے طعن و تشنیع کے تیر برسنے لگے۔ ہر شخص یہی کہہ رہا تھا کہ ہارون کی بہن! تو نے کیا غضب کیا ہے؟ تیرا باپ تو ایسا نہ تھا اور تیری ماں بھی بری نہ تھی۔ رسم و رواج کے مطابق مریمؑ کا نکاح ہوتا تو یہ طوفان کیوں اٹھتا؟ وہ یہ کہہ کر اُن کی زبان بند کر سکتی تھیں کہ میرا بچہ جائز نکاح کا نتیجہ ہے۔ بغرض قوم کے استفسار کے جواب میں مریمؑ نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ طرزِ عمل اور بھی حیران کن تھا لیکن عیسٰی علیہ السلام بول پڑے۔ انہوں نے وہ تمام باتیں کہہ دیں۔ جو اس وقت کے لئے موزوں ہو سکتی تھیں۔ حضرت زکریاؑ کے پاس بھی بچے کی بشارت لے کر فرشتہ ہی آیا تھا یہاں آنے والا بھی فرشتہ ہی تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں آنے والا قانون اور قاعدے کے مطابق آیا تھا۔ اور یہاں اُس کی نمود بشری لباس میں ہوئی تھی۔ زکریاؑ کو بشارت دی گئی اور یہاں یہ کہا گیا کہ میں عطا کرنے آیا ہوں۔ ایک اور فرق جو ہمیں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ زکریا علیہ السلام نبی تھے اور مریمؑ نبی نہ تھیں ان کا تعلق جہانِ ولایت سے تھا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی تمام تر زندگی چونکہ تشریعی تھی۔ اس لئے فرشتہ بھی قاعدے اور قانون کے مطابق آیا۔ مریمؑ کی زندگی میں تکوین کی شان جلوہ گر تھی۔ نذر بن کر مسجدِ اقصیٰ میں پہنچنا۔ اسباب کے بغیر زندگی گزارنا۔ غیبی رزق کا آنا۔ اور بغیر عام قاعدے اور قانون کے بغیر بچے کا ملنا۔ چشمے کا جاری ہونا۔ سوکھے تنے سے کھجوروں کا ملنا۔ یہ تمام امور

تکوینی تھے۔ اس لئے فرشتہ بھی آیا۔ تو بشری لباس میں۔ بچّہ عطا کرنے کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی تو یہ بھی خلاف قاعدہ تھا۔ غرض تکوین کی ہر جگہ جلوہ گری نظر آتی ہے تکوینی نسبت ہی کا اثر تھا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام بول پڑے۔ یہ نسبت انہیں وراثت کے طور پر ماں اور جبریلؑ دونوں سے ملی تھی اور اسی نسبت کا اثر تھا کہ وہ بڑے ہو کر جب مخالفین سے باتیں کرنے لگے تو اُن کا ارشاد یہ تھا کہ میں پرندوں کی صورتیں بنا کر پھونک دوں تو وہ خدا کے فضل سے اُڑنے لگتے ہیں۔ مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کر دیتا ہوں خدا کے حکم سے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہوں۔ جو کچھ تم گھروں سے کھا کر آتے ہو یا ذخیرہ کرتے ہو وہ بتانے کی قدرت رکھتا ہوں۔ یہاں ہر جگہ تکوینی نسبت بول رہی ہے۔ فرشتے نے بھی "بچّہ عطا کردوں" کہا تھا اور حضرت عیسٰی علیہ السلام بھی تمام باتوں کی نسبت اپنی ذات کی طرف کر رہے ہیں۔ یہ اسی نسبت کا اثر ہے جو عالمِ ملکوت سے پیوند رکھنے والے فرشتے کی وساطت سے انہیں ملی تھی باپ کے ذریعے پیدا ہوتے تو یہ تکوینی شان جلوہ گر نہ ہوتی۔

فرشتے کے ذریعے پیدا ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ اُن میں بشری صفات کی نسبت ملکی صفات زیادہ تھیں۔ ملائکہ بھی بام و در سے بے نیاز ہوتے ہیں اور انہیں بھی کبھی مکان کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بس یوں ہی زندگی گزار دی۔ شادی بھی اسی لئے نہیں کی کہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ غرض حضرت عیسٰیؑ کا شادی نہ کرنا عین مقتضائے فطرت تھا دوسرے امور جو اُن سے ظاہر ہوئے۔ اُن میں بھی اُن کی پیدائش اور حضرت مریمؑ کی راہبانہ زندگی کا عمل دخل تھا۔ نسبت اور تعلق کی اثر آفرینی سے انکار ناممکن ہے ماں کے دودھ کا بھی اثر ہوتا ہے۔ اور باپ کی صفات کا بھی، خواہ وہ کسی بھی نوعیت کی ہوں۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زندگی میں معجزات کی جو کثرت نظر آتی ہے وہ اسی لئے ہے کہ اُن کا ظہور دمِ جبرئیلؑ کی باعث ہوا تھا۔ جو انجام کار دمِ عیسٰیؑ بن کر نمودار ہوا کن تکوینی قوّتوں کی جلوہ نمائی وہاں بھی تھی اور یہاں بھی۔

یونسؑ اور مچھلی

حضرت یونس علیہ السلام کی زندگی کی وہ ساعتیں بڑی کرب ناک تھیں جب مچھلی انہیں پیٹ میں لے کر دریا میں اُتر گئی۔ اور اُن پر زندگی کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں یہ رات کا وقت تھا۔ کائنات پر تاریکیاں مسلط تھیں۔ اور پانی کی گہرائی اور مچھلی کے پیٹ کی تاریکی اس پر مستزاد تھی۔ لیکن نبیؑ کے دل میں ایمان و ایقان کی جو شمع روشن تھی اِن ظلمتوں میں وہ اور ضیا ریز ہو ئی۔ اسی روشنی میں انہیں اپنے رب کی شانِ جلالی و جمالی نظر آئی۔ انہوں نے اپنے رب کو ندا دی، پکارا، اور اُن کی پکار سنی گئی۔ یہی واقعہ دوسروں کے لئے سامانِ بصیرت بن گیا۔ یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ کہ رحم و کرم کا معاملہ حضرت یونس علیہ السلام کی ذات تک ہی محدود نہیں۔ پکارنے والا جب بھی پکارے غم و آلام میں ڈوب کر یا ظلمتوں میں گھر کر اُس کی فریاد سنی جاتی ہے۔ ظلمتیں، فریاد و فغاں کا راستہ نہیں روک سکیں۔ بشرطیکہ وہ سوز سے معمور ہوں۔ اجابت اُن سے ہمکنار ہو گی۔ اُن کے لئے رحمت کی آغوش کھلے گی۔ حضرت یونس علیہ السلام کی فریاد کا تعلق گو اُن کے اپنے حزن و ملال سے تھا۔ کسی اور کے درد سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن اُن کی یہی فریاد دوسروں کے لئے رہبر بن گئی۔ یونس علیہ السلام کی فریاد نے ربّ تعالےٰ کی رحمت کا جو دروازہ کھولا۔ وہ کبھی بند نہ ہو سکا۔ ظلمت، نصیبوں اور غم آشناؤں کے لئے اُن کا عمل پیامِ رحمت بن گیا۔ نبیؑ کی غم کی زندگی ہو یا شادمانی کی زندگی، دونوں میں رحمت مستور ہوتی ہے۔ نبیؑ کا غم بھی ہادی بن جاتا ہے۔ اُس کی حزنیہ کیفیّت میں بھی رحمت کے سامان موجود ہوتے ہیں اور وہ رحمت سے واصل کر دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کو غم سزا کے طور پر دیا جاتا ہے۔ لیکن انبیاؑ اور مقبولین کو جو غم ودیعت ہوتا ہے اُس کی حیثیت سراسر رحمت کی ہوتی ہے اپنے لئے بھی اور غیروں کے لئے بھی، نینوا کا علاقہ جو حضرت یونس علیہ السلام

کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اسی کی طرف وہ نبیؑ اور رسولؑ بنا کر بھیجے گئے تھے لیکن جب ان لوگوں نے اُن کا پیغام نہ سُنا۔ اُن کی آواز پر توجہ نہ دی۔ تو یونس علیہ السلام نے اُن کی ہلاکت کی دعا کی جو قبول ہوئی۔ عذابِ الٰہی کے آثار دیکھ کر یونس علیہ السلام نے اُن سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت یونسؑ کا خیال تھا کہ قوم سے علیحدگی معیوب نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ اسی لئے وہ کشتی کے ذریعے دور نکل جانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن انہیں ایک ناگہانی حادثہ پیش آ گیا۔ کشتی کو بڑی خطرہ لاحق ہو گیا۔ وہ ڈوبنے لگی تو یہ تاثر عام ہو گیا کہ کوئی غلام بھاگ کر کشتی میں سوار ہو گیا ہے اور جب قرعہ ڈالا گیا تو وہ یونس علیہ السلام کے نام نکل آیا۔ ہچکولے کھانے والی کشتی کے مسافروں نے یونس علیہ السلام کو اٹھا کر دریا میں ڈال دیا اس وقت خدا کے مقدس نبیؑ کو یہ احساس ہوا کہ انہوں نے نینوا کی سرزمین سے جو اس خطرے کے پیشِ نظر ہجرت کی ہے کہ اگر میں یہاں رہا تو مبادا مجھے بھی کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ یہ درست نہیں۔ مقرب کے قلب میں گزرنے والے خطرے پر بھی باز پرس ہوتی ہے۔ اُس سے مواخذہ کیا جاتا ہے مچھلی کے پیٹ میں یونس علیہ السلام کا چلے جانا بھی مواخذے ہی کی ایک صورت تھی لیکن جب انہوں نے توبہ کے دروازے پر دستک دی تو دروازہ کھل گیا۔ انہیں اپنے رب کی اور معرفت حاصل ہو گئی۔ اور قرب ملا۔ خشکی پر رب کی قدرت کا تماشا دیکھنے والی نگاہیں دریا کی تہہ میں شانِ قدرت دیکھ رہی تھیں۔ مچھلی کا پیٹ اُن کے لئے طور بن گیا۔ یہیں وہ رب سے ہمکلام تھے۔ مناجات کر رہے تھے اور اُن کی پکار میں بلا کا سوز تھا جو قبول ہوا۔ حضرت یونس علیہ السلام کی دعا سے نینوا کی بستی پر تو عذابِ الٰہی نازل ہو گیا لیکن نینوا کے لوگ باہر نکل کر عبادتِ الٰہی میں معروف ہونے کے باعث بچ گئے اپنے نبیؑ سے اعراض برتنے، اُسے جھٹلانے اور اُس کی تعلیمات کو نظر انداز کرنے کا انہیں شدید احساس تھا۔ اور یہی احساس اُن کے اشکوں اور آہوں کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔

آخر یہ کیفیت خُدا کو پسند آگئی۔ وہ عذاب سے محفوظ رہے۔ نینوا تو عذاب کی نذر ہوگیا۔ لیکن نینوا والے بچ گئے۔ یہ سب کچھ یونس علیہ السلام کی غیر حاضری میں ہوا تھا۔ اُدھر نبیؑ عتاب اور عطا کا مورد بنا ہوا تھا۔ اور اِدھر اُمت انہی کیفیتوں سے دوچار تھی۔ ایک کو دوسرے کے حال کی خبر نہ تھی۔ یونس علیہ السلام بیوی اور بچے کو لے کر ندی عبور کرنے لگے تو تند و تیز موجیں انہیں بہا کر لے گئیں۔ جب بچے کو دوبارہ آ کر لے جانے کا وعدہ کر گئے کنارے پر بٹھا گئے تھے۔ اُسے بھیڑیا لے گیا۔ مچھلی کے پیٹ میں بھی رہے۔ دریا کی گہرائی بھی دیکھی اور جب مچھلی مشیت ربانی کے مطابق دریا کے کنارے ڈال گئی تو خُدا تعالےٰ کی مامور کردہ ہرنی کا دودھ بھی پیا۔ مچھلی بحری جانور تھا۔ اور ہرنی بری جانور۔ دونوں سے سابقہ پڑا۔ دونوں کے اندر اپنے رب کی قدرت دیکھی۔ دونوں کو رب کا مطیع و فرمانبردار پایا۔ اب اطاعت کا جذبہ اور بھی فزوں ہو چکا تھا۔ نینوا والوں کے بچ جانے کی خبر سُنی تو اور بھی حیران ہوئے۔ نینوا پہنچے تو انہیں مطیع و منقاد پایا۔ بیوی بچے بھی مل گئے انہیں لوگوں نے ندی سے نکال لیا تھا اور بھیڑئیے سے چھڑا لیا تھا۔ یہ ایک نبیؑ کے مشاہدات ہیں جو خُدا تعالےٰ کی قدرتوں کے آئینہ دار ہیں۔"

عتاب اور خطاب

بعض مقامات پر اللہ کریم نے انبیاء علیہم السلام کو عتاب فرمایا ہے۔ بعض لوگ نہ صرف ایسے واقعات سے خود غلط اثر لیتے ہیں بلکہ انہیں غلط رنگ میں پیش کر کے نبوت اور رسالت کے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ عتاب ہر جگہ غیر محمود نہیں ہوتا۔ بعض مقامات پر اُس کی حیثیت سراسر حسن و جمال اور لطف و کرم کی ہوتی ہے مراسم محبت کی اُس وقت تک تکمیل نہیں ہو سکتی۔ جب تک محبت میں عتاب کا رنگ نہ آئے۔ ہر جگہ عتاب کو غیریت کی دلیل سمجھ لینا تو کوئی خوش ذوقی نہیں اور نہ ہر جگہ عتاب

سزا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ خالص عطا ہوتا ہے۔ قرب کو ظاہر کرتا ہے۔ تعلق کی وضاحت اسی سے ہوتی ہے۔ محبت کی جو داستان محبوب کی برہمی کی ہلکی ہلکی آنچ میں تشکیل پاتی ہے وہ لذیذ اور جاں پرور ہی نہیں ہوتی۔ عشق و محبت کے کئی جوان اور تُند و تیز جذبات کی خالق بھی بن جاتی ہے۔ نئی داستانوں کو اسی سے فروغ ملتا ہے۔ نئے افسانے اسی سے مرتب ہوتے ہیں نئے جذبات کو اسی سے زندگی نصیب ہوتی ہے۔ عتاب کی رُوح سے خالی داستان جو محض تصنع اور تکلف سے عبارت ہو کبھی پائندار نہیں ہو سکتی۔ وہ خود ہی بے رُوح ہوتی ہے محبت میں کیا جان ڈال سکتی ہے! عتاب کے ذریعے کبھی محبت کی رُوح کو بیدار کیا جاتا ہے۔ جذبات مشتعل کئے جاتے ہیں۔ تاکہ یہ آگ اور بھڑکے۔ یہ شعلہ اور فروزاں ہو۔ خطاب میں جب عتاب کا رنگ آجاتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہ محبت بھڑک اُٹھی ہے۔ یہ شعلہ جوان ہو گیا ہے۔ اب یہ جذبات میں گرمی پیدا کرے گا اُدھر بھی اور اِدھر بھی۔ کہیں ناز بن کر ظاہر ہو گا۔ اور کہیں نیاز بن کر۔ ناز تو کیا ہی اس لئے جاتا ہے تاکہ نیاز ظاہر ہو۔ ناز و نیاز کے مفاہیم عقل کی دسترس میں نہیں آ سکتے۔ یہ دنیا اور ہے اور یہ کوچہ اور۔ انبیاء پر ہونے والے عتاب سے ایک بات تو یہ واضح ہوتی ہے کہ جن امور میں اُن پر عتاب نہیں کیا گیا۔ اُن میں اُن کی اطاعت واجب ہے وہ بھی اگر رب تعالےٰ کو پسند نہ ہوتے۔ تو اُن پر بھی تنقید کی جاتی۔ مزید براں عتاب والے معاملات پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اہم اور پیچیدہ معاملات نہ تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جن پر اللہ کریم نے اپنے مقدس نبیوں کو ٹوکا اور انہیں تنبیہ کی۔ عوام اور خواص پر ہونے والے عتاب میں یہ بنیادی فرق ہے کہ عوام کو جرم پر تنبیہ کی جاتی ہے اور خواص کو اعلیٰ ترین مقام کے حصول میں ذرا سی کوتاہی برتنے پر بھی تنبیہ کا مستحق گردانا جاتا ہے یہ عتاب اس لئے ہوتا ہے کہ خوب تر کو کیوں نظر انداز کیا۔ اور یوں بھی خوب تر کی کوئی حد نہیں۔ ایک ہی چیز ایک انسان کی نظر میں غایت

درجہ حسین وجمیل ہوسکتی ہے اور دوسرا اسے یہ مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کپڑا کتنا ہی اچھا دُھل کر سامنے آئے اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ ابھی اور صاف ہونا چاہئے تھا۔ انبیاء علیہ السلام کے اعمال غایت درجہ حسین ہوتے ہیں۔ اُن میں معصیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ لیکن لسبا اوقات رب تعالےٰ انہیں تنبیہہ فرمانے لگتے ہیں کہ یہ ایسے کیوں ہیں! انہیں تو اور حسین ہونا چاہیئے تھا۔ اس اندازِ خطاب سے یہ سمجھ لینا کہ اُن سے کوئی غلطی ہوئی ہے نری بد مذاقی ہے۔ لطیف معاملات کو سمجھنے کے لئے لطیف ذوق کی ضرورت ہوتی ہے اور انبیاءؑ کی تعلیمات سے حصہ پانے والوں اور اُن سے نسبت رکھنے والوں کے علاوہ جب بھی کسی نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے تو سخت ٹھوکر کھائی ہے۔

حضور علیہ السلام کو منافقین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید فرمائی گئی تھی۔ اس لئے اُن سے حضورؐ کا سلوک فیاضانہ تھا۔ جب مسلمان رزم گاہ کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ تو منافقین نے بہانے تراش کر جنگ سے بچنے کی کوشش کی۔ حضورؐ نے اُن کے عُذر قبول کر لئے۔ اور انہیں مدینہ ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ رسالت کا یہ اقدام ربانی تعلیمات کے منافی نہ تھا۔ جس حسنِ سلوک کی حضورؐ کو تعلیم دی گئی تھی یہ اُسی کا ایک مظاہرہ تھا۔ لیکن بعد میں حضورؐ سے یہ کہا گیا کہ آپ نے انہیں اجازت کیوں دی ہے؟ حضورؐ نے بھی یہ نہیں کہا کہ میرے خالق و مالک! تو نے ہی تو مجھے اِن سے فیاضانہ برتاؤ کی تعلیم دی تھی۔ حضورؐ اس عتاب آمیز خطاب کی معنویت کو سمجھتے تھے۔ اس کی لذت وہی دل جانتا تھا جو مہبطِ انوار تھا۔ جس پر جبریلؑ انوارِ قدس اور اسرارِ معرفت لے کر نازل ہوتے تھے۔ محبوب ذات کی طرف سے نازل ہونے والے عتاب کے وقت عُذر تلاش نہیں کئے جاتے۔ وہ تو اطاعت گذاری اور جاں سپاری کے جذبات کو فروزاں کر دیتا ہے اُس پر تو جان نثار کی جاتی ہے۔ دِل اُس سے لذت گیر ہوتا ہے اور رُوح تسکین پاتی ہے کیوں کہ وہ پیامبرِ شوق کہلاتا ہے۔ سفیرِ محبت ہوتا ہے۔

محبوب کا عتاب دیکھ کر طبیعت مکدر ہو جائے۔ رُوح میں کوئی نشاط کا جذبہ پیدا نہ ہو اور دل لذتوں کا گہوارہ نہ بنے۔ تو یہ تعلق کی دلیل نہیں ہوتی۔ بلکہ لاتعلقی کا اعلان و اظہار ہوتا ہے۔ انبیاء علیہ السلام پر ہونے والے عتاب کی شان نرالی ہے۔ یہ سراسر لذّت و کیفیت ہے عشق و مستی کا پیام ہے اور اسے غیروں پر ہونے والے عتاب پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ حدیثِ خانہ ہے اور وہ حکایتِ بیگانہ، یہ رحمت ہے اور وہ عذاب ہے:

حضور علیہ السلام کے معجزات کا تو انبیائے سابقین کے معجزات سے بہت مقابلہ کیا گیا ہے اور ان کی فضیلت و برتری ثابت کی گئی ہے۔ لیکن جہاں جہاں حضورؐ پر عتاب ہوا ہے۔ حضورؐ کو رد کا اور لڈ کا گیا ہے اس کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اہلِ دِل اور اہلِ نظر نے اُن مقامات کی وضاحت نہیں کی۔ عشق و محبت کی داستان کو نامکمل رہنے دیا ہے۔ اسرار کے چہرے سے نقاب نہیں اٹھایا۔ اور رموزِ محبت کو بیان نہیں کیا۔ اِن مقامات پر عشق زمزمہ سرا ہوا ہے محبت کی کئی داستانیں چھیڑی ہیں۔ کئی دِل دھڑکے ہیں۔ کتنی آنکھوں نے آنسوؤں کے خزانے لٹائے ہیں۔ کیونکہ دل کو خون کئے بغیر محبت کی داستان کی تفسیر نہیں ہو سکتی۔ لیکن اِن عتاب آمیز خطاب کا انبیائے سابقین پر ہونے والے عتاب سے موازنہ نہیں کیا گیا۔ حالانکہ یہ عتاب بھی معجزے سے کم نہ تھا۔ نبیؐ کے ذریعے خرقِ عادات امور کے صدور کا نام اگر معجزہ ہے تو محبوب کی ایک جنبش، ایک حرکت، اور ایک ادا سے رحمت کے زیر و زبر ہو جانے کا نام کیا رکھا جائے؟ اُدھر ایک موقع پر انشاء اللہ نہیں کہا گیا۔ اور دلِ یزداں میں تلاطم آگیا کہ یہ کیا غضب ہو گیا ہمیں بھول گئے! ہمیں یاد کرو، نابینا صحابی عبداللہ بن مکتومؓ سے ذرا اعراض برتا تو وحی کے ذریعے محبوبؐ کے جمال کی تصویر کھینچ لی گئی۔ کہ محبوبؐ نے منہ پھیر لیا۔ تیوری چڑھالی، سراپائے جمال وحی بن گیا۔ قرآن میں جو تصویر کھینچی وہ سب نے دیکھ لی۔ بتیرِ دلبری

حدیث دیگر میں بیان ہوا۔ بات نابینےؓ کی تھی اور تصویر جمال کہلائی۔ اسی طرح کا معاملہ جو حضورؐ سے ہے کسی اور نبیؑ سے نہیں ہے، وہاں ایک آدھ مرتبہ عتاب ہوا ہوگا اور یہاں یہ سلسلہ وسیع بھی ہے اور دل افروز بھی۔"

مکّہ اور مدینہ

روضۂ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی زیارت کے بغیر حج کی تکمیل نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ حج سعادتوں کا ذریعہ بننے کی بجائے اُلٹا شقاوتوں کا ذریعہ بن جاتا ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی، اس نے مجھ پر جفا کی۔ جفا کا مفہوم ظلم اور زیادتی ہے۔ اور اپنے محسن کے احسانات کو نظر انداز کر دینے سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ نے کعبہ ہی کی طرف رہنمائی نہیں کی بلکہ رب کی طرف بھی رہنمائی کی ہے۔ کعبہ بھی حضورؐ کی تجلّی کا ایک ظل ہے رحمت کا پَرتو ہے۔ رحمت کو چھوڑ کر رحمت کے آثار و نقوش میں محو ہو جانا اور اُن ہی کے طواف کو کافی سمجھ لینا بے دانشی ہی نہیں۔ ایسی محرومی بھی ہے جس کا مداوا ممکن نہیں۔ تقرّب الٰہی کا ذریعہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔ اسی لئے مدینہ کے سفر کو غایتِ انتٰی کہا گیا ہے۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ اگر مغفرت و رحمت کی طلب ہے تو بارگاہِ قدسی صفات میں حاضری دو۔ یہاں سے شفاعت ہو گئی۔ تو مقبول ہو گی۔ کیوں کہ قبولیت کا دروازہ مدینہ ہے۔ کعبہ کے طواف کے وقت تکبیر و تہلیل کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ لیکن بارگاہِ جمال میں پہنچ کر بے زبانی ہی کیفیّات کی ترجمان بن جاتی ہے۔ مکّہ مقامِ جلال ہے اور مدینہ مقامِ جمال۔ مکّے میں عشق، مضطرو آشفتہ حال ہے اور مدینہ میں آسودۂ جمال۔ تجلّی دونوں جگہ ایک ذات کی ہے۔ جو وحدہٗ لاشریک ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ایک جگہ تجلّی کی شان جلالی ہے اور دوسری جگہ جمالی، تجلّی طُور پر پڑی تو اُسے جلا دیا۔ کعبے میں اُتری تو عظمت کا نشان بن

گئی۔ اور مدینہ میں آئی تو رحمت کہلائی۔ محبوبؐ کے جمال نے جلال کو جمال میں بدل دیا چاند کے توسل سے ملنے والی سورج کی روشنی میں تپش نہیں ہوتی وہ چاندنی کہلاتی ہے اور خنکی عطا کرتی ہے۔ جلال چاند میں آنے کے بعد جمال بن جاتا ہے اسی لئے مدینے کو جمال کی منزل کہا گیا ہے۔"

ذوق کے آئینے

حضرت ابوذر غفاریؓ ایک دفعہ جلیل القدر صحابہؓ میں بیٹھے اپنے قلبی تاثرات کا اظہار فرما رہے تھے اسی ضمن میں آپ نے فرمایا کہ بلا، عطا پر فوقیت رکھتی ہے۔ میرے نزدیک غم و آلام کی زندگی، عیش و عشرت کی زندگی سے افضل ہے۔ میں غم کو خوشی پر، رنج کو راحت پر، تکلیف کو راحت پر اور اضطراب کو سکون پر ترجیح دیتا ہوں، راحت و آرام کی زندگی میرے کام کی چیز نہیں۔"

جب یہ تاثر حسینؓ ابنِ علیؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ خدا ابوذرؓ پر رحم فرمائے۔ وہ کیا کہہ رہے ہیں! خدا عطا کا ارادہ کرے۔ تو ہم بلا کی آرزو کیوں کریں! وہ بلا نازل کرنا چاہے تو ہمیں بلا ہی کو نعمت جان کر سینے سے لگانا چاہیئے۔ عطا اور بلا میں امتیاز درست نہیں جو عطا ہو جائے وہی نعمت ہے خواہ وہ بلا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ حسینؓ ابنِ علیؓ کا تاثر ہے اور وہ ابوذر غفاریؓ کا نظریہ۔ دونوں پیکرِ تسلیم و رضا ہیں دونوں رضا کی وادی میں مہر و محبت کے غیر فانی نقوش ثبت کر چکے ہیں۔ دونوں کی داستانِ محبت حکایتِ بیگانہ نہیں۔ بلکہ حدیثِ خانہ ہے۔ ایک شہرِ ولایت کا تاجدار ہے اور ایک اقلیمِ امامت کا شہریار، دونوں غم چشیدہ ہیں اور دونوں مصیبت زدہ، دونوں کے بام و در پر صبح و شام رضا کا آفتاب تجلّیاں بکھیرتا ہے۔ جلوے لٹاتا ہے اور جلوے لوٹتا ہے، رضا کا حسن و جمال دونوں کی نظروں کا محور و مرکز ہے۔ رضا کے حسن کو ان سے فروغ ملا ہے اور رضا نے

انہیں تابناکیاں عطا کی ہیں۔ اقلیمِ ولایت ہو۔ یا شہرِ امامت دونوں میں اُن کا سکہ رواں ہے۔ دونوں میں محبت ان کے بام و در کا طواف کرتی ہے۔ دونوں جگہ عشق سر خمیدہ اور لذت دیدہ ہے۔ دونوں کے ذوق پر لب کشائی ناممکن ہے۔ حسن وادیٔ ایمن میں نقاب اُلٹے یا طور کے پتھروں کو اپنی جلوہ گاہ بنائے اور یا فاران کی چوٹیوں کو جلوہ نمائی کے لئے منتخب کرلے۔ اہتزاز پیدا کرنے کا موجب ثابت ہوتا ہے۔ یک رنگی حسن کا شیوہ نہیں۔ وہ وحدت کو کثرت میں پھیلا کر اپنی یکتائی کی شان دکھاتا ہے۔ آفتابِ کائنات کے گوناگوں مظاہر کے آئینے میں جلوہ ریزی کے باوجود یکتا ہے اس کی وحدت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مظاہر کے حجابات اُٹھا کر بھی دیکھا جائے تو وہ واحد ہے مظاہر میں بھی اُسی کی جلوہ گری ہے۔ شرکت اور کثرت کی صورت متصور نہیں ہوسکتی۔ کثرت کا جال تو بُنا ہی اس لئے گیا ہے۔ کہ وحدت کی شان آشکار رہے۔ جو جلوہ جہاں ہے اپنے صانع کی دلیل ہے یہ جلوہ ابوذر غفاریؓ میں ہو۔ صہیب رومیؓ اور بلالِ حبشیؓ میں یا حسین ابنِ علیؓ میں اس کا انکار ممکن نہیں ہوسکتا۔ مظاہر کے اختلاف کو زیادہ سے زیادہ ظرف و ذوق کے اختلاف کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اور یہ چیز معیوب نہیں بلکہ نظروں میں وحدت کے جلوے سمائے ہوئے ہوں تو یہ اختلاف بھی حسین نظر آنے لگتا ہے کیونکہ ہر ایک وحدت کا غماز اور شان یکتائی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

عہدِ رسالت میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ صحابہؓ نے بعض امور کو بعض پر ترجیح دی انہیں مرغوب جانا لیکن اُن کے اختلاف کو حضورؐ نے معیوب نہیں جانا کیوں کہ اُن کی نیت بخیر تھی اور وہ اُن کے ذوق کا معاملہ تھا۔

شوق کی تصویریں

خبابؓ بن ارت کا اُن خوش نصیب انسانوں سے تعلق تھا۔ جنہیں قرآن السابقون

الاّولون کے محبوب و دلآویز کے نام سے موسوم کرتا ہے اسلام لانے والوں میں چونکہ آپ کا چھٹا نمبر تھا۔ اسی لئے آپ کو سادس الاسلام کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

صحابہ رضکرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مکّی زندگی یوں بھی درد و کرب سے عبارت تھی۔ مصائب و آلام کے کڑکتے گرجتے بادل اُن کے عزم و ہمت کا امتحان لے رہے تھے۔ لیکن جن نفوسِ قدسیہ کی زندگیاں غلامی میں بسر ہو رہی تھیں۔ اُن کے لیل و نہار اور بھی صعوبت زا تھے انہیں اسلام لانے کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی۔

خبابؓ بھی غلام تھے لیکن اُن کا ذہن و ضمیر آزاد تھا۔ قدرت نے انہیں جس آستانے کی خاک بوسی کے لئے تخلیق کیا تھا۔ وہ اُسی کی چاکری پر نازاں تھے۔ اُسی کی محبت اُن کا سرمایۂ نازش و افتخار تھی۔ باطل کی شورشیں اُن کے دل سے آستانۂ نبوی کی تقدیس کم نہ کر سکیں۔ جب صبحِ آزادی طلوع ہوئی اور اسلام کا خورشیدِ عالمتاب مدینے کے اُفق پر جلوہ بار ہوا۔ تو دنیا کو خبابؓ کا وہ حسن و جمال دیکھنے کا موقع ملا جسے مکے میں چھائی ہوئی ظلمتوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اَب خبابؓ بدر کے مطلع پر بدرِ منیر بن کر چمک رہے تھے۔ احد کا اُفق اُن کی تجلیوں سے ضیاء بار تھا۔ حنین میں اُن کے جلوے نگاہوں کو درخشندگی عطا کر رہے تھے۔ غزوۂ خندق کی فضا اُن کے عزم و ایقان کی قندیلوں سے جگمگا رہی تھی۔ غزوۂ تبوک میں اُن کے صدق و صفا کی حکایت تھی ایک ہی داستان نے کتنی داستانوں کو فروغ بخشا۔ ایک ہی اُفق سے کتنے بدرِ منیر طلوع ہوئے۔ عشق جب مکہ کی کفر بار فضاؤں میں اسیر تھا۔ تو اُس کی حیثیت اجمال کی تھی مدینہ کی درخشندہ فضاؤں میں آیا تو پھیل گیا، تفصیل کہلایا۔ بدر و حنین، احد اور خندق اُسی کے مختلف اور متنوع جلوے تھے۔ ایک ہی حقیقت مختلف رنگوں میں ظاہر ہو کر مختلف احوال و کیفیات کی خالق بن رہی تھی۔ بناؤ بھی اسی کا تھا اور سنگھار بھی

اسی کا، بدر وحنین تو صرف عنوانات تھے۔ محبت کو اپنے اظہارِ بیان کے لئے کوئی موضوع چاہیئے۔ اور بدر وحنین صحابہؓ کی محبت ہی کے موضوع تھے انہوں نے اپنے خونِ دل سے اس تصویر میں رنگ بھرا۔ مصور کو جب معلوم ہوا کہ تصویر محبوب کی بارگاہ میں پہنچے گی تو وہ رنگ میں خونِ دل کی آمیزش بھی کر دیتا ہے تاکہ تصویر متنوع اور دل پذیر ہو سکے۔"

حضوری کی ساعتیں

عبادت کو کسی خاص مفہوم ومعنی میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک لا محدود وسعتیں رکھنے والی کائنات ہے ظاہر سے لے کر باطن کے ایک ایک گوشے تک جب عبادات کا اثر و نفوذ ہو۔ روح بھی عابد بن جائے۔ اور ذہن وخیال بھی، احساسات وجذبات بھی متاثر ہوں۔ اور وجدان وشعور بھی، تو عبادت کا مفہوم آشکار ہونے لگتا ہے، غیر شعوری طور پر جو عبادت کی جاتی ہے۔ اُسے عادات اور رسم کا نام تو دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے عبادت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی عبادت حجاب اور پردے کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ پردہ اُٹھنے کا نام ملاقات ہے۔ فاصلے جب مٹ جاتے ہیں۔ دوری، قرب میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تو اُسے وصال اور ملاقات کا نام دیا جاتا ہے۔ عبادت بھی خالق ومخلوق میں وصال اور ملاقات کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے نماز کو معراج المومنین کہا گیا ہے۔ دوست سے مل کر اگر کوئی لذت نصیب نہ ہو۔ نہ اس کا جمال متاثر نہ کرے نہ خیال، نہ گفتگو میں مزہ آئے اور نہ حضوری کی ساعتیں ہی احساسات کو لذ ذکر سکیں تو ایسی دوستی تعلقات کی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ بلکہ وجہِ ننگ وعار سمجھی جاتی ہے۔ دوستی کا تو مفہوم ہی یہ ہے کہ دوست کو جب بھی دوست کا خیال آئے۔ ساری تھکن دُور کر دے۔ رُوح

میں لذت بھر دے۔ اور جذبات کو اک نئی زندگی عطا کرنے کا موجب بن جائے اور حضوری نصیب ہو جائے۔ تو سارے غم بھلا دے۔ کلفتوں کو راحتوں میں بدل دے۔ غم کو خوشی کے سانچے میں ڈھال دے۔ یہ نہیں تو دوستی خام ہے، اور تعلق بودا ہے۔"

حضور علیہ السلام پریشانی میں نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ علیؓ ابن ابی طالب کے بدن سے نماز میں تیر کھینچ لیا جاتا تھا۔ اور انہیں احساس نہ ہوتا تھا۔ یہ ساری تعلق کی کرشمہ سازیاں ہیں حضوری کی لذتوں کا اعجاز ہے۔ کسی ذات کا قرب متاثر ہی نہ کرے۔ تو تعلق کیسا! تعلق کی تو یہ شان ہوتی ہے کہ وہ متاثر کرتا ہے ذہن کو بھی اور خیال کو بھی، احساس کو بھی اور شعور کو بھی، دل کو بھی اور نگاہ کو بھی، ذوق کو بھی اور وجدان کو بھی، ظاہر کو بھی اور باطن کو بھی، وہ تو لیل و نہار بدل دیتا ہے آنے والا خواہ کسی راہ سے آئے، خیال بن کر دل میں سمائے یا جلوہ بن کر نظر میں، وہ متکیف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بشرطیکہ وہ غیر نہ ہو۔ دیدہ و دل اس کے منتظر ہوں وصال کی لذت منتظر کا حصّہ ہے، بلکہ انتظار خود رحمت ہے مردود کو رحمت کا انتظار نہیں ہو سکتا۔

محبّت کے داغ

جنابؓ ابنِ ارت عہدِ فاروقی میں حضرت عمرؓ سے ملنے کے لئے آئے تو انہوں نے نہایت گرم جوشی سے اُن کا استقبال کیا۔ اور انہیں اپنے ساتھ مسند پہ بٹھا کر فرمانے لگے کہ اُن کے علاوہ ایک اور شخص اس تعظیم و تکریم کا مستحق ہے۔ حضرت خبابؓ نے جھٹ سوال کیا دوسرا کون ہے۔

حضرت عمر بولے کہ بلالِ حبشیؓ،

حضرت خبابؓ نے فرمایا کہ اسلام کی راہ میں، میں نے جو مصیبتیں برداشت کی ہیں۔ بلالؓ کی مصیبتوں کو ان سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کے بعد اپنی پشت سے کپڑا اٹھا کر وہ داغ دکھانے لگے جو ان کی ثابت قدمی کے آئینہ دار تھے۔ حضرت عمرؓ غایت درجہ جری اور بلند حوصلہ ہونے کے باوجود انہیں دیکھنے کی تاب نہ لا سکے۔ لیکن خبابؓ کے نزدیک یہی داغ محبت کے سرمائے اور اثاثے کی حیثیت رکھتے تھے۔ محبت جب نوازنے پر آتی ہے تو خلعتیں ہی عطا نہیں کرتی داغوں سے بھی نوازتی ہے جو داغ محبت کی عظمت کا آئینہ دار بن جائے۔ اس کی حیثیت عطا کی ہوتی ہے۔ وہ اپنے منعم کی عظمتوں کو بھی آشکار کرتا ہے اور جسے یہ داغ نصیب ہوتا ہے وہ بھی فروتر درجے کا انسان نہیں رہتا۔ میر شکاری کی نظر ہمیشہ بلند رہتی ہے وہ زاغ و زغن کو اپنے تیروں کا نشانہ نہیں بناتا۔ شہباز و شاہین ہی اس کے نخچیر بنتے ہیں۔ خبابؓ بھی عظیم ذات کے اسیر تھے۔ جب ان کی محبت میں بلالؓ کو شریک کیا گیا، تو وہ تلملا اٹھے کہ میری محبت لاشریک ہے اس میں کسی کو شریک کیوں کر رہے ہو۔

حضرت عمرؓ نے بھی ان کے اس احساس کی پاسداری کی۔ یہ نہیں کہا کہ بلالؓ کی محبت بھی تمہاری محبت کی مثیل ہے انہوں نے بھی اس راہ میں بڑی استقامت دکھائی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس طرح ان کے احساس کو ٹھیس لگے گی۔ محبت کا تو خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادیت منوا کر نہال ہو جاتی ہے کہ میں نے میدان مار لیا۔ اسے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہاں خامی رہ گئی ہے یا یہ کہ دوسرا بھی تمہارے جذبۂ فدائیت میں برابر کا شریک ہے تو اس کی ساری گرمی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے۔ پیار تو اس میں اس وقت آتی ہے جب اسے منفرد مانا جائے۔ اسے آبنائے جنس سے ممیّز و ممتاز سمجھا جائے۔

محبّت کا فروغ

کتبِ سماویہ میں حضور علیہ السلام کا اسم پاک موجود تھا. ذاتِ شریف کے اوصاف و کمالات کو اس قدر شرح و لبط سے بیان کیا گیا تھا کہ اُن کے دیکھنے کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش ممکن نہ تھی. یہی وجہ ہے کہ سلمان فارسیؓ اور عبداللہ بن سلامؓ کو بعثت کے وقت حضورؐ کو پہچاننے میں کوئی دقت پیش نہ آئی. سلمانؓ بھی پہچان گئے اور عبداللہ بن سلامؓ بھی. عبداللہ بن سلام کا تعلق یہود سے تھا اور سلمانؓ فارسی نصرانیت سے تعلق رکھتے تھے. دونوں صحابہؓ کی داستانِ حیات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کو حضورؐ کا شدید انتظار تھا. اور سلمانؓ فارسی تو اس راہ میں شدید مشکلات سے دوچار ہو چکے تھے. بعثتِ نبویؐ کے وقت وہ غلام بن کر مدینہ آچکے تھے. حضورؐ نے ہجرت فرمائی تو حضورؐ کی تحریک پر صحابہؓ نے چندہ فراہم کرکے انہیں آزاد کرایا. سلمانؓ کی آزادی کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی. کہ وہ اپنے غیر مسلم آقا کو کافی تعداد میں کھجور کے پودے لگا کر دیں گے. چنانچہ جب پودے لگانے کا وقت آیا. تو حضورؐ بھی پودے لگانے والوں میں شریک تھے. یہ سلمانؓ کی محبت کا صلہ تھا. حسن جب نوازنے پر آتا ہے تو عطا و بخشش ہی سے کام نہیں لیتا. غمخواری بھی کرتا ہے. دلاسے بھی دیتا ہے اور راہِ محبت میں بھی جو غم کھائے ہوتے ہیں ان کی ٹیسوں کو اپنے سینے کے اندر محسوس کرتا ہے.

یہ حسن کا اعترافِ محبت دراصل عشق کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے وہ اسے اپنے حق میں دادِ جان کر اپنے زخم بھول جاتا ہے. یہ وقت زخم دکھانے کا نہیں بلکہ زخم چھپانے کا ہوتا ہے تاکہ محبت اور پریشان نہ ہو. اُسے دکھ نہ پہنچے. حضورؐ کے پودے لگاتے وقت سلمانؓ اپنی تکلیف بھول چکے تھے. انہیں قلق تھا تو یہ کہ

حضورؐ کیوں تکلیف فرما رہے ہیں! عشق کے مقدر میں تو جلنا ہے۔ تڑپنا ہے۔ حسن کیوں زحمت قبول کرے! اپنے جمال کی رعنائیوں کے مقام سے نیچے اُتر کر پودے لگانے لگے۔ یہ تو اُس کی شان کے خلاف ہے۔

عشق بر ہر قدمے، حسن بہ راہے گاہے
مجھ کو شیریں کا قلق ہے غمِ فرہاد نہیں

سلمانؓ کا احساس بھی اپنی جگہ غلط نہ تھا۔ وہ بھی محبت کی ایک صورت تھی لیکن حضورؐ کا اپنے دستِ مبارک سے پودے لگانا بھی خالی اَز علّت نہ تھا۔ بظاہر زمین میں پودے لگ رہے تھے۔ سلمانؓ کی آزادی کا سامان فراہم کیا جا رہا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ سلمانؓ کو تسکین دی جا رہی تھی کہ اُس کی محبت رائیگاں نہیں گئی۔ ہم اس کے خریدار ہیں۔ اس کی محبت اَوجِ کمال حاصل کر چکی ہے اب اس کے پھلنے پھولنے اور نئی بہاروں سے ہم آغوش ہونے کا وقت آگیا ہے اور یہی چیز سلمانؓ کے لئے طمانیت کا موجب تھی۔

ایک ہی کیفیت سلمانؓ کو لذت آشنا بھی کر رہی تھی اور مضطرب بھی! اور اِنہی گوناگوں کیفیات سے اُن کی محبت نے فروغ پایا تھا"

مال اور جمال

ابتدائے اسلام میں جو لوگ ایمان لائے تھے۔ اُن میں ایسے بھی تھے جن کے دلوں میں اسلام نہ اترا تھا۔ ان میں مال و منال بانٹ کر اُن کی تالیفِ قلوب کی جاتی تھی تاکہ اُن کی رغبت اسلام کی طرف بڑھے۔ ایسے لوگوں کو مؤلّفۃ القلوب کہا جاتا تھا: اُن کی زکوٰۃ سے دلجوئی کی جاتی تھی۔ اور دوسرے مال میں بھی اُن کا حصہ تھا۔ بلکہ مستحق کی حیثیت سے انہیں اوّلیت کا درجہ حاصل تھا۔ حضور علیہ السلام نے ایک دفعہ

مال تقسیم کرتے وقت ایک کو دیدیا اور دوسرے کو نظر انداز کر دیا۔ تو سعد ابن ابی وقاصؓ کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے سوال کیا کہ ایسا کیوں ہوا! یہ بھی تو ایمان کی دولت سے مالا مال ہے۔ لیکن حضور علیہ السلام نے محروم رہ جانے والے صحابیؓ کے متعلق فرمایا کہ یہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اسے نہ دیا گیا تو اس کے دل میں کوئی خطرہ نہ گزرے گا لیکن پہلے کی یہ حالت نہیں اسے ترغیب و تحریص کی ضرورت ہے۔ یہیں سے ہم اسلام لانے والوں کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ترغیب و تحریص سے لائے گئے تھے۔ اُن کا حصہ مال و منال تھا۔ انہیں زکوٰۃ ملتی تھی۔ جمال کے شیدائیوں کا حصہ مال نہ تھا۔ انہیں جمال کی لطافتوں سے نوازا جا رہا تھا۔ اُن پر جمال کے اسرار کھلتے تھے۔ انہیں معرفتِ رسولؐ نصیب ہوتی تھی۔ پروانے کے حصہ میں سوز ہے شمع کا جمال ہے۔ محفل کی رنگینیوں پر اس کی نظر نہیں ہوتی وہ نہیں دیکھتا کہ شمع کا لباس کیا ہے فانوس کا رنگ کیا ہے۔ وہ کس ماحول اور کس محفل میں جل رہی ہے! وہ تو جلوے لوٹتا ہے، جاں نثار کرتا ہے۔ طواف اس کے مقدر میں ہے۔ لوٹنا اور تڑپنا اس کا شیوہ ہے حضورؐ مکے میں عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ تو شمعِ رسالت کے پروانوں کا رقص تب بھی جاری تھا۔ بلالؓ کوئلوں پر لوٹ رہے تھے۔ ابوذرؓ کی زبان پر زمزمہ توحید و رسالت تھا۔ حضورؐ مدینے آئے۔ تو بدر و حنین کے میدانوں میں کفار کی بڑکائی ہوئی آگ بھی اس سوز کو کم نہ کر سکی۔ ان کا شوق اور بڑھا ان کے درد نے اور کروٹ لی۔

روحِ انسانی

ازل میں جس روح نے اقرارِ ربوبیت کیا تھا وہ انسانی رُوح تھی۔ حیوانی

روح تو عناصر کے ترکیب پانے کے بعد وجود میں آتی ہے اور اس کا ثبات و قیام عناصر کے ثبات و
قیام پر موقوف ہے۔ عناصر ایک خاص صورت میں ترکیب پاتے ہیں تو حیوانی روح وجود
میں آتی ہے۔ عناصر کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے۔ تو حیوانی روح بھی مٹ جاتی ہے
کیونکہ فنا سے ظاہر ہونے والی چیز باقی نہیں رہ سکتی۔ موت اسی حیوانی روح کی جسم سے
مفارقت کا نام ہے۔ روحِ حیوانی کے مٹنے سے وہ روح نہیں مٹتی۔ جو ازل میں مخاطبۂ
ربانی سے مشرف ہوئی تھی جس نے صبحِ الست بلیٰ کہا تھا۔ جب ہستی کا شیرازہ منتشر
ہو جائے گا۔ اور موجوداتِ عالم کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ تو روحِ انسانی اس
وقت بھی موجود ہو گی۔ اسی سے محاسبہ ہو گا۔ یہ خطاب کی لذت چکھے گی۔ ازل میں
بھی یہ صہبا اسی نے چکھی تھی۔ اور ابد میں بھی یہ جام اسی کے حصہ میں آئے گا۔
ازل میں خطابت کی لذت سے بہرہ یاب ہونے کے بعد جن روحوں پر مستی اور
سرشاری طاری ہوئی تھی وہ ازل سے مست ہیں اور ابد تک مست رہیں گی۔
مادیات کی دنیا میں آنے کے بعد ان کا قلق و اضطراب اپنی اصل سے واصل ہونے
کے لئے ہے۔ مولانا رومؒ نے جس روح کو بنسری سے تشبیہ دی ہے وہ یہی انسانی
روح ہے جو نیستانِ ازل سے کٹ کر فریاد و فغاں میں مصروف ہے اور اس کا یہ
نالہ و شیون اس وقت تک کم نہ ہو گا۔ جب تک یہ واصلِ ذات نہ ہو گی!
ہجر کے لیل و نہار کاٹنے کے بعد جب یہ حریمِ جمال کے دروازے پر پہنچے گی۔
جسے جنت کا نام دیا گیا ہے۔ تو اس کے کانوں میں اسی شاہدِ حقیقی کی آواز آئے
گی۔ جس نے ازل میں اسے پکارا تھا۔ اس وقت عہد لیا گیا تھا اور اب عہد کی تکمیل
کا صلہ ملے گا۔ اس کا رب اس سے راضی ہو گا۔ اور یہ رب سے راضی ہو گی ایسے حال میں
دونوں ہیں گے کہ ایک کو دوسرے سے کوئی گلہ نہ ہو گا۔ وصال کی لذتیں ہجر کے غم و
آلام کی کلفتوں کو محو کر دیں گی۔ اور اب کوئی غم اس کے قریب نہ پھٹک سکے گا۔ دائمی

کیف و سرور کی اس منزل کا نام جنت ہے جہاں رضوان کے پھول کھلے ہوں گے رضا
کی بہاریں متشکل ہو کر سامنے آئیں گی۔ دنیا میں بھی اس رُوح کی غذا مادی نہ تھی۔
بلکہ خالصتاً نورانی تھی۔ یادِ دوست کی نغمہ سنجی نے اسے مٹنے نہ دیا۔ مادی غذا اور
مادی لذتیں تو رُوحِ حیوانی کا حصہ ھیں۔ اس عالمِ نور میں نہ رُوحِ حیوانی ہو گی اور
نہ اس کی غذا۔ نُور سے بہرہ یاب ہونے کے لئے یہاں نُورانی سامان ہو گا۔ یہیں
سے حُوروں سے اس کے تعلق کی نوعیّت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ جگہ سفلی جذبات
سے پاک ہو گی۔ اور حوریں مظہرِ جمال ہوں گی۔ جمال، جمال سے لذت پائے گا۔ حُسن
آئینے کو دیکھ کر خوش ہو گا۔ نُور کی دنیا میں سفلی جذبات کا گذر کہاں؟ جنسیت
تو حیوانی جذبات کا خاصہ ہے اور انہی جذبات پر بقائے نوع منحصر ہے، یہ دنیا ایسے
جھنجھٹوں سے پاک ہو گی۔ یہ رُوح جنت میں جوان داخل ہو گی۔ ازل میں بھی یہ جوان
تھی کیونکہ نابالغ سے عہد نہیں لیا جاتا۔ اور اس کا عہد معتبر نہیں ہوتا۔ ماہ و سال کی
گردشیں اس پر اثر انداز نہیں ہو سکیتں۔ کیونکہ یہ لطیف ہے اور لطیف کی کوئی عمر
نہیں ہوتی۔ ہوا کی عمر کیا ہے؟ خوشبو کی کیا عمر ہو سکتی ہے! شمع کا نور شام سے صبح
تک جوان رہتا ہے بشرطیکہ اسے تیل کی غذا ملتی رہے۔ رُوح کو بھی یادِ الٰہی کی
غذا میسر ہو تو وہ ضعیف نہیں ہوتی۔"

سلیمانی جلوے

قرآن کریم نے گذری ہوئی قوموں کے جو قصے بیان فرمائے ہیں۔ اُن کی حیثیت
محض داستان سرائی کی نہیں۔ بلکہ اُن میں حکمت اندوزی اور عبرت پذیری کے بے شمار
دفتر پوشیدہ ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جنہیں قدرت کی طرف سے غیر معمولی تصرّف و
اختیار بخشا گیا تھا۔ اور جن کی خدا تعالےٰ کی اَن گنت مخلوق پر حکومت تھی۔ قرآن یہ کہتا

ہے کہ وہ چیونٹی کی آواز بھی سنتے تھے۔ اس کی باتوں کا مفہوم بھی سمجھتے تھے۔ جب ایک چیونٹی نے ان کے لشکر کی آمد کی خبر پاکر دوسری چیونٹیوں سے کہا کہ آؤ بل میں گھس جائیں سلیمان کا لشکر بے خبری کے عالم میں ہمیں پامال نہ کردے۔ تو سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کی یہ بات سن کر تبسم فرمایا اور اپنے رب کا شکر ادا کیا۔ جس نے انہیں چیونٹیوں کی بات سننے اور سمجھنے کی توفیق بخشی تھی۔ چیونٹی کا یہ کہنا کہ سلیمان علیہ السلام کا لشکر بے خبری کے عالم میں ہمیں پامال نہ کردے۔ سلیمان علیہ السلام کے لئے اور بھی طمانیت کا موجب تھا۔ اس لئے کہ چیونٹی سمجھ رہی تھی کہ سلیمان علیہ السلام کے لشکری دنیا والوں کے لشکر کی طرح ظالم و جابر نہیں۔ نبیؑ کے قرب نے انہیں اتنا رحیم و کریم بنا دیا ہے کہ قصداً اور ارادۃً وہ چیونٹی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ہاں بے خبری کے عالم میں ایسا ہو جائے تو ناممکن نہیں چیونٹی کی طرف سے خدا تعالےٰ کے برگزیدہ نبیؑ اور رسول کو یہ بہت بڑا خراجِ عقیدت تھا۔ اس کے تاثرات سے صاف طور پہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبوت کا مفہوم سمجھتی تھی یہ جانتی تھی کہ نبی کی صحبت میں انقلاب ماہیت کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ فوجی جنہیں بالعموم جابر اور سخت مزاج سمجھا جاتا ہے۔ نبیؑ کی صحبت میں رہ کر اس درجہ رحیم و کریم بن چکے ہیں کہ ان سے بالارادہ ضرر رسانی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ دنیا میں بالعموم جو فتنے پیدا ہوتے ہیں ان کی بنیاد نبوت کی عدم معرفت ہے۔ نبی کو اپنی ذات پر قیاس کر لینے کے بعد جو لوگ نتائج اخذ کر لیتے ہیں وہ درست نہیں ہو سکتے۔ ذات ہی کی معرفت نہ ہو تو صفات کی معرفت کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔؟ ذات و صفات کا تعین درست ہو تو ذات و صفات کا علم بھی درست ہوگا۔ سلیمان علیہ السلام کے عہد کی چیونٹی کے علم میں نبوت کا جو مفہوم تھا۔ وہ ان عقلمندوں اور عقل و دانش کے مدعیوں کے مفہوم سے زیادہ درست تھا۔ جو بات بات میں مین میخ نکالنے کے عادی ہوتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ وہ کوئی خلافِ عقل بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔ حالاں کہ ان کی عقل کی دنیا غایت درجہ

محدود ہے۔ ایک عقل مند کی بات دوسرے عقل مند کی سمجھ نہیں آتی۔ اور یہ شب و روز آپس میں اُلجھے رہتے ہیں۔ قرآن نے سلیمان علیہ السلام کے عہد کی جس چیونٹی کے مقولے کو نقل کیا ہے اس کے ساتھ دوسری چیونٹیوں کے تاثرات کو بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جس کا واضح طور پر یہ مفہوم ہے کہ دوسری چیونٹیاں بھی اپنی ہم جنس چیونٹی کے تاثرات سے ہم آہنگ تھیں۔ ان کا بھی نبوت کے بارے میں یہی اعتقاد تھا۔ کہ وہ فیض رساں ہوتی ہے ظاہر کا تزکیہ کرنے کے ساتھ ساتھ باطن کا تزکیہ بھی کردیتی ہے۔ چیونٹی جو اللہ تعالیٰ کی ضعیف ترین مخلوق ہے۔ ربانی ارشاد کے مطابق وہ علم و ارادہ کی بھی مالک ہے وہ بات کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم نہیں۔ نبوّت کے متعلق اس کے صحیح احساس کو بھی فیضانِ نبوّت کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ نبی کی راہ میں ہونے کے باعث وہ سلیمانی جلوؤں سے منور و مستنیر تھی۔ جلوہ کسی نوعیت کا ہو وہ اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ اور یہ تو سلیمانی جلوؤں کی زد میں تھی۔ نبی کے جلوے معلم ہی نہیں ہوتے، مزکّی بھی ہوتے ہیں۔ باطن کا تزکیہ بھی کرتے ہیں اور ظاہر کو بھی سنوارتے ہیں۔ نِری تعلیم سے تزکیہ ممکن ہوتا تو انبیاءؑ کو تربیت کی ضرورت پیش نہ آتی۔ نبی کی ایک جھلک دیکھ لینے سے باطن کو جو پاکیزگی نصیب ہو جاتی ہے وہ صدیوں کی عبادت و ریاضت کے بعد بھی ممکن نہیں ہوتی۔ اسی لئے کوئی عابد صحابہؓ کے رُتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ اِن نفوسِ قدسیہ نے براہِ راست آفتابِ نبوّت کی تجلیوں سے اکتسابِ فیض کیا تھا، بالواسطہ نبوّت کا جو فیضان پہنچتا ہے اس کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے انعام یافتہ لوگوں کے نقوشِ قدم پر چلنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ نِرا علم ہادی بن سکتا تو انعام یافتہ لوگوں کی راہ تلاش کرنے کی تاکید کی ضرورت نہ تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب لشکر کی ترتیب کے وقت ایک پرندے کو مفقود پایا۔ تو وہ سخت برہم ہوئے۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا بات ہے، ہُدہُد نظر نہیں آتا۔ کسی معقول وجہ کے

بغیر وہ غیر حاضر ہوا تو میں اسے سخت سزا دوں گا۔ یا اُسے ذبح کر ڈالوں گا۔

ہُدہُد نے حاضر ہو کر جب ایک ملک کی خبر دی جہاں کی حکمران ایک بُت پرست خاتون تھی جسے بلقیس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تو سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے نام ایک خط لکھا جو خدا تعالےٰ کی حمد و ثنا پر مشتمل تھا۔ اور اس میں یہ بھی مذکور تھا کہ مجھ پر تفوّق ظاہر کئے بغیر مطیع و منقاد بن کر حاضر ہو جاؤ۔ بلقیس کی خواب گاہ جو ہر طرح سے مامون و محفوظ تھی، اور جہاں کسی کا گذر ممکن نہ تھا۔ وہاں جب اسے سلیمان علیہ السلام کا خط پڑا ملا۔ تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنے اراکینِ سلطنت کو جمع کر کے اس واقعہ کی اطلاع دی اور اس باب میں ان کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ محل کے راستے مسدود ہونے کے باوجود خط کا خواب گاہ میں پہنچ جانا۔ اور ایسے ماحول میں جہاں خدا کے نام سے کوئی شناسا نہ تھا۔ خدا کے نبی کے پیغام کا جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سب حیران رہ گئے اور ناچار مطیع بن کر سلیمان علیہ السلام کی طرف روانہ ہو گئے۔ خدا کے نبی کو جب بلقیس کی آمد کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے حاضرینِ مجلس سے کہا کہ تم میں سے بلقیس کا تخت کون لا سکتا ہے! عفریت بولا کہ میں آپ کے اجلاس کے ختم ہونے تک لے آؤں گا۔

لیکن حالات کے تقاضے کے مطابق سلیمان علیہ السلام کو یہ تخت جلد مطلوب تھا چنانچہ ایک اور شخص جسے خدا نے اپنے خصوصی علم سے نوازا تھا۔ وہ بولا کہ میں پلک جھپکنے سے اندر تخت لے آؤں گا۔ چنانچہ وہ اُسی وقت لے آیا۔ سلیمان علیہ السلام کی نظر اُٹھی تو تخت سامنے موجود تھا۔ وہ اُسے سامنے موجود دیکھ کر خدا کی حمد و ثنا میں مصروف ہو گئے۔ ان کی یہ حمد و ثنا اس لئے تھی کہ خدا نے میری محفل میں بیٹھنے والوں کو ایسی قوتوں سے نوازا ہے کہ وہ طرفۃ العین میں بعید مسافت سے تخت لانے کی قوت و طاقت رکھتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام چاہتے تو یہ تخت خود بھی لا سکتے تھے کیونکہ نبی کی روحانی قوتیں اُمتی کی روحانی قوتوں سے زیادہ قوی اور مضبوط ہوتی ہیں۔ لیکن انہوں نے خود تخت لانے کی بجائے اُمتیوں

کی طرف رجوع کیا۔ انہیں تخت لانے کے لئے کہا کیوں کہ سلیمان علیہ السلام خود تخت لے آتے تو اُن کے پاس بیٹھنے والوں کی قوت و طاقت کا اندازہ کیسے ہوتا؟

سلیمان علیہ السلام کی قوتیں مسلّم تھیں۔ لیکن اب وہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کی قوت و طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے تاکہ دنیا کو معلوم ہوسکے کہ نبی خود ہی ناممکن کو ممکن بنا دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس کے مقربین کو بھی غیر معمولی قوتیں بخشی جاتی ہیں۔ ان کا مظاہرہ دیکھ کر صاحبِ اعجاز کی قوتوں کا اندازہ لگانا آسان ہوجاتا ہے۔ یہ تخت کوئی معمولی تخت نہ تھا۔ قرآن اسے عظیم کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ بلقیس کا تخت عظیم سہی لیکن نبی کے مقربین اس سے بھی عظیم تر تھے اُن کی عظمتوں کو آشکار کرنے کے لئے انہیں یہ خدمت سونپی گئی نبی کو اپنی ذات پر قیاس کرنے والے نبی کی عظمتوں ہی سے ناواقف نہیں وہ اس کے پاس بیٹھنے والوں کی عظمتوں سے بھی بے خبر ہیں۔ ملازمانِ بارگاہ کی عظمتیں عالی بارگاہ کی عظمتوں کا آئینہ ہوتی ہیں۔ ان کی عظمتیں دیکھ کر عالی بارگاہ کی عظمتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اسی لئے خدا تعالےٰ کی یہ سُنت ہے کہ وہ اپنے انبیاء کو غیر معمولی قوتوں سے نوازتا ہے تاکہ ان کی عظمتوں کے آئینے کی جھلک میں خدا تعالےٰ کی عظمتوں کی جھلک دیکھی جاسکے! اور انبیاء کے انوار کو سینے میں سمیٹ لینے والوں کی عظمتیں انبیاء کی عظمتوں کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔

انبیاءؑ خدا کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اور انبیاءؑ کی راہ پر چلنے والے اُن کے حسن و جمال کا پرتو، ایک ہی نور کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ کہیں بلا واسطہ اور کہیں بالواسطہ صاحبِ جمال کا حسن خواہ بلاواسطہ آئینے میں جلوہ گر ہو یا ایک آئینے کے توسّل سے دوسرے آئینے میں منعکس ہوجائے وہ اسی کا حسن کہلاتا ہے۔ آئینوں کی تفریق کے باعث نور میں تفریق نہیں ہوسکتی۔ آئینوں کی تفریق کے باوصف نور کی وحدت قائم رہے گی۔ وہ تقسیم ہوجانے والی چیز نہیں۔ تقسیم تو کثیف میں ہوتی ہے، لطیف میں کیسی تقسیم؟ وہ ازل سے ایک

ہے، واحد ہے، لاشریک ہے، تقسیم کا عمل اس پر کیسے جاری و ساری ہو سکتا ہے۔ آئینے جب ہٹیں گے اسی کی یکتائی نظر آنے لگے گی۔ کثرت، احدیت میں گم ہو کر رہ جائے گی۔

یوسفؑ اور بھائی

یعقوبؑ کے بیٹے جب غلّہ لینے کے لئے مصر گئے تو انہیں معلوم نہ تھا کہ ان سے باتیں کرنے والا نقاب پوش اُن ہی کا بھائی یوسفؑ ہے جسے انہوں نے باپ کی آغوش سے کھینچ کر کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ اور جب وہ کرشمۂ قدرت کے باعث کنوئیں سے نکل آیا تو اسے کاروان میں بیچ دیا۔ لیکن یوسفؑ بھائیوں کو پہچانتے تھے اُن کے مظالم بھی انہیں یاد تھے باایں ہمہ انہوں نے بھائیوں سے اچھا سلوک کیا۔ اس وقت انہیں اپنے چھوٹے بھائی بنیامین کی یاد آئی۔ انہوں نے بھائیوں سے کہا کہ وہ دوبارہ مصر آئیں تو بنیامین کو ساتھ لیتے آئیں۔ یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی ملاقات ابھی خدا کو منظور نہ تھی۔ اسی لئے مشیّت کے رازدار نے اس باب میں زبان کو جنبش نہ دی۔ قحط کی ہولناکیوں نے بچھڑے ہوئے بھائیوں کو ملا دیا۔ یوسف علیہ السلام کے سامنے اُن کے بھائیوں کی احتیاج ظاہر کر دی اور جب وہ دوبارہ غلّہ لینے کے لئے آئے تو اُن کے ساتھ اُن کا بھائی بنیامین بھی تھا۔

برادرانِ یوسفؑ کی آمد بنیامین کی آمد کا پیش خیمہ تھی۔ بنیامین آ گئے تو یعقوبؑ کے آنے کے لئے راہ کھل گئی۔ یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی ملاقات کا ذریعہ بنیامین بنے اس لئے کہ وہ معصوم تھے اُن سے کوئی خطا سرزد نہ ہوئی تھی۔ جمالِ یوسفی بھی سب سے پہلے اُن ہی کو نظر آیا۔ اس لئے کہ اُن کے پاس عفّت و عصمت کی پونجی تھی۔ برادرانِ یوسفؑ نے جب اُون اور پنیر کی پونجی پیش کر کے اپنی بے بضاعتی کا ذکر کیا۔ تو یوسف علیہ السلام کو رحم آ گیا۔ اُن کی نگاہوں کے سامنے اپنے گھر کی غربت کا نقشہ گھومنے لگا۔ اُون اور پنیر کو دیکھ کر یوسف علیہ السلام کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ کہ بوڑھا باپ ضعیفی کے

ایام کس عسرت میں کاٹ رہا ہے۔ اور یوں بھی یہ گھر کی پہلی نشانی تھی جو یوسفؑ کے گھر سے جدا ہونے کے بعد ان کے پاس لائی گئی تھی۔ اس میں کتنا درد و کرب تھا! اللہ تعالےٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ گھر کی ان چیزوں کو دیکھ کر یوسف علیہ السلام کے حساس قلب پر کیا گذری ہو۔ وہ مصر کے تخت و تاج کے مالک بن چکے تھے۔ لیکن گھر کا نقشہ وہی تھا۔ بدستور غربت سایہ فگن تھی۔ قومی سرمایہ اپنے خاندان پر صرف ہونے کی بجائے تعمیری کاموں پر صرف ہو رہا تھا۔ بھائیوں کو غلہ دینے کے بعد یوسف علیہ السلام بنیامین کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے یہ تدبیر کی کہ اس کے غلہ میں ناپ تول کا پیمانہ چھپا دیا اور جب پیمانہ نکل آیا تو اسے روک لیا گیا۔ یہ تجویز خود برادرانِ یوسفؑ نے پیش کی تھی۔ کہ جس کے پاس سے مال مسروقہ برآمد ہو اسے یہیں روک لیا جائے۔ یوسف علیہ السلام نے ان ہی سے پوچھا تھا کہ جس کے پاس مال پایا جائے اسے کیا سزا دی جائے؟ وہ جانتے تھے کہ بھائی یہی فتویٰ دیں گے کہ اسے سال بھر کے لئے غلام بنا لیا جائے۔ یعقوب علیہ السلام کے دین میں یہی دستور تھا۔ مصریوں میں یہ قاعدہ مروّج نہ تھا۔ ایک اعلان کے ذریعے قافلے والوں کو تو چور کہا گیا لیکن بنیامین کے متعلق ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی۔ اس لئے کہ بھائیوں نے یوسفؑ کو یعقوب علیہ السلام کے پاس سے لے جا کر فروخت کر دیا تھا۔ بنیامین نے ایسی کوئی بات نہ کی تھی۔ اس پر چور کا اطلاق درست نہ تھا۔ یوسف علیہ السلام نے جو تدبیر کی تھی اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ بھائیوں کے دل میں یوسف علیہ السلام کی جو نفرت چھپی ہوئی تھی وہ ابھر کر سامنے آگئی۔ وہ کہنے لگے کہ یہی چور نہیں اس کا بھائی بھی چور تھا۔ ایک دفعہ اس نے بھی چوری کی تھی۔ یوسفؑ پر الزام تراشی ہونے لگی۔ تو انہیں بھی کچھ کہنے ضرورت محسوس ہوئی۔ برادرانِ یوسف علیہ السلام جس واقعہ کی نشاندہی کر رہے تھے۔ اس کی حقیقت بس اتنی تھی کہ بچپن میں انہیں پھوپھی لے گئی اور جب یوسف علیہ السلام کو لوٹانے کا وقت آیا تو انہوں نے

ان کی کمر سے کپڑا باندھ دیا۔ تاکہ انہیں اپنے پاس ٹھہرانے کیلئے جواز نکل آئے۔ اور شائد یوسف علیہ السلام کے مقدر میں یہی لکھا تھا۔ کہ ہوش سنبھالتے ہی الزام کا مورد بنیں کنوئیں میں گریں، کارواں میں بکیں، مصر میں فروخت ہوں، محفل میں الزام لگے۔ قید میں رہیں۔ اور آخر کار تخت و تاج ملے۔ گو بنیامین کے غلہ میں پیالہ حضرت یوسف علیہ السلام نے رکھا تھا۔ لیکن رب تعالےٰ نے فرمایا کہ یہ تدبیر ہماری ہے یوسفؑ تو ہماری مشیّت کے آئینہ ہیں ہمارا جو مقصود تھا۔ وہ ہم نے یوسف علیہ السلام کے ذریعے پورا کیا۔ ورنہ یوسفؑ کا دامن ہر طرح سے پاک ہے:

عزیز مصر کے ایوان میں یوسف علیہ السلام کی ذات پر حملہ ہوا تو انہیں بچایا اور ایک معصوم سے اُن کی پاکیزگی کی گواہی دلوائی۔ بات تو صرف پیالے کی تھی۔ لیکن یوسف علیہ السلام کی عصمت نے رب تعالےٰ کی رحمت کو متحرک کر دیا۔ رحمت بول پڑی، وحی بن کر اُتر آئی۔ کہ یوسف علیہ السلام کے دامن پر شکوک و شبہات کا کوئی چھینٹا نہ پڑنے پائے! یہی وہ مقام ہے جہاں ایک نبی غیر نبی سے ممیز و ممتاز ہوتا ہے۔ نبی کی عصمت کا محافظ و نگراں خدا تعالیٰ ہوتا ہے۔ نبی سے گناہ کا ارتکاب ممکن نہیں! خواہ وہ کتنا بھی معمولی کیوں نہ ہو قبلِ نبوت اور بعدِ نبوت وہ خدا کی پناہ میں ہوتا ہے، قبلِ نبوت کا زمانہ نبی کی تربیت کا زمانہ ہوتا ہے۔ جس میں اُسے نبوت کے فرائض کی انجام دہی کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور یہ تربیت اُسے درس گاہِ لم یزلی میں دی جاتی ہے تاکہ اس پر کسی کا تفوق ثابت نہ ہو سکے۔ "علوم و فنون سیکھ کر آنے والے نبی کے مثیل و مماثل نہیں ہو سکتے اس لئے کہ اُن کا علم کسبی ہوتا ہے۔ اور نبوت خود کسبی نہیں۔ اس کے علوم کیسے کسبی ہو سکتے ہیں! ہر مقنّن یہی چاہتا ہے کہ اس کے قانون کا احترام کیا جائے۔ قانون کی فضیلت اور برتری ثابت کرنے کے لئے وہ قانون کی خود بھی پابندی کرتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اپنے بنائے ہوئے قانون کے سامنے وہ خود بھی عاجز ہوتا ہے، اب اسے کسی طرح کا

اختیار نہیں رہا۔ قانون اعلیٰ اور برتر ذات کی برتری کے اظہار کے لئے ہوتا ہے۔ اُسے بے لبس ثابت کرنے کے لئے نہیں۔ کبھی اعلیٰ ذات اپنے فیصلوں کو بدل کر نئے فیصلے نافذ کر دیتی ہے۔ تاکہ اُس کی قدرت ظاہر ہو۔ اور کبھی عوام کے لئے بنائے ہوئے قوانین سے خود کو مستثنیٰ کر لیتی ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ ذی اختیار ہے مجبور نہیں۔ رُب تعالےٰ کی سنت بھی یہی ہے۔ کبھی وہ خوارق کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ قاعدے اور قانون کے مطابق انسانی سعی و کوشش کا جو نتیجہ نکلنا چاہیئے تھا۔ اس کے خلاف ظہور میں آتا ہے جسے دیکھ کر انسان پکار اُٹھتا ہے کہ یہ رب تعالےٰ کی شان ہے۔ رب کی قدرت ہے۔ قدرت کا اظہار اصول و قواعد کے ذریعے ہی نہیں ہوتا۔ نئی شان اور نیا جلوہ بھی حیران و ششدر بنا دیتا ہے۔ بنیامین کے غلے میں پیالہ رکھ کر نکال لینا بھی قدرت کے اظہار کی ایک صورت تھی۔ یوسف علیہ السلام تو محض اظہار کا ذریعہ تھے۔ کنوئیں میں بھی، کارواں میں بھی۔ مصر کے بازار میں بھی، عزیز مصر کے ایوان میں اور قید خانے میں بھی تخت و تاج کے مالک بن جانے کے بعد بھی یوسف علیہ السلام قدرتوں کے اظہار کا ذریعہ تھے۔ مصری خاتون کے محبوب بنے، تو پھر بھی خدا تعالےٰ کی قدرتیں آشکار تھیں۔ اب پیالہ لایا گیا۔ تو پھر بھی اُنہی کو قدرتوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا گیا۔ یوسف علیہ السلام سے مل کر اُن کے ماں باپ اور بھائیوں نے جو پہلا کام کیا۔ وہ یہ تھا کہ اُن کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ یہ یوسف علیہ السلام کی عظمت کا اعتراف تھا۔ یوسفؑ بولے کہ اباجان یہ میرے اُس خواب کی تعبیر ہے جو مجھے بچپن میں دکھایا گیا تھا۔ چاند، سورج اور گیارہ ستارے انہوں نے اپنے سامنے سجدہ ریز دیکھے تھے لیکن یہ خواب بڑی مدت میں پورا ہوا۔ اب تو اُن کی جوانی بھی بیت چکی تھی۔ نبوت کی ابتداء ہو یا نبی کی زندگی کی ابتداء، اس میں آنے والا خواب غلط نہیں ہوتا۔ یہ خواب نبوت کا پیش خیمہ نہ تھا۔ اُن کی ابتدائی زندگی کا واقعہ تھا۔ نبی کی ابتدائی زندگی اور اُس کی نبوت میں گہرا ربط اور تعلق ہوتا ہے

ابتداء میں جس نور کا عکس خواب و خیال بن کر ظاہر ہوتا ہے انجام کار وہی ایک حقیقت بن جاتا ہے۔

یوسف علیہ السلام کی داستانِ مصائب کوئی مختصر نہ تھی۔ یہ طویل بھی تھی اور جاں گداز بھی۔ انہوں نے باپ سے مل کر یہ دکھڑا بیان نہیں کیا۔ کہا تو صرف یہ کہ میرے رب نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے قید خانے سے نکال لیا یوں وہ اپنے قید ہونے کا ذکر بھی کر گئے لیکن اسے بھی "احسان" کے الفاظ سے تعبیر کیا۔ بھائیوں کے مظالم کی طرف اشارہ کیا تو وہ بھی انتہائی بلیغ۔ کہا تو صرف یہی کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان تفرقہ ڈال دی تھی اور پھر مشیت کا پابند خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف ہو گیا۔

عزیر علیہ السلام

حضرت عزیر علیہ السلام کا قصہ گو قرآن میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے لیکن وہ جامع حکمتوں کا غماز کہلاتا ہے۔ خدا کے یہ مقدس نبی جب ایک ویران شہر کے قریب سے گذرے تو وہ اس کی ویرانیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ شہر بیت المقدس کا شہر تھا جسے امتدادِ زمانہ نے پیوند خاک بنا دیا تھا۔ اس کی ہری بھری رونقیں قصۂ ماضی بن چکی تھیں۔ اس کے جگمگاتے ہوئے قصر و ایوان کا کوئی نشان باقی نہ تھا۔ بنی اسرائیل جو اس شہر کے باسی تھے جنہوں نے اس شہر کو رونقیں عطا کی تھیں۔ اس کے قصر و ایوان کو سجایا تھا۔ اس کے ویرانوں کو باغ و بوستان میں تبدیل کیا تھا۔ اور اس کی فضاؤں کو نئی رعنائی عطا کی تھی۔ ایک ظالم و جابر بادشاہ کے اسیر بن کر صعوبت کی زندگی گذار رہے تھے۔ اور بخت نصر بادشاہ کی نحوست شہر کو ویرانے میں تبدیل کر چکی تھی۔ مقدس نبی کی آنکھوں نے جب یہ دل خراش منظر دیکھا تو وہ سوچنے لگے کہ یہ شہر اب کیسے آباد ہو سکتا ہے۔ اس کی عظمتیں کیسے لوٹ سکتی ہیں؟ خدا تعالیٰ نے یہیں عزیر علیہ السلام کی روح قبض کر لی۔ جب

انہیں دوبارہ حیات بخشی گئی تو ان سے سوال کیا گیا کہ آپ یہاں کتنی دیر رہے ہیں! عزیر علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرے قیام کی مدت ایک دن یا اس سے کچھ زیادہ ہوگی۔ خدا تعالےٰ نے فرمایا کہ تمہیں ایک صدی گزر جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد ارشاد ہوا کہ اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو وہ اصلی حالت میں موجود ہیں اُن پر زمانے کے تغیرات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ خورد و نوش کی چیزوں کو اصلی حالت میں دکھانے کے بعد فرمایا کہ اپنی سواری کے گدھے پر بھی نظر ڈال لو۔ عزیر علیہ السلام کی نظر اٹھی تو انہیں ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ نظر آیا۔ یہ اُن کے گدھے کا ڈھانچہ تھا۔ جس کا گوشت پوست فنا ہو چکا تھا۔ پھر ارشاد ہوا کہ دیکھو ہم ان سوکھی ہڈیوں کو کیسے گوشت پوست کا لباس پہناتے ہیں۔ دوبارہ زندگی بخشتے ہیں۔ یہ سب کچھ حضرت عزیر علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ گدھے کو حیاتِ نو ملی۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ دوبارہ زندگی عطا کرنا ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں۔ ہم کھانے پینے کی چیزوں کو تغیرات سے محفوظ بھی رکھ سکتے ہیں۔ اور مرورِ زمانہ سے بدلی ہوئی چیزوں کو بھی اپنی اصلی حالت پہ لانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ مقدس نبیؑ کو یہ جو مشاہدہ کرایا گیا۔ یہ بے سود نہ تھا۔ بلکہ اس کے توسّل سے دوسروں پر بھی اپنی حکمت و قدرت کا واضح کرنا مقصود تھا۔ تاکہ وہ اپنے خالق و مالک کی عظمتوں کو پہچان سکیں۔ یہ خطرہ اُن کے قریب نہ گذر سکے کہ وہ گذری ہوئی بہاروں کو واپس لانے پر قادر نہیں۔ بستی خواہ دل کی ہو یا چھیڑے ہوئے دیار کی، وہ اُجڑنے کے بعد اس کی قدرت کے ہلکے سے کرشمہ کے ساتھ دوبارہ آباد اور زندگی کی شاہیوں کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اُجڑنے کے بعد اپنے رب سے دوبارہ زندگی کی توقع سے دل محروم نہیں ہونا چاہیئے۔ ہر دم آس بندھی رہے تو ابرِ کرم کے برسنے کے امکانات موجود ہوتے ہیں بلکہ امید ہی ابرِ کرم کو دعوتِ خرام دینے کا موجب ثابت ہوتی ہے بہار و خزاں کے مناظر اسی حکمتِ بالغہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

حضرت عزیر علیہ السلام کو دوبارہ زندگی عطا فرمانے کے بعد یہ جو پوچھا گیا کہ تم کتنی مدت پڑے رہے؟ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے، کہ مرنے کے بعد ان کے حواس موجود رہتے ہیں۔ حواس نہ ہوتے تو حضرت عزیر علیہ السلام سے اُن کی موت کی مدت کے متعلق سوال نہ کیا جاتا۔ یہ سوال اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے کہ اُن کے حواس موجود ہوں۔ رہ گیا یہ سوال کہ عزیر علیہ السلام نے ایک صدی کی مدت کو نہایت قلیل مدت ظاہر کیا تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں لُبا اوقات کسی خاص امر میں منہمک ہونے کے باعث کثیر مدت کو قلیل سمجھ لیتے ہیں۔ ہمیں متوجہ کیا جاتا ہے تو ہمیں وقت گذرنے کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد عزیر علیہ السلام کے حواس موجود نہ ہوتے تو وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ یا رب! موت کے بعد تو میرے حواس ختم ہو چکے تھے مجھ سے مدت کے متعلق کیوں سوال کیا گیا۔ مشاہدہ جتنا قوی ہوگا وقت کا احساس بھی اسی نسبت سے کم ہوگا مقربین کو مشاہدے کے وقت نہ یہاں وقت کا احساس ہوتا ہے نہ وہاں ہوگا۔ وقت تو آنی جانی چیز ہے۔ سیارگان کی گردش سے اس کا تعین ہوتا ہے جہاں سیارگان کی رفتار نہ ہوگی بلکہ جمال کا آفتاب طلوع ہوگا وہاں وقت کا تصور بھی ممکن نہ ہوگا۔"

عالمِ ارواح

قرآنِ حکیم میں دو میثاق کا ذکر ہے۔ ایک عہد انبیاء علیہم السلام کی مقدس جماعت سے لیا گیا تھا۔ اور ایک تمام نوعِ انسانی سے، نوعِ انسانی کے عہد میں انبیاء علیہم السلام بھی شریک تھے۔ لیکن نبیوں کا میثاق اُن کی ذات سے مخصوص تھا۔ اس کی حیثیت بالکل جُداگانہ تھی۔ تخلیقِ کائنات سے بہت پہلے جبکہ ارواح کی تخلیق ہوئی۔ تو عالم رُوحوں کو مخاطب کرکے پوچھا گیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں؟ یہ سوال بالکل نیا تھا چنانچہ ارواح کو اس کا جواب دینے کے لئے رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسی لئے

روحِ اعظم بول پڑی۔ بلیٰ اے بے شک تو ہمارا رب ہے۔ عالمِ ارواح میں حضورؐ کی رہنمائی کام آئی۔ پاک روحیں ربوبیت کا اقرار کرنے لگیں۔ پہلے انبیاء نے حضورؐ کی متابعت میں بلیٰ کہا اور پھر صدیقین، شہداء اور صالحین نے، اس اقرار کے بھی مختلف مقامات و درجات تھے۔ بعض جگہ بلیٰ میں روحِ عبدیت کھنچ کر آ گئی۔ عبودیت کی داستان کا عنوان بڑا مختصر تھا۔ لیکن اس میں بلا کی جاذبیت وکشش تھی۔ کہنے والے بھی مسرور تھے اور سننے والا بھی مسرور، لیکن بعض جگہ یہ اقرار بڑا بے کیف اور بے مزا تھا۔ یہ اُن لوگوں کا اقرار تھا۔ جن کی زبان اور قلب میں ہم آہنگی نہ تھی۔ زبان اقرار کر رہی تھی اور دل منکر تھا۔ دنیا میں آکر یہی لوگ منافقین کہلائے۔ کفّار نے اقرار ہی نہیں کیا۔ اسی لئے وہ زندگی بھر عبودیت کی لذت سے ناآشنا رہے۔ عبودیت کی لذت کے بھی مختلف درجات ہیں۔ جو اُس وقت نشہ میں تھے وہ اب بھی نشہ میں ہیں۔ جن کی روحوں نے سازِ الست کے تاروں سے نکلنے والی پہلی آواز سُن کر بلیٰ کہنے کے ساتھ سجدہ بھی کیا تھا وہ اب عابد ہیں، ندا کے سوز پر مٹنے والی روحوں کو اب بھی چین نہیں۔ وہ اسی وقت سکون پذیر ہوں گی جب پردہ اُٹھے گا اور جمال نظر آئے گا!

انبیاء کا میثاق، عوام کے میثاق کی طرح اقرارِ ربوبیت تک ہی محدود نہ تھا۔ اُن سے یہ عہد بھی لیا گیا تھا کہ وہ فرائضِ نبوت کی تکمیل میں کوتاہی نہ برتیں گے۔ اپنے فرائض کو پوری طرح انجام دیں گے۔ ابلاغ وتنذیر کے اس عہد میں حضور علیہ السلام بھی جملہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ لیکن ایک عہد انبیاء علیہم السلام سے حضورؐ کی نبوت و رسالت کے سلسلہ میں لیا گیا۔ اس عہد میں کہا گیا کہ اگر میں تمہیں کتاب و حکمت دوں اور پھر میرا رسولؐ آ جائے تو اس پر ایمان لانا اس کی تصدیق کرنا۔ پھر انبیاء علیہم السلام سے یہ بھی پوچھا گیا کہ کیا تم نے اقرار کر لیا؟ انہوں نے اقرار کیا۔ تو ارشاد ہوا کہ گواہ رہنا۔ میں بھی تمہارے ساتھ شاہدین میں سے ہوں۔ جو اسلوب

اس عہد میں نظر آتا ہے وہ پہلے دونوں عہدوں میں نہیں: اپنی ربوبیت کا عہد لیتے وقت بھی کسی تحدید و تخویف کی جلوہ نمائی نہیں کی گئی۔ فرائضِ نبوت کی انجام وہی کا عہد لیا گیا تو پھر بھی کوئی غیر معمولی تاثر ظاہر نہیں کیا۔ لیکن حضورؐ کی نبوت کی تصدیق کا عہد لیتے وقت ربانی تیور کتنے خطرناک ہیں۔ کتنا شدید اہتمام کیا گیا ہے۔ عہد کے اختتام پذیر ہونے کے بعد یہ بھی فرمایا گیا کہ جو اس عہد سے پھر گیا وہ فاسقوں میں سے ہوگا۔ انبیاء کے اپنے رب سے کئے گئے عہد کے توڑنے کا تو کوئی امکان نہ تھا۔ یہ تو صرف آنے والے کی عظمتِ شان کا اظہار تھا۔ جو جلال و جمال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جلال کی نمود کبھی جمال کے اظہار کے لئے ہوتی ہے تاکہ جمال کی اہمیت واضح ہو جائے، یہ بتا دیا جائے کہ جلال اپنی پوری قوت کے ساتھ جمال کی عظمت کا نگہبان ہے، انبیاء علیہم السلام کی ارواح کے ساتھ روزِ میثاق خدائے وحدہٗ لاشریک کا جو مکالمہ ہوا۔ اس کی تفصیل قرآن حکیم میں بلا سبب بیان نہیں ہوئی۔ تفصیل و وضاحت کے ذریعے یہ بتانا مقصود تھا کہ انبیاءؑ و رسلؑ کو غیر مشروط طور پر کتاب و حکمت کی دولت عطا نہیں کی گئی بلکہ نبوت اور کتاب و حکمت کی یہ دولت انبیاء کی جماعت کے بعد تشریف لانے والی ذات قدسی صفات پر ایمان لانے اور اُن کی تصدیق کرنے کا ثمر تھی۔ یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ وہ ذاتِ گرامی نبی آخرالزمان ہوگی۔ انبیاء علیہ السلام اپنا اپنا زمانہ گزار لیں گے تو وہ ذاتِ قدسی صفاتؐ تشریف لائے گی۔ اس مفہوم کو لفظ "پھر" کے ساتھ ادا کیا گیا۔ "پھر آنے والا" بعد کے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ گویا انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ کا آغاز بھی حضورؐ کے ذکر، حضورؐ کی یاد اور حضورؐ کی بعثت کے تذکرے کے ساتھ ہوا۔ اور اس سلسلہ کو ختم کرنے والی بھی حضورؐ کی ذات ہے۔ قدرت کے ایوان میں حضورؐ کا ذکر چھڑا، رسالت کی بات ہوئی۔ تو محبوبؐ کے ذکرِ جمیل کو عنوانِ کلام بنا کر گفتگو کی گئی۔ بات چیت کا محور و مرکز حضورؐ کی ذات تھی۔ رب ذاکر تھا۔ اور حضورؐ مذکور۔ انبیاء علیہم السلام

پر یہ واضح کیا گیا کہ حضورؐ کی نبوت اصل ہے اور اُن کی نبوت فرع، اصل کا رشتہ پڑھی لا فتوں اور ترکتوں کا غماز ہوتا ہے۔ فرع کا وجود اصل پر موقوف ہوتا ہے اور اصل ہی فرع کو زندگی اور تابندگی عطا کرتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا ہر کمال حضورؐ کا کمال ہے۔ کرن کا وجود ذاتی نہیں ہوتا۔ بلکہ سورج کا فیضان جمال ہوتا ہے۔ کرنیں سورج سے نور اخذ کرتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی ارواح حضورؐ کے نور سے سیراب ہیں"

روزِ میثاق کی روداد دیکھنے کے بعد یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی روحوں سے حضورؐ علیہ السلام کی تصدیق کا عہد گیا۔ تو وہ نبوت کے منصب کے حق دار قرار پائے۔ اور اس شرط پر انہیں کتاب و حکمت کی نعمت دینے کا اعلان کیا گیا۔ حضورؐ کی ذات اور صفات کی تصدیق انبیاء علیہم السلام کے لئے حصولِ انعامات کا ذریعہ بن گئی۔ انبیاء علیہم السلام کی روحوں نے تصدیقِ محمدیؐ کو از خود وسیلہ اور ذریعہ نہ بنایا۔ بلکہ اُن سے کہا گیا تھا کہ تصدیق کا عہد کرو۔ گویا نبوت، کتاب اور حکمت جیسے عظیم تر انعامات ربانیہ کے حصول کے لئے ذاتِ قدسی صفاتؐ کی تصدیق کا توسل ناگزیر تھا۔ اس کے بغیر منعم، نعمت بانٹنے کے لئے تیار نہ تھا۔ بات اس وقت پختہ ہوئی۔ جب اُن سے تصدیق کا عہد لے لیا گیا۔ انبیاء علیہم السلام کی ارواح شاہد بن گئیں۔ تو پھر بھی ربانی ذوق آسودہ نہ ہوا۔ ارشاد ہوا کہ یہ بات بھولنے نہ پائے۔ آنے والے رسولؐ کی تصدیق کے سلسلے میں میرے اور تمہارے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اس کا شاہد میں بھی ہوں۔ معاہدے کی اہمیت و عظمت کا اندازہ گواہوں...... کی عظمت سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ گواہ عظیم ہوں تو معاہدہ بھی معمولی نہیں ہوتا۔ یہاں بھی یہی بات تھی کہ معاہدے کو اور وقیع اور جاندار بنانے کے لئے اپنا نام بھی گواہوں کی فہرست میں شامل کر دیا۔ تیور بتا رہے ہیں کہ ربانی ذوق کیسی انگڑائی لے رہا تھا۔ ذوق پر کیف و سرور کا کیا عالم طاری تھا۔ ایسں بھی منعم کی یہ پہلی نعمت تھی جو وہ نبوت، کتاب اور حکمت کی صورت میں بانٹنے کے عزم کا اظہار

کر رہا تھا۔

بعثت پہلی ہے اور محبوب یاد نہ آئے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ ایسے موقعوں پر تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کہ جو کچھ بٹ رہا ہے یہ محبوب ہی کا صدقہ ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ میثاق میں بھی نظر آرہا ہے۔ بلا وجہ تو داستان کو طول نہیں دیا گیا، کیسے کیسے عنوانات قائم کئے گئے؟ کیا کیا اسلوب بدلے گئے۔

گرامی مہمان کے آنے کے وقت ہی خاص التزام نہیں برتا جاتا۔ بلکہ پہلے سے ایسے انتظامات شروع کر دیئے جاتے ہیں جو شوق کے غماز اور مہمان کی عظمتِ شان کے آئینہ دار ہوں؛ میثاق کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ بزم سجائی گئی۔ آمد کا اعلان کیا گیا۔ بعثت کی بشارت دی گئی۔ اور اپنے تعلق خاطر کے اظہار کے لئے مختلف اسالیب بیان اختیار کیے گئے، پھر اس محفل ذکر کی ساری روداد کو وحی بنا کر نازل کیا گیا۔ یہ قرآن کا حصہ بن گئی۔ سب کے کانوں تک پہنچی، بات تو خلوت کی تھی۔ اسے یوں پھیلایا گیا؟ بظاہر یہ ایک ایسے جلسے کی روداد ہے جو میثاق کی خلوتوں میں منعقد ہوا تھا۔ جس کی صدارت رب تعالیٰ نے کی اور جس میں انبیاء علیہم السلام کی روحیں شریک تھیں۔ اس میں نہ امر ہے نہ نہی، نہ جائز و ناجائز اور حلال و حرام کا بیان اور نہ کوئی ایسا مسئلہ جو انسانی حیات کے کسی پہلو سے تعلق رکھتا ہو۔ مگر با ایں ہمہ روداد کا انداز بڑا دلکش ہے جسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ربانی ذوق کی تصویر ہے۔ اس آئینہ میں میثاق کے خدوخال ہی نظر نہیں آتے میثاق کا جذبہ، میثاق کا ذوق و شوق اور میثاق کا جلال و جمال بھی واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ جو تصویر وحی نے میثاق کی کھینچی ہے وہ دل نواز بھی ہے اور جاں فروز بھی! بعض تصاویر، محض جاں فروزی اور جاں نوازی کے لئے ہوتی ہیں۔ اُن کی دید خواہ، مادی نقطۂ نگاہ سے مفید نہ ہو۔ لیکن روح میں تازگی مزدہ پیدا کر دیتی ہے۔ میثاق کی تصویر کا بھی یہی عالم ہے وہ جاں فروزی اور جاں نوازی کے لئے ہے۔ اسے دیکھ کر ایمان

تازہ ہو جاتا ہے۔

ازل میں حضور علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کے صلہ میں انبیاءؑ کو کتاب و حکمت دینے کی بشارت دی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی طرح حکمت بھی نعمت ہے۔ حکمت بھی رب تعالےٰ کی بارگاہ سے نازل ہونے والی چیز ہے، یہ بھی کتاب کی طرح نبیؑ کے قلب پر نازل ہوتی ہے، نبیؑ کتاب کا معلم بھی ہوتا ہے اور حکمت کا بھی، کتاب، الفاظ و حروف پر مشتمل ہوتی ہے، اور حکمت میں الفاظ نہیں ہوتے، وہ ایک ایسی صلاحیت ہے، جو نبیؑ کے قلب میں پیدا کر دی جاتی ہے، پھر کتاب ہر نبیؑ پر نازل نہیں ہوتی، اور حکمت ہر ایک کو ملتی ہے قطع نظر اس کے کہ وہ صاحبِ کتاب ہو یا نہ ہو، نبیؑ کے پاس مستقل کتاب نہ بھی ہو تو مستقل حکمت ضرور ہو گی۔ اس کے بغیر کارِ دبارِ نبوت انجام نہیں پا سکتے نبیؑ کتاب بھی منتقل کرتا ہے، احکامِ الٰہیہ کی نشر و اشاعت بھی اس کا مقصدِ حیات ہوتی ہے اور حکمت کی ترویج بھی اس کے فرائضِ حیات میں داخل ہے۔ نبیؑ سے کتاب وصول کرنے کے بعد اس کی لائی ہوئی حکمت سے آنکھیں بند کر لینا اور اس کی ضرورت کو محسوس نہ کرنا کمال درجہ کی بے دانشی ہے، کتاب کے الفاظ تو نبیؑ کی زبان سے کافر بھی سن سکتا ہے۔ لیکن حکمت اُسے نصیب نہیں ہو سکتی۔ حکمت مقرّبین کو ملتی ہے اور اُن ہی کے ذریعے دوسروں تک منتقل ہوتی ہے۔ نبوت کا جتنا قرب نصیب ہو گا۔ حکمت اسی قدر فزوں ملے گی۔ اُمت کے جن بزرگوں نے کتاب و سنّت کے اسرار بیان کئے ہیں۔ اُن پر حکمت کا دروازہ کھلا تھا۔ اور یہ دولت انہیں ذاتِ قدسی صفاتؐ کے روحانی قرب نے عطا کی تھی۔ تجربہ اور مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ بعض لوگ زبان دانی میں کمال حاصل کر لینے کے باوجود زندگی بھر کوئی لطیف بات نہیں کہہ سکتے۔ اور بعض پر حکمت کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ یہ فیضانِ ہوتا ہے جو وابستگانِ درگاہ کو پہنچتا ہے،

نور و ظہور

محدود ذات، محدود راہوں کے لئے سود مند ثابت ہو سکتی ہے، لیکن جہاں سفر طویل ہو، غیر محدود جادے اور غیر محدود راہیں در پیش ہوں۔ وہاں محدود ذات کی رہبری اور پیشوائی کام نہیں دیتی۔ وہاں تو ایسی غیر محدود ذات کا لطف و کرم ہی معین و مددگار ثابت ہو سکتا ہے، جس کی ذات کی طرح اس کا کرم بھی لامتناہی ہو۔ سفر نہ ختم ہونے والا ہو۔ تو کرم کی بھی کوئی انتہا نہ ہو۔ زندگی نفس کی آمد و شد ہی کا نام نہیں۔ تنفس کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد بھی ایک اور زندگی ہے، جسے فنا نہیں، جو لامتناہی ہے جو غیر محدود وسعتیں رکھنے والی کائنات ہے اسے ابدی زندگی کا نام دیا گیا ہے، جو زوال پذیر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ظاہری زندگی کے زوال پذیر ہونے کے بعد اس کا آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ اس ابدی اور باقی رہنے والی زندگی میں اسی ذات کا کرم یاور ہو سکتا ہے جو ہر تغیر سے پاک اور ہر نقص سے بری ہے جن لوگوں کے نزدیک زندگی اسی روز و شب اور ماہ و سال میں بٹی ہوئی ساعتوں کا نام ہے۔ وہ تو اخروی زندگی کے تصور سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ ان کی تگ و دو اس زندگی کو سنوارنے اور اسے بار آور کرنے کے لئے ہو سکتی ہے۔ لیکن آخرت پر ایمان لانے والوں اور اسے اپنے لئے امن و سکون کا گہوارہ سمجھنے والوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس سے آنکھیں بند کر سکیں اور اپنی ساری فطری صلاحیتیں اور امکانی کوششیں اسی زندگی کا چہرہ نکھارنے کے لئے وقف کر دیں۔ دل میں دائمی سکون کی طلب ہو گی۔ تو اسی ذات کی بتائی ہوئی راہوں کو اپنے لئے وسیلۂ ظفر جان کر اختیار کریں گے۔ جو حیّ و قیومؒ ہے ازلی اور ابدی ہے، سرمدی ہے جس کی عظمتوں کا آفتاب تغیرات کے عیوب سے پاک ہے۔ وہ ازل میں بھی ضیا ریز تھا۔ اور ابد میں بھی جلوہ بار ہو گا۔ وہ زوال آشنا نہیں ہو سکتا ، اخروی زندگی کا

سارا نور و ظہور اس کی عطا ہوگی۔ اس کا کرم ہوگا۔ جن لوگوں کے دلوں میں حی و قیوم ذات کے کرم کی طلب ہی پیدا نہ ہو وہ اس کرم کے سزاوار نہ ہوں گے۔

حسان بن ثابتؓ

حسان بن ثابتؓ وہ خوش نصیب انسان ہیں جنہیں دربارِ رسالت میں کھڑے ہو کر مدح سرائی کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ انہوں نے جمال دیکھا ہی نہیں، جمال کی شرح بھی کی ہے۔ جمال کا قصیدہ بھی پڑھا ہے۔ نوازے گئے ہیں۔ انعام پایا ہے۔ ایک انعام تو انہیں ردائے مبارک کی صورت میں ملا یہ جمال کا صدقہ تھا۔ جمال کی عطا تھی جو جمال کی آئینہ دار تھی۔ محبت کی دنیا کی یہ ریت ہے کہ حسن جب خوش ہوتا ہے تو اپنی نشانی عطا کرتا ہے۔ یہ نشانی، سرمایۂ تسکین بھی ہوتی ہے اور محب و محبوب کے تعلق کو بھی واضح کرتی ہے، رسالت کی چادر جو حسانؓ کو ملی وہ حسن کی زکوٰۃ بھی تھی اور عشق کا سرمایہ بھی، اسے بدن سے اتار کر دیا گیا تھا۔ اور دوسرا انعام جو حسانؓ کو ملا وہ رسالت کی دعا تھی جس کے ذریعے انہیں مؤید بروح القدس بنا دیا گیا۔ حسن خوش ہو کر دعا بھی دیتا ہے اس کے بغیر اس کے جذبات کو تسکین نہیں ہوتی۔ دعا کے ذریعے اپنی قلبی کیفیت کا اظہار ہی نہیں کیا جاتا۔ فراقِ ثانی کے جذبات کو بھی تسکین بخش جاتی ہے، عشق کو جب حسن کی دعائیں حاصل ہو جائیں تو وہ بامراد ہوتا ہے۔ فائز المرام کہلاتا ہے۔ کسی اور داد و دہش کی اسے ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لبِ محبوب سے جھڑنے والے دعاؤں کے پھولوں کو عشق دامن میں لے کر رقص کرتا ہے۔ اسے زندگی نصیب ہوتی ہے۔ تیسری نعمت جو حسانؓ کو ملی وہ یہ تھی کہ انہیں منبر پر بٹھایا گیا اور ان سے نعت سنی گئی یہ عظمت بھی شاعر کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی اور صحابیؓ کو حضورؐ نے کبھی منبر پر نہیں بٹھایا۔ یہ عظمت نعت کا صلہ تھی۔ اس میں یہ تلمیح بھی ہے کہ عظمتیں جمال کے ثناگر کا حصہ ہیں، جو ثنا کرے گا

عظمت پائے گا، بلند ہو گا۔ اعلیٰ اور ارفع مقام پر بٹھایا جائے گا۔ کیونکہ ثناخوانی ہی حسانؓ کو منبرِ رسولؐ پر لے گئی تھی۔ یہی عطا کا ذریعہ بنی، اسی نے عظمتیں بخشیں، اور اسی نے رفعتیں عطا کیں۔"

بُو علی سیناؒ

بعض قدیم تذکروں میں شیخ بُو علی سیناؒ اور حضرت ابو سعید ابو الخیرؒ کی ملاقات کا حال ملتا ہے، جو سبق آموز بھی ہے اور بصیرت افروز بھی،

بُو علی سیناؒ کا تعلق فکر و خیال کی دنیا سے تھا۔ وہ زندگی بھر اسرارِ حیات اور رموزِ کائنات کے بیان کرنے میں مصروف رہے اور ابو الخیرؒ کی دنیا میں استدلال کا رنگ نہ تھا۔ ان کی سیدھی سادھی باتیں دل میں اُتر جاتی تھیں۔ اسی لئے بوعلی سیناؒ نے ابو الخیر کی صحبت میں آنے کی ضرورت محسوس کی۔ یہ حقیقت نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں کہ علم و حکمت کے مدعیوں نے ہمیشہ اُن بارگاہوں سے سکون کی آرزو کی ہے جو ذکرِ الٰہی کی بدولت سکون کی قاسم رہی ہیں۔ ذاکرینِ حق نے کبھی دانشوروں کی بارگاہوں کا طواف نہیں کیا۔ بُو علی سیناؒ ابو الخیر کے دروازے پر آئے تھے۔ ابو الخیر اُن سے ملنے نہیں گئے۔ ابو الخیر سے مل کر جب بُو علی سیناؒ جانے لگے۔ تو اُن کا دل سکون کی دولت سے معمور تھا۔ فکر و خیال کی اڑانیں جو انہیں طمانیت عطا نہ کر سکیں۔ وہ ابو الخیر کی صحبت نے بخش دی۔ اب اُن کی آرزو یہ تھی کہ انہیں ابو الخیر کے اس تاثر کا علم ہو سکے جو انہوں نے ایک فلسفی اور دانشور سے مل کر قائم کیا ہے۔ چنانچہ بوعلی نے ایک شخص کو تاکید کر دی۔ کہ میرے جانے کے بعد ابو الخیر میرے متعلق جن تاثرات کا اظہار کریں۔ وہ مجھے لکھ کر بھیج دینا۔ لیکن کافی مدت گزر جانے کے باوجود ابو الخیرؒ نے بُو علی سیناؒ کے متعلق اپنے کسی تاثر کا اظہار نہ کیا۔ آخر ایک دن اُس شخص نے خود سوال کیا کہ آپ کا بوعلیؒ کے متعلق کیا خیال ہے؟ ابو الخیرؒ نے

فرمایا کہ وہ صاحبِ اخلاق نہیں۔ اپنے دوست کی وساطت سے جب بُو علی سینا ؒ کو ابوالخیر کا تاثر معلوم ہوا تو انہوں نے ابوالخیر ؒ کے نام ایک خط لکھا جو اُن کی مضطربانہ کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ بوعلی سینا ؒ نے لکھا۔ کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ میں اخلاق کی حقیقت و ماہیت سے آگاہ نہیں۔ حالاں کہ میں نے اخلاق کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ جن سے اہلِ علم استفادہ کر رہے ہیں۔ ابوالخیر نے جواباً لکھا کہ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم اخلاق نہیں جانتے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ تم صاحبِ اخلاق نہیں۔ جان لینا اور بات ہے اور عمل کرنا اور بات ہے"

محکمات اور متشابہات

قرآن حکیم کی آیات کو تین اقسام پر منقسم کیا گیا ہے ایک محکمات ہیں جو قرآنی اصطلاح میں اصلِ کتاب کے نام سے موسوم ہیں اُن کے ذریعے ربانی احکام کی وضاحت کی گئی ہے، دینی امور کا تعلق اُن ہی سے ہے اور اُن کے سمجھنے میں کوئی اشکال واقع نہیں ہوتا۔ یہ عوام سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک قسم متشابہات کی ہے جو اپنے رب کی قدرتِ کاملہ کی آئینہ دار ہیں۔ اُن کے مفہوم کو بجز ربِّ کریم کے اور کوئی نہیں جانتا۔ رب تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو اُن کے مفہوم سے آگاہ کر دیتا ہے قرآن خود کہتا ہے کہ جو لوگ علم میں راسخ ہیں۔ وہ ان پر ایمان رکھتے ہیں اور کسی ریب و شک میں مبتلا نہیں ہوتے۔ لیکن جن کے دل میں کجی ہوتی ہے وہ اُن ہی کو اپنے فکر و خیال کا موضوع بناتے ہیں۔ تو گویا متشابہات کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ گمراہ انسانوں کے دل کی بیماری کو واضح کر دیتی ہیں۔ صداقت کی راہ سے بھٹکے ہوئے انسانوں کا طبعی رجحان اُن ہی آیات کی طرف ہوتا ہے، تیسری قسم مقطعات کی ہے جن کا تعلق حضور علیہ السلام کی ذاتِ گرامی سے ہے، ذاتِ قدسی صفات ہی اِن کی مراد کو جانتی ہے جبرئیلِ امین علیہ السلام کو بھی اُن سے آگاہی نہیں بخشی گئی۔ کیونکہ جبرئیلؑ کی حیثیت قاصد

اور نامہ بر کی ہے اور یہ ایک بھید اور راز ہیں جنہیں بھیجنے والے اور پانے والے کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بالفاظِ دیگر محکمات کا تعلق عوام سے ہے، متشابہات کا خواص سے اور مقطعات کا حضور علیہ السلام کی ذاتِ اقدسؐ سے، متشابہات کو راسخ فی العلم لوگ بھی اپنے علم وفضل کے بل بوتے پر نہیں سمجھ سکتے۔ یہاں زبان دانی اور علمی بصیرت بھی کام نہیں دیتی۔ کیونکہ ان کی تعلیم فضلِ ربانی پر موقوف ہے اور وہ خاص لوگوں کا حصہ ہے۔ خیر یہ تو متشابہات ہیں۔ محکمات جن کے معانی ظاہر ہوتے ہیں اُن کے سمجھنے کے لئے بھی ایمان شرط ہے ورنہ انہیں ابوجہل بھی سمجھ لیتا۔ ایمان کے بغیر وہ محکمات کو بھی نہ سمجھ سکا اور اہلِ دل پر متشابہات کا مفہوم بھی واضح کر دیا گیا۔

نبوّت کے مشاہدات

عوام کی رُوح خواب میں اسرارِ غیبیہ کا مشاہدہ کرتی ہے جب یہ علائقِ بدنیہ سے آزاد ہو جاتی ہے تو اسے اَن دیکھی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں اور اس کے لئے زمان و مکان کی قید بھی نہیں رہتی۔ آنِ واحد میں یہ ہزاروں اور لاکھوں میل کا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ نبیؐ کی رُوح چونکہ لطافت کے انتہائی اعلیٰ اور ارفع مقام پر فائز ہوتی ہے۔ اور اُس کا بدن بھی ہماری رُوح سے زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ اس لئے ہم جو خواب میں نہیں دیکھ سکتے وہ بیداری میں دیکھتا ہے۔ ہمارے خوابی، نومی اور کشفی مشاہدات خواہ کتنے بھی اعلیٰ و ارفع کیوں نہ ہوں۔ وہ نبیؐ کے مشاہدات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ انبیاءؑ کے اجسام ہی ہماری ارواح سے لطیف نہیں ہوتے۔ اُن کے خواب بھی ہمارے خوابوں سے لطیف ہوتے ہیں۔ اور اُن کی بیداری کی شان بھی نرالی ہوتی ہے، ابراہیم علیہ السلام نے بیداری ہی میں ملکوتِ سماویہ اور ارضیہ کا مشاہدہ کیا تھا۔ خواب میں ہماری روح کی دیکھی ہوئی کوئی کیفیت

بھی معتبر نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری رُوح کا وہ مشاہدہ غلط ہو اور انبیاءُ علیہم السلام کے خواب اور بیداری کے مشاہدات میں فرق و امتیاز کرنا مشکل ہے۔ وہ خواب میں دیکھیں یا بیداری میں، دل کی آنکھ سے مشاہدہ کریں یا ظاہری آنکھوں سے، اُن کا مشاھدہ غلط نہیں ہو سکتا۔

نبیؐ نے خواب میں دیکھ کر کوئی حقیقت آشکارا کی ہے تو اُسے بھی ہمیشہ وحی سمجھا گیا ہے۔ اور بیداری میں بھی عالمِ غیب سے متعلق کوئی اطلاع دی ہے تو اُسے بھی حقیقت پر مبنی مشاہدہ جان کر قبول کیا گیا ہے، نبوّت کے مشاھدات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دُنیا کتنی وسیع ہے، جنت، دوزخ اور برزخ اس دنیا کے چند گوشے ہیں۔

برزخی کیفیّت

برزخِ دُنیا میں ہماری رُوح، غیبی امور کا مشاہدہ کرتی ہے اور برزخِ آخرت میں اُخروی زندگی میں پیش آنے والے حالات و کوائف سے دوچار ہو گی۔ بیدار رہ کر دنیا میں برزخی زندگی کا مشاہدہ ممکن نہیں۔ ایسے ہی دنیا میں آخرت کے حالات کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ موت کے بعد یہ حالات خود بخود نظر آنے لگتے ہیں۔

سوئے ہوئے کی دنیا، بیدار کی دنیا سے مختلف ہوتی ہے قریب ہونے کے باوجود ہم اُس کی دنیا میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتے، ہاں! کبھی کبھار اُس کی رُوح پر طاری ہونے والی کیفیتیں گریہ و خندہ بن کر ظاہر ہونے لگتی ہیں اور ہم اُن کا مشاہدہ کر لیتے ہیں، لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس گریہ و خندہ،

شادی اور غم کا محرک کون سا جذبہ ہے! کیا چیز اسے رُلا رہی ہے۔ اس کی ہنسی کا باعث کیا ہے! گو یا حقیقت حال ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ کچھ آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اُخروی برزخ کی بھی کچھ ایسی ہی حالت ہے۔ مرنے والے کے قریب بیٹھے ہوئے بھی ہم بعض اوقات اس کے گریہ اور خندہ کو دیکھتے ہیں۔ لیکن اس کے اصلی محرکات کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ جیسے ممکن ہے کہ سونے والے کا گریہ کسی مسرت کے باعث ہو۔ کسی بچھڑے ہوئے عزیز سے مل کر وہ خواب میں رو رہا ہو۔ ایسے ہی نزع میں مبتلا انسان کا گریہ بھی کسی مسرت کا غماز ہو سکتا ہے۔ اِسی لئے اُس کے متعلق کوئی غلط تاثر قائم کرنے سے ہمیں روکا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اُس کا گریہ، مسرت کا گریہ ہو۔ یا خشیتو ربانی کا اظہار جو عبودیت اور بندگی کی دلیل ہے اور ہم سوئے ظن میں مبتلا ہو کر معصیت کار بنیں۔

نبوت کے علوم

غزوۂ تبوک کی طرف پیش قدمی کرتے وقت حضور علیہ السلام نے ایک مقام پر پہنچ کر اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ سواری کی رفتار تیز کر دی اور صحابۂ کرامؓ سے فرمایا کہ وہ یہاں سے جلد گذر جائیں۔

فرمانِ نبوی کے مطابق یہ وہ مقام تھا جہاں صدیوں پہلے قومِ ثمود کی نافرمانیوں کے باعث اُن پر عذاب نازل ہوا تھا۔ یہ مبغوض مقام تھا جسے نگاہِ نبوت نے دیکھ لیا۔ چنانچہ صحابہؓ کو یہاں سے روتے ہوئے گزرنے کی تاکید فرمائی۔

انسانی عقل کسی مقام کے آثار و نقوش دیکھ کر کوئی غلط یا صحیح رائے تو

قائم کر سکتی ہے لیکن وہ کسی مقام پر صدیوں پہلے گذرنے والے احوال و کوائف کو حتمی طور پر بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ یہ نبوت کی نظر تھی۔ جس نے عذابِ الٰہی کے اثرات کو بر ملا دیکھ لیا۔ اور جس قوم پر یہ عذاب نازل ہوا تھا اس کا سُراغ بھی دے دیا۔ انبیاء علیہم السلام کو جو نظر عطا ہوتی ہے۔ وہ علیۂ ربانی کی حیثیت رکھتی ہے جس پر کسی اور نظر کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

اُن کا ذوق نبی کا ذوق ہوتا ہے۔ اُن کے فہم و فراست کی شان بھی دوسرے لوگوں سے مختلف اور ربانی شان کی آئینہ دار سمجھی جاتی ہے۔ یہ ربانی تعلیم ہے کہ مبغوض مقامات پر نہ رُکا جائے۔ انہیں عبرت پذیری کی جگہ سمجھ کر آنسو بہائے جائیں۔ خدا تعالےٰ کے قہر و غضب کے تصور سے خوف زدہ ہو کر اپنے اندر عبودیت کی شان پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ حضورؐ نے صحابہؓ کو اس طرف متوجہ کیا۔ صحابہؓ کا ایمان عقل کے پجاریوں کی طرز کا ایمان نہ تھا جو اس خدشہ کو دل میں جگہ دیتے۔ کہ قومِ ثمود پہ یہاں عذاب نازل ہوا تھا۔ تو ہمیں رونے کی کیا ضرورت ہے؛ ہم یہاں سے کیوں عجلت سے گذریں؟ بات یہ تھی کہ انہیں نبوت کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی وہ نبوّت کا مفہوم سمجھتے تھے۔

اعلانِ بخشش

زندگی میں انسان کو بعض ایسے لمحے نصیب ہو جاتے ہیں جن کا پوری زندگی بھی بدل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اُن پر دونوں جہان بھی نثار کر دیئے جائیں تو ذوق کی سیرابی نہیں ہوتی۔ ذوق تشنہ ہی رہے گا۔ اور تہی دامنی کا احساس کم نہ ہونے پائے گا۔ حضرتِ ربیعہؓ کو بھی زندگی کی چند ایسی ساعتیں ملی ہیں، جن

میں انہیں خلوت و جلوت میں حضور علیہ السلام کی خدمت کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ یہ لمحے خواہ قلیل ہوں یا کثیر، دلوں پر مشتمل ہوں۔ یا ماہ سال پہ، اُن کی ابدیت سے انکار ممکن نہیں۔ وہ خود ابدی تھے اور ربیعہؓ کو ابدی بنا گئے۔ ربیعہؓ خود کہتے ہیں کہ ایک روز حضورؐ نے خوش ہو کر فرمایا۔ کہ ربیعہؓ مانگ کیا مانگتا ہے! میں نے کہا! حضورؐ! جنت میں آپ کی دائمی رفاقت چاہتا ہوں حضورؐ نے فرمایا! کہ بس یہی یا کچھ اور بھی! میں نے عرض کیا یہی یا رسولؐ اللہ! تو حضورؐ نے فرمایا کہ اچھا نمازوں سے میری مدد کرو!

اس عطا اور طلب دونوں کی شان نرالی ہے۔ حضورؐ نے بھی خوش ہو کر کوئی خاص انعام دینے کا اعلان نہیں فرمایا۔ بلکہ ربیعہؓ سے ہی پوچھا کہ کیا چاہتے ہو! جو مانگنا ہے مانگ لو!

اس عام اعلانِ بخشش سے معلوم ہوتا ہے کہ دستِ کرم میں بے پایاں خزانے تھے کوئی ایسی نعمت نہیں جس پر حضورؐ کا تصرف نہ ہو۔ صحابیؓ بھی اس نکتہ سے آگاہ تھا اس لئے پکار اُٹھا کہ جنت میں آپ کی رفاقت چاہتا ہوں اگر اُسے ہلکا سا بھی اندیشہ ہوتا کہ جنت حضورؐ کے تصرف میں نہیں یا یہ کہ حضورؐ اِس عطا پر قادر نہیں تو وہ ہرگز یہ نہ مانگتا اور ہر عطا پہ چونکہ شکر واجب ہوتا ہے۔ اس لئے ربیعہؓ کو سجدہ ریزیوں کی تعلیم دی گئی۔ عطا تو ہوتی ہی جذباتِ محبت کو ابھارنے کے لئے ہے۔ وہ غافل تو نہیں بناتی:

ایک بزرگ

حضور علیہ السلام کی امت کے ابو بکر محمد بن عمر الوداق نامی ایک بزرگ گذرے ہیں۔ جن کا تبع تابعین کے ممتاز ترین علماء میں شمار ہوتا ہے۔ ہر عہد کے مشائخ رحم

سنے اُن کے ملفوظات سے استفادہ کیا ہے۔ یہی بزرگ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ انسانوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک امراء و سلاطین کی جماعت ہے، ایک علما کا گروہ ہے اور ایک وہ لوگ ہیں۔ جنہیں فقراء کہا جاتا ہے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ جب امرا و سلاطین میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو معاشی ابتری پھیلتی ہے۔ شرعی معاملات کے بگاڑ کا باعث علمائے اسلام کی بے حسی اور بے عملی ہوتی ہے۔ اور فقرا بگڑتے ہیں۔ تو اخلاقی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اِن تینوں گروہوں کے بگاڑ کی علامات شیخ رح نے یہ بتائی ہیں، کہ ذی اختیار طبقہ جب تک تعدّی اور جور کو اپنا شعار نہیں بنا لیتا، عذابِ الٰہی کی لپیٹ میں نہیں آتا۔ علماء کو لالچ تباہ کر دیتا ہے، اور فقرا کی تباہی کا باعث اُن کی جاہ طلبی ہوتی ہے۔ زہد و تقویٰ کا لباس پہن کر جو فقیر اربابِ جاہ کے دروازے پر کھڑا نظر آئے۔ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی حقیقت کھو چکا ہے۔ بندوں کے دروازے کو اپنے رب کے دروازے پر ترجیح دینے لگا ہے، علماء کی ہوس اُن کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اور اقتدار کو ظلم لے ڈوبتا ہے۔" شیخ رح نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مقتدر لوگوں کا بگاڑ تو جہالت اور بے خبری کے باعث بھی ہو سکتا ہے لیکن علماء کے بگاڑ کو بے خبری کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ دانستہ بگڑتے ہیں اور فقراء جب توکّل کو نظر انداز کرتے ہیں تو یہ بھی اس حقیقت سے بے خبر ہی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی ذات سمیع و بصیر ہے، مشکلات کا حل اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے ان تینوں گروہوں کی بداعمالیوں کے نتائج سے آگاہ کرنے کے بعد شیخ رح نے یہ بھی کہا ہے کہ بگاڑ کی صورت میں ان کی صحبت مفید نہیں بلکہ سخت ضرر رساں ہوتی ہے

فلسطین

بیت المقدس کی تقدیس کی مختلف وجوہات ہیں۔ یہ انبیائے سابقین کا قبلہ ہے۔ حضورؐ علیہ السلام نے بھی ایک عرصہ اسی کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی ہے اسی جگہ مسجدِ اقصٰی ہے۔ جس کی حضرت داؤد علیہ السلام نے بنیاد رکھی تھی۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہیں شبِ معراج، حضورؐ نے انبیاء علیہم السلام کی امامت فرمائی، ان کے سامنے خُطبہ دیا اور اپنا ارضی سفر طے کرنے کے بعد عالمِ علوی کی طرف تشریف لے گئے۔ صخرٰی، معراجِ علوی کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہیں سے عَلوی سفر کی ابتدا ہوئی۔ اور اسی لئے اس مقام کو غیر معمولی عظمت و شہرت حاصل ہے۔ صخرٰی کا گنبد عبدالملک بن مروان نے بنایا تھا جو اپنی رعنائی و زیبائی میں بے مثل ہے، در و دیوار میں لعل و یاقوت نصب ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کی دلچسپی نے اسے بڑی دل آویزیاں بخشیں۔ مسجد کی مشرقی جانب ایک تہ خانہ ہے جہاں حضرت مریمؑ سکونت پذیر تھیں، قریب ہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام کو غسل دیا گیا۔ اور جہاں حضرت مریمؑ اور ان کی قوم کے درمیان وہ مکالمہ ہوا جسے قرآن نے بیان کیا ہے۔ مسجد کے نیچے ایک تہ خانہ ہے۔ یہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کے محلات تھے۔ غربی دیوار کے کچھ حصہ کو "دیوارِ گریہ" کا نام دیا جاتا ہے، یہودی ہفتہ کے دن یہیں آہ و بکا کرتے ہیں۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کا مزار بھی اسی دیوار کے پاس ہے۔ بیت المقدس کی شرقی جانب "جبلِ زیتون" وہ مقام ہے جہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام آسمان کی طرف اٹھائے گئے تھے۔ دامنِ کوہ میں حضرت مریمؑ کا مزار ہے، مزید یہ کی لبتی بھی یہاں

سے قریب ہے یہ حضرت عزیر علیہ السلام کے مزار کی جگہ ہے. بستی کا نام حضرت عزیر علیہ السلام کے نام پر رکھا گیا تھا بیت المقدس کے ذرّے ذرّے کو انبیاء علیہم السلام کی پابوسی کا شرف حاصل ہے یہاں کی فضاؤں نے نغمۂ داؤدؑ سنا. جمالِ یوسفی دیکھا سلیمان علیہ السلام کی شان و شوکت کا مشاہدہ کیا. ابراہیم علیہ السلام کی درد و کرب سے لبریز زندگی دیکھی. عزیر علیہ السلام کے مر کر دوبارہ زندہ ہونے کا واقعہ بھی یہیں پیش آیا. حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت جو واقعات ظہور پذیر ہوئے اُن کا تعلق بھی اِسی سرزمین سے. لوطؑ کے زمانے کی بستیوں سدوم اور عمورہ کے اُلٹنے کا واقعہ بھی اسی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے. عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی لوگوں نے یہیں دیکھے. مائدہ بھی یہیں اُترا. حضرت یوسف علیہ السلام کو کنوئیں سے نکال کر غلام بنایا گیا. تو اُنہیں مصر لے جانے والا کارواں بھی اِسی راہ سے گذرا تھا. یہیں پہنچ کر انہیں اپنی ماں کی قبر نظر آئی. اور اُن کے آنسو نکل پڑے. اسی خاک میں اُن کے آنسو جذب ہیں. داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام جب اپنے خالق و مالک اور پروردگار کے مطیع و فرماں بردار کی حیثیت سے مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے تو دنیا نے اُن کے ذوق و شوق کا عالم یہیں دیکھا. ابراہیم علیہ السلام کے بچپن کی معصومیت بھی یہیں نظر آئی. یہیں اُن کا مولد رہا ہے. یہیں انہوں نے بُت شکنی کا آغاز کیا. توحید کا زمزمہ پہلی بار اُن کے لبوں پر یہیں آیا تھا. اور مصائب و آلام کے پہاڑ بھی اُن پر یہیں ٹوٹے تھے. یہیں ایک داعیٔ حق کی عزیمت اور استقامت جلوہ گر ہوئی تھی. نافرجام قوم جو اپنی اخلاقی گراوٹ کی نمود کے لئے اجتماعات منعقد کرنے کی عادی تھی. یہیں آپ کو ایک ثقافتی شو دیکھنے کے لئے مجبور کر رہی تھی. اور

آپ نے حکمتِ عملی سے کام لے کر دامن بچا لیا تھا۔ اپنے باپ آذر کے سامنے توحید کا مفہوم واضح کرتے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو اندازِ بیان اختیار کیا وہ اس انداز سے یکسر مختلف تھا جو قوم کے جاہلوں اور بادشاہوں کے سامنے اختیار کیا گیا۔ ایک جگہ اغلاق وابہام تھا اور ایک جگہ وضاحت، دونوں مقامات کے تقاضے الگ تھے اور حق کا داعی اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں بھی اُن حکمتوں اور مصلحتوں سے بے خبر نہ تھا۔ جن کے بغیر تبلیغی مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ قرآنِ حکیم میں انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کے جو ایمان افروز واقعات مذکور ہیں۔ اُن میں سے بیشتر کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ جو فلسطین کے نام سے موسوم ہے۔ یہیں حضرت مریمؑ کا وہ حجرہ ہے جہاں انہوں نے حضرت زکریاؑ کے زیرِ سایہ رہ کر پرورش پائی تھی۔ اور اُن کے پاس کسی وسیلے کے بغیر رزق آتا تھا۔ جسے دیکھ کر حضرت زکریاؑ کو بھی یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، کہ یہ کہاں سے آتا ہے اور انہوں نے وسیلے کی نفی کر کے اُسے افضالِ ربانی قرار دیا تھا۔ جبریلؑ امین بشری صورت میں یہیں آئے تھے۔ یہیں انہوں نے بچے کی بشارت دی تھی۔ یہیں حضرت مریمؑ کو ایک اجنبی کی صورت دیکھ کر خوف لاحق ہوا تھا۔ انہوں نے خدا کی پناہ مانگی تھی اور بچے کی بشارت سن کر حیرت کا اظہار کیا تھا۔ کہ مجھے تو کسی بشر نے چھوا تک نہیں"۔
خشک درخت سے یہیں حضرت مریم کو غذا ملی تھی اور انہوں نے میٹھے چشمہ کا پانی پی کر رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا۔ قوم کی طرف سے حضرت مریمؑ کی عفت وعصمت پر اعتراض ہوا تو اس کا جواب بھی نومولود عیسیٰؑ نے یہیں دیا تھا۔ اپنی عبودیت کا اعلان واظہار بھی یہیں کیا اور یہ بھی بتایا کہ میں صاحبِ کتاب نبیؑ ہوں۔ ماں کی برأت ثابت کرنے کا یہ مؤثر ترین طریقہ تھا۔ اپنی عبودیت کو ماں کی عصمت کی گواہی کے طور پر پیش کیا۔ مقصود یہ تھا کہ

عفت وعصمت کے جوہر سے خالی ماں کے پیٹ سے عبد کامل پیدا نہیں ہو سکتا عبودیت کے جوہر اسی پر کھلتے ہیں۔ جو پاک باز ماں کا بیٹا ہو۔ اسی پر وحی کی صورت میں انوار برستے ہیں اور رب تعالیٰ کا قرب بھی اسی کو نصیب ہوتا ہے۔ ماں کی عفت و عصمت کے آبگینے پر اعتراض کی صورت میں جو چوٹ پڑی۔ اسی نے آغوشِ مادر میں زندگی کے ابتدائی سانس لینے والے معصوم کو گویا کر دیا۔ مریمؑ خاموش تھیں اور عیسیٰ علیہ السلام گویا۔ زندگی کے مراحل میں بعض ایسے مقامات بھی آتے ہیں۔ جہاں گویائی فرض ہو جاتی ہے۔

حرمتِ حق نگاہوں کے سامنے پامال ہو رہی ہو۔ تو مردِ حق خاموش نہیں رہ سکتا بے زبان ہونے کے باوجود بھی بولنے کا ارادہ کرے تو اُسے اپنے رب کی طرف سے حق کی شہادت دینے کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قبلۂ اوّل کے یہود کے زیرِ تسلط آجانے کے بعد آتش زنی کا جو واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے وہ کوئی نیا نہیں ــــ صدیوں پہلے جب یہاں بخت نصر کی حکومت تھی۔ تو بیت المقدس کو اُس وقت بھی ناخوشگوار حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بخت نصر نے اسے جلا دیا۔ یہاں کے آثار و نقوش مٹا دیئے اور بنی اسرائیل کو نیست و نابود کر دیا۔

اس عہد کی وحشت و بربریت اور بخت نصر کے عہد کی وحشت و بربریت میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ اُس وقت بنی اسرائیل کمزور تھے اور اب اُن کی یہ حیثیت نہیں۔ بیت المقدس میں تباہی و بربادی پھیلانے کے بعد جب بخت نصر عذابِ الٰہی کی لپیٹ میں آگیا۔ تو ایک دن حضرت عزیر علیہ السلام ادھر سے گذرے۔ وہ سوچنے لگے کہ کیا اب یہ بستی آباد ہو سکتی ہے اس کی بہاریں لوٹ سکتی ہیں۔ کبھی یہاں زندگی کی ریل پیل تھی اور اب مہیب سناٹا ہے۔ کیا یہ دائمی تو نہیں! چنانچہ خدا تعالےٰ نے اُن کی رُوح کو قبض کر لیا۔ وہ دوبارہ زندہ ہوئے۔ تو

یہاں کے بیل ونہار بدل چکے تھے۔ زندگی اپنی پوری تابانی کے ساتھ نگاہوں کے سامنے جلوہ گر تھی۔

رب تعالےٰ نے حضرت عزیز علیہ السلام سے پوچھا کہ تم یہاں کتنی دیر رہے ہو۔ وہ بولے کہ ایک دن یا ایک دن سے کچھ زیادہ۔ فرمایا گیا کہ نہیں تم پر ایک صدی گزر چکی ہے۔ انہیں ان کے اس گدھے کا مشاہدہ بھی کرایا گیا۔ جس کا گوشت پوست سڑ چکا تھا۔ اُن کے کھانے پینے کا سامان بھی دکھایا گیا۔ جس پر امتدادِ زمانہ کا کوئی اثر نہ تھا۔ ان آیاتِ الٰہیہ کو دیکھ کر حضرت عزیز علیہ السلام اپنے رب کی حمد وثنا بیان کرنے لگے۔ انکی زبان سے نکلے ہوئے یہی الفاظ وحیِ ربانی بن کر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر نازل ہوئے۔ یہی آیاتِ قرآنیہ عزیر علیہ السلام کی قبر پر مرقوم ہیں۔ بیت المقدس کی غربی جانب چند میل دور بیت الحم ہے۔ اسی طرف جانے والی راہ پر حضرت یوسف علیہ السلام کا مزار ہے۔ بیت الحم کا قریہ یہود کے نزدیک بڑا محترم ہے۔ یہ اُن کی عبادت گاہ ہے۔ یہاں وہ تورات پڑھتے ہیں، روتے پیٹتے ہیں اور یہیں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت گاہ ہے۔ جس درخت سے حضرت مریم علیہا السلام کو کھجوریں ملی تھیں وہ بھی یہیں ہے اور یہ اُس عہد میں بھی خشک تھا۔ اور اب بھی خشک ہے جس چشمہ سے انھوں نے پانی پیا تھا وہ بھی یہیں ہے۔ بیت المقدس سے کوئی ۲۵ میل کے فاصلے پر خلیل الرحمان نامی ایک قصبہ ہے۔ یہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام آسودۂ خواب ہیں۔ اور اسی قصبہ کے قریب ایک اور قصبہ میں اُن کی بیوی سارہؓ کا مزار ہے۔ جنوبی جانب اُن کے صاحب زادے حضرت اسحاقؑ اور اُن کی بیوی حضرت رفقہؓ کی قبریں ہیں۔ ساتھ ہی حضرت یعقوبؑ اور اُن کی بیوی لیہؓ کی آرام گاہیں ہیں۔ حضرت یوسفؑ کا مزار بھی باپ کے مزار کے قریب ہے۔ زندگی میں یعقوبؑ کو یوسفؑ کی جدائی گوارا نہ تھی مرنے کے بعد بھی جُدا نہ ہونے دیا۔ اور شاید اس دائمی

وصال میں فراق کی اُن جانکاہیوں کا بھی عمل دخل ہو۔ جن کا یعقوب علیہ السلام کے دل پر گہرا اثر تھا۔

قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

یہود کی جو تاریخ قرآنِ حکیم نے بیان کی ہے اُسے دیکھنے کے بعد اُن کی بد باطنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب اُن پر انعاماتِ ربانیہ کی بارش ہوئی تو یہ اور سرکش ہو گئے۔ انعامات کا سلسلہ بند ہو گیا تو خُدا کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے لگے۔ بولے کہ خُدا تعالےٰ کا ہاتھ سُکڑ گیا ہے اِس پر اُنہیں لعنت کا مورد قرار دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرعون سے نجات دلائی۔ لیکن یہ دریا پر جا کر اَکڑ گئے کہ جب تک دریا میں حسین راہیں نہ بنیں گی اُن میں ایسے جھروکے نہ ہوں گے۔ جن کے ذریعے یہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں یہ دریا سے نہ گذریں گے۔ حالانکہ فرعون کا خطرہ ابھی ٹلا نہ تھا۔ فرعون آ گیا تو یہ چیخنے لگے۔ کہ ہم پکڑے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی۔ اور بڑے آرام سے پار لے گئے۔ دریا کے اُس پار پہنچ کر انہیں ایک ایسی قوم نظر آئی جو بتوں کو پُوج رہی تھی یہ حضرت موسیٰؑ سے تقاضا کرنے لگے کہ ہمیں بھی ایسا معبود بنا دو۔ جسے ہم پُوج سکیں۔ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس مطالبہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل پر کیا گذری ہوگی جنہوں نے زندگی بھر انہیں توحید کا درس دیا۔ فرعون سے نجات دلائی۔ اور دریا عبور کرتے وقت اِن کے بچگانہ مطالبات کو پورا کیا۔ دریا سے گذرنے کے بعد انعاماتِ ربانیہ کا اقرار واعتراف کرنے کی بجائے انہوں نے شرک کی آرزو کی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُس تعلیم کو نظر انداز کر دیا۔ جو توحید کے مفہوم ومعنی پر مشتمل تھی۔ یہود کے ناجائز اور مشرکانہ مطالبے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت میں جو قلق واضطراب پیدا ہوا

اُس کا تھوڑا سا اندازہ اُن کے اُس مختصر سے جملے سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے یہود کے جواب میں کہا تھا۔ مضطرب ہو کر بولے کہ تم جاہل ہو۔ مطالبات کی جو فہرست بنی اسرائیل نے دریا کے اُس پار کھڑے ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش کی تھی اگرچہ اس میں معقولیت کی بجائے جہالت کا عنصر غالب تھا۔ لیکن کلیم اللہ نے اُس سے کوئی زیادہ اثر قبول نہ کیا۔ لیکن شرکت کا مطالبہ تو کلیمؑ اللہ کے لئے ناقابلِ برداشت تھا وہ تند و تیز جواب دینے پر مجبور ہو گئے۔

اس واقعہ سے بہت پہلے بنی اسرائیل خدا تعالےٰ کو بے حجاب دیکھنے کا تقاضا بھی کر چکے تھے۔ حضرت موسیٰ منتخب افراد کو کوہِ طور پر لے گئے اور اُن پر تجلّی کا ظہور ہوا لیکن مشاہدے کی منزل سے گذرنے کے باوجود انہیں وہ ایمان نصیب نہ ہو سکا جو غیب کی منزل میں رہنے والے حق پرستوں کو نصیب ہوتا ہے۔ انجامِ کار اُن پر بجلی گری، اور وہ خاکستر ہو گئے۔ اس سانحہ میں اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کے قہر و غضب کا بھی دخل تھا۔ لیکن جب غصّہ فرو ہوا اور جذبات کی متانت میں وہ معاملے کی نزاکت پر غور کرنے لگے تو انہیں تاسف ہوا۔ اور وہ اُن کی زندگی کی آرزو کرنے لگے انہیں دوبارہ زندگی دلا کر جب وہ بنی اسرائیل کے پاس لائے تو اُن کی زبان سے توحید و رسالت کا ذکر سُن کر انہیں اور بھی حیرت ہوئی وہ کہنے لگے کہ انہیں بھی موسیٰ علیہ السلام اپنے رنگ میں رنگ لائے ہیں۔ مصر سے ہجرت کرتے وقت بنی اسرائیل اپنے ساتھ جو خیمے لے گئے تھے۔ جب وہ پھٹ گئے تو اُن پہ ابر سایہ کناں رہنے لگا۔ من و سلویٰ بھی اُن ہی کی خاطر اُترا۔ اور جب ایک شخص کے قتل کے باعث اُن میں پھوٹ پڑ گئی تو مقتول کو زندہ کر کے خدا تعالےٰ نے اُس سے گواہی دلوائی۔ اُن کی پیاس بجھانے کے لئے ضربِ موسوی کے ذریعے پتھروں سے پانی نکلا۔ ان نعمائے ربانیہ کے باوجود ان کے دل نرم نہ ہو سکے۔ اور ان سے بار بار طغیان و سرکشی کا ظہور ہوتا رہا۔ غرض بنی اسرائیل کے جو احوال و

کوائف قرآن میں مذکور ہیں وہ انوکھے اور نرالے ہیں۔ انہی پیہم سرکشیوں کے باعث انہیں عذابِ الٰہی کا مورد بنایا گیا۔ ذلت اُن کا مقدر بن گئی۔

یہود کی موجودہ ترقی حیرت انگیز نہیں۔ آخر خانہ کعبہ میں بھی مدتوں بت بجتے رہے ہیں جب بھی مسلمان ایمانی جذبات سے سرشار ہو کر ان کا قلع قمع کرنے کے لئے اُٹھے خدا کی نصرتیں اُن کے ساتھ ہوں گے۔

موسیٰؑ اور خضرؑ

موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی ملاقات تاریخِ تصوف ہی کا اہم ترین موضوع نہیں، قرآن نے بھی اسے عملی عنوان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

اس واقعہ کے فوائد و ثمرات اور اسرار و رموز کی طرف بہت کم لوگوں کی نظریں گئی ہیں۔ بالعموم لوگ اسی میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں کہ ایک صاحبِ کتاب نبی اور مرسل جو کلیم اللہ کے نام سے موسوم ہے، جسے عصا اور یدِ بیضا دیا گیا۔ جس نے فرعونی نظام کو تہہ و بالا کر کے بنی اسرائیل کو نجات دلائی اور انہیں عزت و عظمت بخشی، جو براہِ راست مکالمہ و مخاطبہ ربانی سے مشرف ہوا، جس نے کوہِ طور پر حسنِ مطلق کا نقاب اُلٹ دیا۔ اور تجلیوں کی زد میں آکر طور خاکستر ہو گیا۔ لیکن اُس پر آنچ نہ آئی۔ اُسے اتنی عظیم عظمتوں کے باوجود ایک ایسے پیرِ دانا کے پاس کیوں بھیجا گیا؟ جو نہ نبی تھا اور نہ مرسل، نہ صاحبِ وحی تھا، نہ صاحبِ کتاب۔ اس عظیم اُلجھن نے بالعموم لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی ہے اور وہ ان حکمتوں اور مصلحتوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے۔ جو اس واقعہ اور قصے کا ماحصل ہیں۔

حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام مشاہدۂ حق میں تھے اور خضر علیہ السلام مشاہدۂ مخلوق میں۔ فرعون کی تباہی اور بربادی اور بنی اسرائیل کو عظمتیں عطا کرنے کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام کو مشاہدۂ مخلوق کی منزل سے گذارنا منظور ہوا تو انہیں خضر علیہ السلام

کے پاس بھیج دیا گیا۔ مشاہدۂ حق، مشاہدہ مخلوق سے افضل ہے اس لئے اُن کے خضرؑ کے پاس جانے میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی۔

شاہ اگر کسی غلام کو اپنی ذات کے لئے مخصوص کرلے۔ تو مشاہدہ اُس کی دولت ہوگی وہ مشاہدۂ جمال سے دیدہ و دل کو تسکین کرے گا۔ جمال کی لطافتوں کی سائے میں اُس کی زندگی بسر ہوگی۔ وہ اس غلام کی لسنبت حریمِ جمال کے اسرار سے زیادہ واقف ہوگا۔ جسے بازار سے سودا سلف لانے کے لئے مامور کیا گیا ہو۔

بازار سے سودا سلف لانے والا غلام شہری زندگی کے آداب و رسوم، انسانوں کے مزاج اور اُن کے طبقات واحوال و کیفیات اور اُن کی زندگیوں سے تعلق رکھنے والے حالات سے زیادہ واقف ہوگا۔ کیوں کہ اس کی تمام تر زندگی شہری ہے۔ وہ ہمہ تن مشاہدۂ مخلوق میں رہتا ہے لیکن وہ ان اسرار و رموز کی کُنہ و حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا۔ جن سے حریم جمال میں رہنے والا واقف ہوسکتا ہے۔

خضر علیہ السلام مشاہدۂ مخلوق میں تھے اُن کا تمام تر علم اسی سے متعلق تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام مشاہدۂ حق میں مستغرق۔ ایک کا علم مخلوق کے احوال و کیفیات اور اسرار و رموز سے متعلق تھا۔ اور ایک کا مشاہدۂ حق کی لذتوں اور سرشاریوں سے۔ اس لئے خضر علیہ السلام کے علم کو موسیٰؑ کے علم سے افضل اور اعلیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بازار سے سودا سلف خریدنے والا غلام خواہ موتیوں ہی کا تاجر کیوں نہ ہو۔ شاہ کی محفل میں رہ کر جمال کی لذتوں سے سیراب ہونے والے اور شاہ کے دل کے بھید جاننے والے غلام کا مثیل و مماثل نہیں ہوسکتا۔ دونوں کے علم میں کوئی تطابق نہیں۔ دونوں کی لذتیں جداگانہ ہیں دونوں کے اسرار بھی آپس میں کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ مراتب کا فرق بھی واضح ہے۔ خضر علیہ السلام ملاحوں سے باتیں کرنے والے تھے۔ اور کلیم اللہ اپنے رب سے ہم کلام تھے۔ ایک صاحب وحی و کتاب تھے۔ مرسل تھے، نبی تھے۔ رسول تھے، اور امین اور طور کی

وادیوں میں امن کی بے تکلفانہ آمد و رفت اُن کی ظلمتوں کی آئینہ دار تھی۔ دونوں میں کوئی نسبت نہیں۔ کوئی علاقہ نہیں، ایک کے مشاغلِ حیات دوسرے کے مشاغلِ حیات سے یکسر مختلف اور جداگانہ نوعیت کے حامل ہیں۔ مشاہدہ اپنا اپنا تھا۔ نظر اپنی اپنی تھی، ذوق و وجدان بھی ہم آہنگ نہ تھا۔ ایک کا ذوق نبی اور مرسل کا ذوق تھا اور ایک کا غیر نبی کا، اس کی نظر بھی پیمبرانہ تھی انداز فکر بھی مرسل کا نہ تھا۔ اس لئے دونوں کے علم اور مشاہدہ میں کوئی تطابق نہ تھا۔ ایک کا علم اعلیٰ ذات سے متعلق تھا۔ اور ایک کا اسفل سے، ایک حریمِ قدس کا محرم تھا اور ایک ناسوتی دنیا کا رازدار، اس لئے مقام اور مرتبہ کا فرق واضح اور آشکار ہے۔

موسیٰ علیہ السلام جب ربانی ہدایات کے مطابق خضر علیہ السلام کی تلاش کے لئے نکلے تو مجمع البحرین سے آگے بڑھنے کے بعد انہوں نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا کہ مجھے کھانا دو، یہ کھانا صبح کا ناشتہ تھا، جو بھنی ہوئی مچھلی کی صورت میں نوجوان کے پاس موجود تھا۔ لیکن اُس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ افسوس میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ جہاں ہم نے پتھر کے قریب قیام کیا تھا۔ وہیں مچھلی زندہ ہو کر دریا میں غائب ہو گئی۔ موسیٰ علیہ السلام یہ سُن کر واپس لوٹ آئے۔ اُن کے نقطۂ نگاہ کے مطابق یہی مقام خضرؑ کی ملاقات کا مقام تھا جہاں بے جان مچھلی کو دوبارہ زندگی ملی تھی۔

ربانی ارشاد کے مطابق یہ مچھلی جہاں سے گزری تھی وہیں سے پانی ہٹ گیا تھا۔ اور وہ اپنا راستہ بناتی ہوئی آگے گذر گئی۔ دریا کا بہاؤ اور اس کی تند و تیز موجیں اس راہ کو پُر نہ کر سکیں۔ جو مچھلی کے گذرنے کے باعث پانی سے خالی ہو چکا تھا۔ پانی کی لطافت موسیٰؑ کے قرب میں رہنے والی اور قرب کے باعث زندہ ہونے والی مچھلی کی لطافت پہ غالب نہ آ سکی۔ پانی کی لطافت طبعی تھی۔ اور مچھلی کو جو لطافت عطا ہوئی۔ وہ ایک نبی اور مرسل کا عطیہ تھی۔ عطا کا مقام طبعی لطافت پہ غالب تھا۔

مجمع البحرین پہ پہنچ کر جب موسیٰ علیہ السلام نے خضرؑ کو پایا تو انہیں اُن کے پہچانتے ہی

کوئی دِقت پیش نہ آئی۔ اس لئے کہ خضر علیہ السلام بھی عطائے ربانی کے مورد تھے انہیں عبودیت کا مقام نصیب تھا۔ رحمت ان کے جلو میں تھی اور علمِ لدنی اُن کا سرمایۂ حیات تھا۔ عبدیت، رحمت اور علمِ لدُن کا مالک موسیٰ علیہ السلام کے سامنے تھا۔ خضر علیہ السلام کی یہ تینوں صفات قرآن نے بیان کی ہیں۔ حریمِ قدس میں رہ کر رحمت درافت کے مزے لوٹنے والا کلیم اللہ رحمت سے بہرہ ور ہونے والے خضر علیہ السلام کو کیسے نہ پہچانتا!

رحمت نے رحمت کو پہچان لیا۔ پہچان تو دو اجنبی روحوں میں مشکل ہوتی ہے۔ جہاں رحمت درمیان ہو۔ وہاں مشکل کیسی! وہاں تو ازلی شناسائی ہوتی ہے۔ بُعدِ زمانی اور مکانی کے پردے حائل نہیں ہو سکتے۔

علمِ الٰہی سے دونوں بہرہ ور تھے۔ موسیٰ علیہ السلام بھی اور خضر علیہ السلام بھی۔ لیکن ایک کا علم علومِ سماویہ سے متعلق تھا۔ اور ایک کا علم ارضی ہے، ایک کو بواسطۂ جبریلؑ حاصل ہوا تھا اور ایک پر براہ راست عطا ہوئی تھی۔ یہاں جبریل علیہ السلام یا کسی اور ذریعے کو درمیان نہ لایا گیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے سلسلہ میں غالباً قدرت کو یہ بتانا منظور تھا کہ ہم جبریل علیہ السلام کے واسطے کے بغیر بھی اپنے مقرّبین کے روح و قلب پر علوم کی بارش کرتے ہیں انہیں اپنے علوم سے نوازتے ہیں عطا کبھی وسیلے سے ہوتی ہے اور کبھی وسیلے کے بغیر۔ غرض موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام کو پہچاننے کے بعد اُن کی اطاعت میں رہ کر رشد حاصل کرنے کی آرزو کی تو خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ تم میری اطاعت پہ صبر نہ کر سکو گے۔

یہ اطاعت پر صبر نہ کرنے کی اطلاع دینا عین فطری تھا اس لئے کہ خضر علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام دو مختلف کوچوں کے راہ نورد تھے۔ ایک کا علم تشریعی تھا اور ایک کا تکوینی، دونوں کے مزاج میں مطابقت نہ تھی اور اسی عدمِ مناسبت کی بنا پر خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو پیش آنے والی صورتِ حال سے آگاہی بخش دی۔ راہ خواہ کوئی بھی ہو اس

ہیں مزاج کی موافقت ہی دو مسافروں کو ہم قدم اور ہم سخن رکھ سکتی ہے۔ طبیعتوں میں مناسبت نہ ہو تو مل کر دو قدم چلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب اطاعت کی شرط پوری کرنے کا یقین دلایا تو دونوں کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن جب کشتی میں سوار ہوئے تو خضر علیہ السلام نے کشتی میں توڑ پھوڑ کا عمل شروع کر دیا۔ انہوں نے اسے نامناسب سمجھ کر اعتراض کیا۔ خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔ موسیٰؑ نے اپنے بھول جانے کا عذر پیش کیا، تو دونوں مل کر روانہ ہو گئے۔ لیکن ایک مقام پر پہنچ کر خضر علیہ السلام نے معصوم بچّے کو قتل کر دیا۔ قتل موسیٰ علیہ السلام کو شاق گذرا۔ اور وہ جھٹ بول پڑے کہ آپ نے ایک معصوم جان کو بلا وجہ قتل کر دیا۔ جو بہت بُرا کام ہے لیکن خضر علیہ السلام کا جواب یہاں بھی یہی تھا کہ میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے ؛

موسیٰ علیہ السلام کو جب سابقہ وعدہ یاد دلایا گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر اس کے بعد میں کوئی سوال کروں تو آپ مجھے اپنی مصاحبت میں نہ رکھیں۔ اس بیان کے بعد دونوں کا سفر شروع ہو گیا اور خضر علیہ السلام نے ایک بستی میں پہنچ کر ایک گرنے والی دیوار کو درست کر دیا۔ حالانکہ بستی کے ساکنوں نے راہِ حق کے ان دونوں مسافروں کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر آپ چاہتے تو ان سے اُجرت طلب کر سکتے تھے آپ نے ایسے سنگ دلوں کی دیوار کو درست کر دیا۔ جنہوں نے ہمیں کھانے پینے کی چیزیں دینے سے انکار کر دیا ہے! یہ سُن کر خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میرے اور تمہارے درمیان فراق کی گھڑی ہے اب ہمیں جُدا ہو جانا چاہیئے۔

فراق دونوں کے درمیان لازمی تھا۔ اس لئے کہ دونوں میں کوئی طبعی مناسبت نہ تھی ایک کی نظر تشریع پر تھی اور ایک کی تکوین پر۔ لیکن فراق کی پیش کش چونکہ خود موسیٰ

علیہ السلام نے کی تھی اس لئے اب وہاں کا کوئی امکان تھا موسیٰ علیہ السلام جلدائی کی پیش کش نہ کرتے تو شائد یہ سلسلہ دیوار تک پہنچ کر ختم نہ ہو جاتا۔ بلکہ اور آگے بڑھتا لیکن قدرت کو یہی منظور تھا۔

کشتی سے دیوار تک کے مشاہدات سے گذرنے کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام میں تفریق ہونے لگی تو خضر علیہ السلام نے ایک ایک واقعہ کی حکمت بیان کرنی شروع کر دی۔ انہوں نے کہا کہ کشتی میں نے اس لئے توڑی تھی کہ یہ مسکین لوگوں کی تھی جن کی گذر بسر کا واحد ذریعہ یہی تھی اور دریا کے اُس پار ایک ظالم بادشاہ تھا جو کشتیوں کو بیگار میں پکڑ رہا تھا۔ میں نے اُسے اس لئے عیب دار بنا دیا کہ جب اُس کے کارندے یہ کشتی چھیننے کے لئے آئیں تو اسے ناکارہ سمجھ کر چھوڑ دیں اور ملاحوں کی گذر بسر کا ذریعہ باقی رہے۔

بچّے کے قتل کی یہ حکمت بیان کی کہ اس کے والدین ایمان والے تھے ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ انہیں طغیان و سرکشی میں مبتلا نہ کر دے۔ اور ساتھ ہی یہ فرمادیا کہ ہم نے ارادہ کیا کہ ان کا رب انہیں بہتر بچّہ عطا کر دے۔

خضر علیہ السلام کا اندیشہ بھی مقبول کا اندیشہ تھا جو غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ مقرّبین کے دل میں جو بات پیدا ہوتی ہے وہ القا و الہام کی حیثیت رکھتی ہے اور خضر کا ارادہ کس قدر مضبوط و محکم نظر آ رہا ہے کہ کسی تذبذب اور شک کے بغیر فرما رہے ہیں کہ ہم نے ارادہ کیا کہ اُن کا رب انہیں بہتر بچّہ عطا کر دے۔ کلام کے تیور بتا رہے ہیں کہ مقبول کا ارادہ قضا و قدر کے فیصلے بدل دیتا ہے آئندہ زندگی میں طغیان و سرکشی کی راہ اختیار کرنے والے بچّے کے مستقبل پر ہی اس کی نظر نہیں ہوتی۔ وہ شر کو خیر میں بدل دینے کی قوّتوں کا مالک بھی ہوتا ہے معصیت کی جگہ خیر کے دروازے کھول دیتا ہے اور گناہ کی جگہ ثواب کی جلوہ نمائی کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ قدرتیں خدا کے مقبول بندے کی ہیں جو اُسے اپنے رب کی طرف

سے عطا ہوتی ہیں اور اُن قدرتوں کے اظہار و بیان میں اُسے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی
ایک بے ہمتا اور قادر وقیّوم ذات کے عطیّات کی جلوہ گری میں بھی اعتماد، وثوق اور بیباکی
کی شان ہوتی ہے، عطیہ جس ذات کا ہوگا اُسی کی خبر دے گا۔ اُسی کی عظمتوں کو آشکار کرے
گا۔ خود بول کر کہے گا کہ میں کس کا عطیہ ہوں کس کی نوازش ہوں کس کا کرم ہوں۔ کس کا فیضانِ
جمال ہوں۔ آئینہ ہر رنگ میں صاحبِ جمال کی خبر دے گا۔ اُس کے حسن و جمال کے خدو
خال کو آشکار کرے گا۔ خضر علیہ السلام کا ارادہ اگر عطیۂ ربانی نہ ہوتا تو اُس میں یہ بے باکی
کی شان نہ ہوتی۔ موسیٰ علیہ السلام خود پکار اُٹھتے کہ تمہارے ارادے سے مشیّت کے فیصلے
کیسے بدل سکتے ہیں۔! اُن کی خاموشی ظاہر کرتی ہے کہ وہ خضر علیہ السلام کے ارادے کی اہمیت
سے واقف تھے جانتے تھے کہ مقبول کا ارادہ خدا کے ارادے کا عکس اور پَرتو ہوتا ہے،
اسی لئے انہوں نے اس باب میں کوئی سوال نہ کیا۔ اور دیوار کے سلسلہ میں یہ کہا کہ یہ دو یتیموں
کی تھی۔ جن کے والدین نیک تھے اور دیوار کے نیچے خزانہ تھا تیرے رب نے ارادہ کیا کہ
جب یہ جوانی کو پہنچیں تو خزانہ نکال لیں اور ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ یہ کام میں نے اپنی مرضی
سے نہیں کیا۔

دو یتیموں کے والدین کی نیکی کے باعث خضر علیہ السلام کی دیوار سے غیر معمولی دلچسپی
دیکھ کر بعض لوگ یہ استدلال کرنے لگے ہیں کہ ہر بزرگ کی اولاد کی خدمت ضروری ہے اور
اس سلسلہ میں وہ نیک و بد کی تمیز نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ استدلال سرے سے باطل ہے،
خضر علیہ السلام نے جن بچّوں کے والدین کی نسبت کا احترام کیا تھا وہ معصوم تھے اور اُن
سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوا تھا۔ آگے چل کر طغیان و سرکشی اختیار کرنے والے بچّے کو تو انہوں
نے ہلاک کر دیا تھا تاکہ فتنے کا دروازہ بند ہو جائے اور یہاں نسبت کے احترام کے شوق
میں بعض عقیدت مند اُن صاحب زادوں کو پوجنے لگتے ہیں جن کا وجود مستقل فتنے کی
حیثیت رکھتا ہے۔ اور جن کی کوئی ادا اسلام کے مطابق نہیں ہوتی۔ اسلام ایسی عقیدت

کا دشمن ہے، جو فتنوں کا دروازہ کھول دے، صاحب زادوں کے فسق و فجور میں اضافے کا موجب ثابت ہو۔ ایسی عقیدت و محبت کو خضر علیہ السلام کی عقیدت و محبت سے کوئی نسبت نہیں بلکہ یہ سراسر اُس تعلیم کے منافی ہے جو خضر علیہ السلام نے موسٰی علیہ السلام کو دی تھی غیر اسلامی طرزِ زندگی اختیار کرنے والے مجاوروں، سجادہ نشینوں اور پیرزادوں کی خدمت نفس و شیطان کے بندوں کی خدمت تو ہو سکتی ہے لیکن اسے بزرگوں کی اولاد کی خدمت نہیں کہا جا سکتا۔ نوح علیہ السلام کے بیٹے کو اسی لئے غیر اہل کہا گیا تھا۔ کہ اس کے اعمال غیر صالح تھے۔ شریعت کی میزان پر پورے نہ اُترتے تھے۔ دیوارِ یتیم سے استدلال کرنے والوں نے طریقت کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ شائد طریقت کا کوئی بدترین دشمن بھی نہ پہنچا سکتا۔ پیرزادگی اور مجاوری کی تمام بھیانک صورتوں نے اسی غلط عقیدت کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ عقیدت غلط رنگ اختیار نہ کرتی۔ تو فسق و فجور کی یہ گرم بازاری نہ ہوتی۔ اور فتنے کو پنپنے کا موقع نہ ملتا؛

موسٰی علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے حالات پر تبصرہ کرنے والوں نے اس وقت تک ہمارے لئے جو مواد فراہم کیا ہے اُس کے دیکھنے سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں کہ اِن سب کا جھکاؤ خضر علیہ السلام کی طرف ہے اور انہوں نے عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ موسٰی علیہ السلام کے اعتراضات درست نہ تھے لیکن ہمارا یہ نظریہ نہیں موسٰی علیہ السلام صاحبِ وحی و کتاب نبی تھے۔ وہ شریعتِ موسوی کے خلاف امور کا صدور دیکھ کر محض اس لئے خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ کہ اِن خلافِ شرع امور کا صدور ایک بزرگ ہستی سے ہو رہا ہے۔ کوئی بزرگ خواہ عرفان کے کتنے ہی اعلیٰ منصب پہ فائز کیوں نہ ہو۔ اُس سے غلطی کا صدور ناممکن نہیں۔ بزرگ ہستیوں کی اطاعت کے دائرے بھی شریعت نے متعین کیے ہیں۔ غیر شرعی امور میں کسی کی اطاعت جائز نہیں موسٰی علیہ السلام نے اگر خضر علیہ السلام کو ٹوکا تو یہ بالکل شریعت کے تقاضوں کے عین

مطابق تھا۔ اسی لئے خضر علیہ السلام نے بھی اُن کی روک ٹوک پر کسی برہمی اور ناگواری کا
اظہار کئے بغیر اگر کچھ کہا تو صرف یہ کہ میں نے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے موسیٰؑ
کے اعتراضات پر خضر علیہ السلام کی سنجیدگی خود ظاہر کرتی ہے کہ وہ اُن کی روش کو غیر محمود
نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ عین شرعی تقاضا جانتے تھے۔ خضر علیہ السلام کے باوقار اور سنجیدہ اندازِ
بیان سے جب موسیٰ علیہ السلام کو یہ معلوم ہو گیا کہ خضر علیہ السلام کا طرزِ عمل کسی اتفاقی یا
نادانستہ غلطی کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ انہوں نے یہ راہ سوچ سمجھ کر اختیار کی ہے تو انہیں معذرت
خواہی کی ضرورت پیش آئی۔ یہ معذرت خواہی بھی اس لئے تھی کہ خود خدا تعالےٰ نے
خضر علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ایک مرشد کی حیثیت سے پیش کیا تھا اگر
من جانب اللہ انہیں خضر علیہ السلام کی پیروی کا حکم نہ ہوتا تو وہ اِن خلافِ شریعت
امور کو دیکھنے کے بعد مُطلقاً عُذر خواہی کی ضرورت محسوس نہ کرتے بلکہ وہ ایک لمحہ کے لئے
بھی خضر علیہ السلام کی رفاقت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ یہ رفاقت چونکہ ربانی
حکم کے تحت تھی اس لئے انہوں نے اِن امور کو حکمت و مصلحت پر محمول کر کے خاموشی
اختیار کر لی۔ اُن کی گویائی بھی ربانی حکم کے تحت تھی اور خاموشی بھی ربانی حکم کا تقاضا!

موسیٰ علیہ السلام اور خضرؑ کے حالات سے جو لوگ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ
مُرشد کی اطاعت غیر مشروط ہونی چاہیئے۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام
کے حالات کی اہمیت اور حقیقت کو سمجھنے میں انتہائی غلطی کی ہے وہ موسیٰؑ اور خضرؑ
کے حالات سے غلط نتائج اخذ کرتے وقت اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں
کہ خضر علیہ السلام کی مرشدانہ حیثیت خود خدا تعالےٰ نے متعین کی تھی اور موسیٰ علیہ السلام
کو اُن کی اطاعت کا حکم دیا گیا تھا۔ آج ہم جس شخص کو مرشد کی حیثیت سے منتخب
کرتے ہیں یہ ہمارا اپنا انتخاب ہوتا ہے۔ اسے ربانی انتخاب سے کوئی نسبت اور
علاقہ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم جس شخص کو کامل سمجھ کر مرشد کی حیثیت سے منتخب کریں

وہ کامل نہ ہو۔ اور اُس کے زہد و اِتقا کی حیثیت محض نمائشی اور عارضی ہو۔ کیوں کہ ہمارا انتخاب غلط بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ربانی انتخاب میں غلطی کا کوئی امکان نہیں اسی لئے موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام کی پیروی کے لئے تیار ہو گئے۔ ہماری قطعاً یہ حیثیت نہیں۔ نہ ہم کسی مخصوص شخصیت کی پیروی کے لئے مامور ہیں ہم کسی مرشد سے خلافِ شرع امور کا صدور دیکھ کر خاموش رہیں تو عنداللہ ماخوذ ہوں گے اور ہماری یہ خاموشی مجرمانہ خاموشی ہو گی۔ ہمیں عابدین اور صالحین کی معروفات میں اطاعت کا حکم دیا گیا ہے منکرات میں نہیں۔ کیوں کہ ولی ولایت کے مراتب پر فائز ہونے کے باوجود معصوم نہیں ہوتا۔

موسیٰ علیہ السلام کا مزاج طبعاً تشریعی اور جلالی تھا۔ جب وہ فرعون کی گود میں لے پالک کی حیثیت سے زندگی گذار رہے تھے۔ تو ایک دن فرعون کی گود میں بیٹھے ہوئے انھوں نے فرعون کی زبان سے ایک غلط کلمہ سُن کر اُس کے مُنہ پر تھپڑ مار دیا اور اُسی جسارت کے عوض انہیں دہکتے ہوئے کوئلے منہ میں رکھنے پڑے جس کے باعث زبان جل گئی اور اُن کی زبان میں لکنت پیدا ہو گئی۔ یہ تشریعی مزاج کا ظہور تھا۔ خضرؑ کی ملاقات کے وقت وہ کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔

خضر علیہ السلام کی طرف سے کشتی میں توڑ پھوڑ کا عمل دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جس قلق و اضطراب کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ملاحوں کی زندگی میں اُس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ملتا۔ ملاح بالکل خاموش اور مطمئن نظر آتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام پریشان اور مضطرب؟

اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ملاحوں کی دُنیا موسیٰ علیہ السلام کی دُنیا سے یکسر مختلف تھی۔ ملاح خضر علیہ السلام کی دُنیا کے باسی تھے وہ خضر علیہ السلام کی رہگذر میں ہونے کے باعث تکوینی جلووں سے یک گونہ مناسبت رکھتے تھے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا تعلق

وادیٔ ایمن اور طُور کے جلوؤں سے تھا۔ انہیں تکوینی نسبت مغلوب نہ کر سکتی تھی۔ آفتاب کی تجلیوں میں رہنے والے کو چراغ کی لَو متاثر نہیں کر سکتی۔ خواہ چراغ کی لَو کتنی ہی تند و تیز کیوں نہ ہو۔ اسی لئے ملاح خضر علیہ السلام کی شخصیت سے مرعوب ہو کر خاموش ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام بول پڑے۔

خضر علیہ السلام نے جب بچے کو بڑے ہو کر طغیان و سرکشی میں مبتلا ہو جانے کے اندیشہ کے پیش نظر ہلاک کیا تھا اس کے والدین نے بھی زبانِ طعن دراز نہ کی۔ کسی قلق و اضطراب کا اظہار نہ کیا۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام یہاں بھی خاموش نہ رہے۔ بچے کے والدین خاموش ہیں اور موسیٰ علیہ السلام بول رہے ہیں۔ یہاں بھی تکوین اور تشریع کی جلوہ گری ہے خضرؑ کی دنیا سے تعلق رکھنے والے تکوینی نسبت سے بہرہ ور ہونے کے باعث بچے کی ہلاکت پر خاموش ہیں۔ اور موسیٰ علیہ السلام اِسے فعلِ قبیح جان کر خضر علیہ السلام کو ٹوک رہے ہیں۔

ایک ہی شخصیت دو مختلف قبیل سے تعلق رکھنے والے افراد کو مختلف حیثیتوں سے متاثر کر رہی ہے۔ جہاں تشریعی نسبت تھی وہ بول پڑی اور جہاں تکوینی نسبت کی جلوہ گری تھی وہاں اسی نے ظہور کیا۔ وہی اُبھر کر سامنے آئی۔ کہیں گویائی کی صورت میں اور کہیں خاموشی کے لباس میں۔

خاموشی بھی حق تھی اور گویائی بھی درست، حق جس رنگ اور لباس میں جلوہ گر ہو، حق کہلاتا ہے، حق ہوتا ہے۔ حسن جو لباس پہن لے وہ حسین بن جاتا ہے یہ لباس خواہ سادہ ہو یا رنگین، گویائی کے رُوپ میں ہو یا خاموشی کے بھیس میں۔ یار کے پیغام کو قاصد، صبا، نامہ بر اور مرغ ہی لے کر نہیں آتے یہ خاموشی کی صورت میں بھی رُوح پر وارد ہوتا ہے۔ رُوح جب یار کا پیغام سنتی ہے تو قاصد، صبا، نامہ بر اور مرغ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اسی لئے وحیِ ربانی کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک وحی بواسطۂ جبریلؑ تھی اور ایک جبریلؑ کے واسطے اور ذریعے کے بغیر،

موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت اُن کی ماں کے قلب پر جو یہ وحی نازل کی گئی تھی کہ اسے دریا میں ڈال دے۔ ہم اُسے مرسل بنا کر تیری طرف لوٹائیں گے۔ اس میں بھی کسی ذریعے کا عمل دخل نہ تھا۔ وہ براہِ راست موسیٰ علیہ السلام کی ماں کی قلب پر وارد ہوئی تھی۔ اور اسی نے انہیں تسکین کی دولت سے بہرہ ور کیا تھا۔ اور وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں پھینکنے پر آمادہ ہوگئیں۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اُن کے قلب میں یہ خطرہ راہ نہ پا سکا۔ کہ دریا میں پھینکا جانے والا بچہ نبی اور مرسل بن کر میری طرف کیسے لوٹ سکتا ہے! وہ جانتی تھیں کہ دریا کی سرکش موجوں کا خرام کسی عظیم ذات کی مشیت کا پابند ہے وہ از خود نہیں بلکہ کسی کی مشیت اور ارادے کا پَر تو ہے۔ وہ نہ چاہے تو دریا کی موجیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتیں۔ جھولے کی حرکت ماں کے محبت بھرے ہاتھ کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہاں موجوں کے جھولے کو خدا کی محبت کے ہاتھ جُنبش دے رہے تھے۔ جُنبش اِن کی تھی لیکن ہلانے والے ہاتھ کسی اَور کے تھے۔ اور ماں کی محبت اِن ہلانے والے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور یہ روحانی مشاہدہ اس لیقین کا نتیجہ تھا۔ جو انہیں وحی کی بدولت نصیب ہو چکا تھا۔

اصطلاحی زبان میں اِس وحی کو الہام کا نام دیا گیا ہے کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی نہ تھیں، مقرّبینِ حق کے قلوب جن ربانی پیغامات کو سُنتے ہیں، جن کے ذریعے اُن کی روحانی تربیت کی جاتی ہے اور انہیں ہدایت کی منزل کا مخبر اور رہنما بنایا جاتا ہے وہ سب کے سب الفاظ الہام سے تعلق رکھتے ہیں۔ قاصدوں اور نامہ بروں کی وساطت کے بغیر دوست کے جو پیغامات دوست تک پہنچتے ہیں۔ انہیں مسخروں اور بہروپیوں کی ہفوات اور نعرہ زنی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ دوست کے قلب کی تجلی دوست

ہی کے قلب پر برق بن کر گرتی ہے۔ محمود کی نگاہوں کا تبسم اپنی جلوہ ریزی کے لئے ایاز ہی کو منتخب کرے گا۔ دھنیوں اور گھسیاروں کے حصہ میں یہ دولت نہیں آسکتی۔ دھنیا ایسا دعویٰ کرے گا۔ تو کاذب سمجھا جائے گا۔ نظر کے تیر، نظر کے اسرار، نظر کی معرفت اور نظر کی مئے تو دوستوں کا حصہ ہوتی ہے۔ صید اپنے صیاد کا غماز ہوتا ہے۔ اسی کی عظمتوں کو آشکار کرتا ہے اور اسی کو دیکھ کر صیاد کی عظمتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خضری علوم جن سے روشناس کرانے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو خضر علیہ السلام کے پاس بھیجا گیا تھا۔ کوئی حسّی یا عقلی علوم نہ تھے۔ بلکہ اُن کا تعلق علم لدنی سے تھا۔ جس کا نزول روح و قلب پر ہوتا ہے۔ حسیات کے علوم عالمِ محسوسات تک محدود ہوتے ہیں اس سے آگے اُن کا گذر ممکن نہیں ہوتا۔ وہ تو آج تک رُوح کی حقیقت و ماہیت ہی کو نہیں سمجھ سکے رُوح کے علوم کو کیا سمجھ سکیں گے۔

خضری علوم کے سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ خضر علیہ السلام کو بے گار میں کشتیاں پکڑنے والے بادشاہ کا کسی نہ کسی ذریعے سے علم ہو گیا ہو اور انہوں نے اسی اندیشے کے پیشِ نظر ملاحوں کے سفینے کو توڑ دیا ہوتا۔ کہ وہ محفوظ رہ سکے۔ لیکن یہاں اس کا بھی کوئی قرینہ نظر نہیں آتا۔ اور بچے کے قتل کا واقعہ تو خالصتاً ایسا واقعہ ہے جو کسی صورت میں بھی انسانی گرفت میں نہیں آسکتا۔ کوئی اِنسان کسی بچے کے بلوغ کی منزل میں داخل ہونے کے بعد طغیان وسرکشی میں مبتلا ہونے کی حتمی طور پر خبر نہیں دے سکتا۔ یہ واقعہ خالصتاً غیبی امور سے تعلق رکھتا ہے اور دیوار کے نیچے خزینے کا علم بھی غیبی امور سے متعلق ہے۔

یہی غیبی امورِ سے آگاہی اور ان کے اثمار و نتائج پہ گہری نظر کا ہونا خضر علیہ السلام کے روحانی وجدانی اور عرفانی علوم کی کرشمہ سازی تھی، جس نے موسیٰ علیہ السلام کو حیرت میں ڈال دیا۔ اور وہ اس کے متعلق طرح طرح کے شکوک وشبہات کا اظہار کرنے لگے۔

غیب کی خبر خواہ وہ مستور حقائق سے تعلق رکھنے والی ہو یا اس کا تعلق پیش آنے والے واقعات و حادثات سے ہو، ولی کو اس سے خبردار کر دینا اور آگاہی بخش دینا رب تعالیٰ کی قدیمی سنّت ہے اور یہ سلسلہ موسیٰ علیہ السلام کے عہد کے خضر علیہ السلام تک ہی محدود نہیں۔ امّتِ محمدیہ کے اولیاء کو بھی اس سے حصہ ملتا ہے خضری صفات جن سے خضر علیہ السلام متصف تھے وہ کلامِ الٰہی کی شہادت کے مطابق عبودیت، رحمت اور علمِ لدنّی تھا علمِ لدنّی کو خدا تعالیٰ نے اپنے آخری اور محبوب نبیؐ پر نازل ہونے والے کلام میں عبودیت اور رحمت کے بعد بیان کیا ہے جس کا واضح طور پر یہ مطلب ہے کہ علم لدنّی عبودیت کے مقام پر فائز ہونے کے بعد رحمت سے نوازے جانے والے کو نصیب ہوتا ہے عبودیت ناقصہ ہو اور رحمت اُسے اپنی آغوش میں نہ لے تو علم لدنّی نصیب نہیں ہو سکتا۔

ظن و قیاس اور فہم و ذکا سے کام لینے والے کا علمِ ظنّی اور قیاسی ہوتا ہے لیکن پروردۂ وحی و الہام کا علمِ ظن و قیاس کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ وہ وحی و الہام کا فیضان کہلاتا ہے۔ اس میں یقین و اعتماد کی تسکین ہوتی ہے۔ جس میں شک و شبہ کا گذر ممکن نہیں ہوتا اس میں غلطی کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ پروردۂ وحی اور پروردۂ الہام کے علوم کی حیثیتیں چوں کہ یکسر مختلف تھیں۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام جو پروردۂ وحی تھے انہیں خضری علوم کی دستوں کا مشاہدہ کرانے کے بعد یہ واضح کیا گیا کہ الہام بھی بے حقیقت چیز نہیں۔ اس کی وسعتیں بھی بے اندازہ ہیں۔ اس دریا کے شناوروں کا علم بھی ہمارے جود و کرم کا آئینہ ہے اس آئینہ میں تم ہماری صفات کی جلوہ گری دیکھ سکتے ہو۔ جلوہ یہ بھی دلفریب ہے نظارہ یہ بھی ہوش رُبا ہے، حسن، جلوے میں بھی ہے اور نظارے میں بھی، اور دل کشی اور دل رُبائی ہر جگہ موجود ہے ہر جگہ پَرتو افگن اور ضیا ریز ہے انکار کسی کا بھی ممکن نہیں بشرطیکہ چشمِ بینا موجود ہو۔

حقائق کے چہرے سے نقاب کشائی کرتے وقت خضر علیہ السلام نے جو اسلوب بیان

اختیار کیا تھا وہ کسی عامی اور حقیقت سے بے خبر انسان کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ صہبا تند و تیز ہو تو جام بھی نظر نواز ہونا چاہیئے۔

یہاں صہبا بھی جاں گداز ہے اور جام بھی جاں افروز کشتی توڑنے کی نسبت خضرؑ نے اپنی ذات کی طرف کی۔ یہ کہا کہ میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار بنا دوں۔ اور بچّے کو قتل کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم ڈرے۔ اور دیوار کے سلسلہ میں نہ "میں" ہے نہ "ہم"، بلکہ یہاں یہ کہہ کر اپنی ذات کی کلیتہً نفی کر دی کہ یہ کام میں نے اپنے ارادے سے نہیں کیا۔

کشتی توڑنے، بچّے کو ہلاک کرنے اور دیوار کی درستگی کرنے والی ذات ایک ہے تینوں کے فاعل خضر علیہ السلام ہی لیکن ضمائر مختلف ہیں۔ کہیں "میں" ہے کہیں "ہم"، اور کہیں اپنی ذات کی کلیتہً نفی پائی جاتی ہے جیسے اس امر سے خضر علیہ السلام کا تعلق ہی نہیں۔ کرنے والا کوئی اور ہے اور اس کی طرف خضر علیہ السلام کا اشارہ بھی موجود ہے،

بات دراصل یہ ہے کہ سلوک کی راہ میں انسان کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک حالت یہ کہ وہ عالمِ ناسوت ہی میں رہ کر کام کرتا ہے۔ یہ ناسوتی کیفیت چنداں حیرت انگیز نہیں ہوتی۔ دوسری حالت یہ ہے کہ انسان کا ارادہ مشیّتِ ایزدی کے تابع ہو اور تیسری حالت میں انسان کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ ارادہ اسی ذات کا ہوتا ہے جس کی حکمت و مصلحت اور قوّت کارفرما ہو۔

خضر علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کو ان تینوں کیفیتوں کا مشاہدہ کرا رہے تھے۔ کشتی توڑنے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے "میں" کہا، اور بچّے کے قتل کا واقعہ چونکہ ناسوتی دُنیا سے تعلق نہ رکھتا تھا بلکہ ایک ایسی دنیا سے تعلق رکھتا تھا جس میں بندے کے ساتھ ایک نظر نہ آنے والی قوّت و طاقت بھی ہوتی ہے اسی لئے انہوں نے یہاں "ہم" کا لفظ بولا جس

کے واضح طور پر یہ معنی تھے کہ بچّے کے قتل میں میں تنہا نہیں۔ میرے ساتھ کوئی اور قوّت بھی شریک ہے۔ جو پسِ پردہ رہ کر بھی اپنی قوّتوں کی جلوہ نمائی کرنے پر قادر ہے۔ تیسرا مقام وہ تھا۔ جہاں سالک کی ہستی ذاتِ احدیت کے ارادے میں گم ہو جاتی ہے۔ اس کا اپنا کوئی ارادہ نہیں رہتا۔ ارادہ اسی کا ہوتا ہے جو غالب ہو، قوی ہو، توانا ہو، بندہ تو صرف مشیّتِ ربانی کا مظہر بن جاتا ہے یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق حدیث شریف میں یہ وضاحت موجود ہے کہ بندہ جب تقرب کے اِس منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ تو میں اس کی آنکھ، کان، زبان، ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں۔ میری ہی قوّت سے دیکھتا ہے۔ میری ہی قوّت سے بولتا ہے، میری ہی قوّت سے سنتا ہے، میری ہی قوت سے چلتا ہے اور میری ہی قوّت سے پکڑتا ہے۔ اس وقت اگرچہ انسان کی گرفت بظاہر انسان کی گرفت ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ خُدا کی گرفت کہلاتی ہے۔ دستِ قدرت اور زبانِ قدرت بننے کے بعد انسانی قوّتیں کارفرما نہیں ہوتیں بلکہ انسان کے پیکر میں ربانی قوّتوں کی جلوہ نمائی ہوتی ہے۔

خضر علیہ السلام بھی ناسوت سے چل کر لاہوت تک پہنچے تھے۔ ناسوتی سفر جو خدا کی مشیّت اور ارادے سے شروع کیا گیا تھا لاہوت کی منزل پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔ کشتی میں خضر علیہ السلام تھے اور دیوار کے سائے میں خدا کا سایہ۔ خُدا کا ارادہ، خدا کی مشیّت، خدا کی رضا اور خدا کی قوّت، اس مقام سے آگے چونکہ کوئی اور مقام نہیں صرف صاحبِ مقام ہی ہے اسی کا نور اور جمال ہے۔ اسی کا جلال و جبروت ہے اسی کی یکتائی اور وحدت ہے اسی کے جلوؤں کی فراوانی اور حیرت زائی ہے۔ اسی لئے خضرؑ اور موسٰی علیہ السلام میں تفریق ہو گئی۔

اس لئے کہ تکمیل کے بعد جدائی لازمی تھی۔ ناسوتی جلوؤں سے لاہوتی جلوؤں تک پہنچانے کے بعد خضر علیہ السلام جُدا ہو گئے۔ ملاپ میں حسین تھا اور فراق بھی حسین، آغاز

بھی خوش آئند تھا اور انجام بھی مبارک، یمن و سعادت کا جو سفر شروع ہوا۔ وہ یمن و سعادت ہی پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ اس سفر کی ہر ساعت رضائے دوست کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی؛

موسیٰ علیہ السلام نے رشد کے حصول کی شرط پر خضر علیہ السلام کی اطاعت قبول کی تھی لیکن خضر علیہ السلام نے کشتی کو توڑنا شروع کر دیا، بچّے کو مار ڈالا اور دیوار کی دُرستگی میں لگ گئے،

بظاہر یہ تینوں امور رشد سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ رشد و ہدایت کی تعلیمات کے سراسر منافی نظر آتے ہیں۔

رشد و ہدایت کی دنیا کو صرف الفاظ کی دُنیا تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ رشد قولی بھی ہوتا ہے اور فعلی بھی، کبھی زبان سے تعلیم دی جاتی ہے اور کبھی حال متکلم بن جاتا ہے، حال کی تعلیمات قال کی تعلیمات پر فوقیت رکھتی ہیں اُن کا اثر زائل نہیں ہو سکتا۔ روح و قلب میں پیوست ہو کر رہ جاتا ہے۔

انبیاءؑ اور اولیاء کی صحبت میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے والوں کو اسی لئے فوقیت حاصل ہے کہ وہ حال و قال دونوں سے بہرہ ور تھے اور دوسروں کو یہ دولت نصیب نہیں وہ صرف قال کو رہبر بنا کر سفر اختیار کرتے ہیں اسی لئے اس میں غلطی کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ قال صحیح رہنمائی بھی کر سکتا ہے اور گمراہیوں میں مبتلا کر دینے کا موجب بھی بنتا ہے حال کی یہ صورت نہیں ہوتی۔ حال سراسر نور ہے۔ رحمت ہے، جادہ ہے اور منزل ہے۔

صحابہؓ کی تربیت حضورؐ کے حال نے کی تھی۔ حال ہی اُن کا مربّی تھا۔ اور حال ہی رہنما جس صحابیؓ کو جمالِ رسولؐ مل گیا وہ ہادی بن گیا۔ منزلیں سمٹ کر اس کی آغوش میں آگئیں، قال والوں کو حال کی دولت نصیب نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ قال کے کتنے ہی اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز کیوں نہ ہوں

حال بہر حال، حال ہے اور قال، قال۔ قال میں بھی اگر حال کی طرح کایا پلٹ دینے کی صلاحیت موجود ہوتی۔ تو گمراہیاں اس قدر نہ پھیلتیں۔ قال، قال عطا کرتا ہے اور حال، حال میں مبتلا کر دیتا ہے۔ حال میں مبتلا ہو جانے کے بعد بھولنے بھٹکنے کے امکانات نہیں ہوتے۔ اور قال میں ہر قدم پر لغزش کا امکان موجود ہوتا ہے۔ قال کو لے کر فکر و خیال کی شعبدہ بازیاں دکھانے والے خواہ کیسے بھی ماہرِ فن کیوں نہ ہوں وہ اُن لوگوں کے مثیل و مماثل نہیں ہو سکتے جو حالِ رسولؐ میں ڈوب کر زندگی کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ حال کی لذتیں جُدا ہیں اور قال کی جُدا، ایک فانی ہے اور ایک باقی۔ حال کا تاثّر قال کی آندھیوں اور جھکڑوں سے بھی زائل نہیں ہوتا۔ قال کا کیا ہے! اُس کی مثال تو اُن تنکوں کی ہے جو ہوا کے ہر تند و تیز جھونکے کے ساتھ اُڑنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔

خضرؑ کی تعلیمات بھی حالی تعلیمات تھیں۔ حال کے ذریعے موسیٰ علیہ السلام کو سیر کرائی گئی تھی قال کی ضرورت پیش آئی بھی تو حال کے بعد، اور جو قال، حال کے بعد نصیب ہو، اُس کی شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ اُس میں چوں چرا کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی، حال، حال سے آشنا کر دیتا ہے اور قال اُس کا مفسر اور مصدِق بن جاتا ہے۔ قال کی وہی تفسیر معتبر ہوتی ہے جو حال میں مبتلا ہونے کے بعد کی جائے۔ ورنہ قال ظن و قیاس رہ جاتا ہے اور یقین کی دنیا میں ظن و قیاس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

رشد و ہدایت کی تعلیم دینے والوں میں کم از کم اتنی صلاحیت تو ضرور ہونی چاہیئے کہ وہ آنے والے کو بہ یک نظر دیکھ کر یہ اندازہ لگا سکیں کہ اُس کے طبعی میلانات و رجحانات کیا ہیں! اس کی طبعی مناسبت حال سے ہے یا قال سے۔ آنے والے کی طبعی مناسبت کا لحاظ کئے بغیر جو تعلیم دی جائے گی وہ اُس کی طبیعت سے مناسبت نہ رکھنے کے باعث انشراح پیدا کرنے کی بجائے الٹا تکدر کا موجب بن جائے گی۔ اور تعلیم و تربیت کے وہ مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے۔ جو تعلیم و تربیت کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔

اسے خضر علیہ السلام کی بالغ نظری کہیے یا علمِ لدنی کی کرشمہ سازی، کہ انہوں نے موسٰی علیہ السلام کو دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ ان کا طبعی رجحان قال سے زیادہ حال کی طرف ہے۔ یہ موسٰی علیہ السلام کی حال کا مشاہدہ کرنے کی تڑپ اور جستجو ہی تھی جو انہیں کھینچ کر کوہِ طور پر لے گئی۔ اور وہ طالبِ دیدار بن کر برقِ جمال کو کوندنے اور جلوہ ریز ہونے کی دعوت دینے لگے۔ برقِ جمال گری اور طور کے شرارے اُڑ گئے۔

قال سے حال میں آنے کی یہ سعی و کوشش اُن کا فطری تقاضا تھا اسی لئے تقاضے میں شدّت بھی تھی اور جمالِ یار نے بھی اُن کے احساسات کی پاسداری کی۔ بے پردہ ہو کر طُور پر اتر آیا۔ اُترا کون تھا! جمالِ دوست، حسنِ دوست، عکسِ دوست، جلوۂ دوست۔ اور یہ کیوں! کس لئے! کسی کی خاطر! کس کے سوزِ آرزو نے حسن کو نقاب کشائی پر آمادہ کیا تھا! یہ حسن و عشق میں طبعی مناسبت ہی تو تھی جو رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی۔ ورنہ طور کے کھُردرے پتھر بھی حسن کی جلوہ گاہ بن سکتے ہیں!

پکارنے والے کی طلب صدّیق ہو تو حسن کو بے آب و گیاہ وادیوں میں بھی لے آتی ہے

الغرض طُور کا حادثہ خواہ خضر علیہ السلام کی ملاقات سے پہلے ظہور پذیر ہوا ہو یا بعد میں، دونوں صورتوں میں خضر علیہ السلام کی بالغ نظری مسلم ہے۔

اگر یہ ملاقات سے پہلے ظہور پذیر ہو چکا تھا تو انہوں نے اُن کے مزاج کی رعایت برت کر مشاہدات کے ذریعے رشد کی تعلیم کا آغاز کیا۔ اور اگر بعد میں ہونے والا تھا۔ تو پھر بھی طبعی میلان کو نظر انداز نہیں کیا۔ تعلیم قال کے ذریعے نہیں دی۔ بلکہ حال سے سلسلہ جنبانی کی۔ سفینے کی شکست بچّے کی ہلاکت اور دیوار کی درستگی سراسر حال ہے اور اس حال کی محرک موسٰی علیہ السلام کی حال سے طبعی مناسبت تھی۔ قال کی لذت چکھنے کے بعد وہ جمالِ دوست کا حال معلوم کرنا چاہتے تھے اور یہی تڑپ، کشتی، بچّے اور دیوار کے مشاہدات کے ظہور پذیر ہونے کا موجب بنی تھی۔

حال سے موسٰی علیہ السلام کا یہ والہانہ شغف نہ ہوتا تو شائد خضر علیہ السلام بھی حال میں مبتلا نہ ہوتے۔ اُن کی دنیا بھی قیل و قال تک محدود رہتی۔ نہ کشتی ٹوٹتی، نہ بچہ ہلاک ہوتا اور نہ انطاکیہ کی بستی کی دیوار بنتی۔ تینوں مظاہر موسٰی علیہ السلام کی حال سے والہانہ نسبت کا اثر اور نتیجہ ہیں جو ایک طرف موسٰی علیہ السلام کی مشاہدہ سے نسبت کی غمازی کرتے ہیں تو دوسری طرف خضر علیہ السلام کی بالغ نظری کے آئینہ دار بھی ہیں۔

خضر علیہ السلام کی تمام تر تعلیم موسٰی علیہ السلام کے حسب حال تھی اسی لئے انہوں نے تعلیم کا آغاز سفینے کی شکست سے کیا۔

موسٰی علیہ السلام جب کتمِ عدم سے معرضِ وجود میں آئے تو فرعون کے ہلاک کر دینے کے اندیشہ کے پیشِ نظر انہیں صندوق میں بند کر کے دریا میں پھینک دیا گیا تھا۔ اور دریا کا پانی ایک نہر کے ذریعے انہیں فرعون کے محل میں لے گیا۔ فرعون اور اس کی بیوی آسیہ نے صندوق پکڑ کر جب توڑا تو اندر سے موسٰی علیہ السلام برآمد ہوئے۔ موسٰی علیہ السلام کی حیات صندوق کی شکست میں مضمر تھی۔ صندوق نہ ٹوٹتا تو موسٰی علیہ السلام کو زندگی نہ ملتی، وہ زندہ نہ رہتے، صندوق کی شکست کے باعث انہیں دوبارہ زندگی نصیب ہوئی اور ایسے ہی سفینے کی شکست میں ملاحوں کی زندگی مُضمر تھی وہ اسی کے ذریعے زندگی کا سامان حاصل کر رہے تھے۔

صندوق کی شکست سے موسٰی علیہ السلام کی زندگی کا نیا آغاز ہوا۔ یہ اُن کی زندگی کا پہلا غیر معمولی واقعہ تھا۔ اسی لئے خضر علیہ السلام نے سفینے کی شکست سے تعلیم کا آغاز کیا۔

موسٰی علیہ السلام کی زندگی کا دوسرا اہم ترین واقعہ ایک نوجوان قبطی کی موت ہے جو ایک مشرکانہ کلمہ کہنے کے باعث موسٰی علیہ السلام کے قہر و غضب کا مورد بنا تھا۔ موسٰی علیہ السلام نے اُسے مُکہ مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اور یہاں خضر علیہ السلام ایک بچے

کو ہلاک کر رہے ہیں۔

مدین کی سرزمین میں جب وہ ایک مسافر کی حیثیت سے پہنچے تو انہیں دو لڑکیاں پریشان کھڑی نظر آئیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ہم شعیب علیہ السلام کی بیٹیاں ہیں۔ ہمارا بوڑھا باپ بکریاں چرانے کے قابل نہیں اور یہ فریضہ ہم سرانجام دیتی ہیں۔ مدین کے چرواہے جب اپنی بکریوں کو پانی پلا کر چلے جاتے ہیں تو ہم اُن کا بچا کھچا پانی اپنی بکریوں کو پلا دیتی ہیں لیکن آج پانی نہیں بچا۔ کنوئیں کا بھاری بھرکم ڈول جسے چرواہے مل کر نکالتے ہیں ہماری قوت و مقدرت سے بالا ہے۔ ہم اُسے کھینچنے کی سکت نہیں رکھتیں، اور اس فکر میں مبتلا ہیں کہ پیاسی بکریوں کو کیسے پانی پلائیں؛

یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے پانی نکال دیا اور لڑکیوں سے کوئی اُجرت طلب نہ کی۔ اُن کی یہ فی سبیل اللہ خدمت ہی اُن کی فائز المرامیوں کا موجب بنی۔ شعیب علیہ السلام نبی کا دروازہ اُن کے لئے کھُل گیا۔ یہی دروازہ اُن کے لئے رحمت و بخشش کا دروازہ تھا جسے موسیٰ علیہ السلام کی طلب تھی۔ موسیٰؑ کا انتظار تھا۔ موسیٰ علیہ السلام آ گئے۔ تو دروازہ کشادہ ہو گیا۔ اس کی مراد بر آئی۔ تمنّا پوری ہو گئی۔ بے لوث خدمت کے جذبے کے ظہور نے اِس دروازے کو کھولا تھا۔ اُن کے پیشِ نظر شعیب علیہ السلام کا احترام بھی تھا۔ شعیبی نسبت ہی نے اس طرف رہنمائی کی تھی۔

اور خضر علیہ السلام بھی دو بچوں کے والدین کی صالحیت کی نسبت کے پیشِ نظر دیوار درست فرما رہے ہیں۔ اُن کے پیشِ نظر نسبت کے احترام کے سوا کوئی اور چیز نہیں وہاں دو معصوم لڑکیاں تھیں۔ اور یہاں دو معصوم بچے ہیں معصومیت کی نسبت دونوں

جگہ برقرار ہے۔ دو کی تعداد بھی موجود ہے اور نسبت کا احترام بھی، ایک جگہ شیعیی نسبت کی صورت میں اور ایک جگہ صالحیت کی نسبت کی صورت میں، اُجرت کا سوال نہ ملا تھا اور نہ یہاں ہے۔ ایک جگہ نبوت کی نسبت ہے اور ایک جگہ ولایت کی۔ اسی لئے ایک ولی نے جنہیں خضر علیہ السلام کا نام دیا گیا ہے یہاں پہنچ کر معاملہ ختم کر دیا۔ کیوں کہ تینوں نسبتوں کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ اور اب مزید کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔

بندگی اور خواجگی

کافر و مشرک اور فاسق و فاجر انسان کی تمام زندگی شکوہ طرازی اور گلہ گذاری میں صرف ہو جاتی ہے، وہ اپنے رب سے لڑنے جھگڑنے میں مصروف رہتا ہے اور اسے زندگی کا وہ سکون میسر نہیں ہوتا۔ جو رضا کے بندوں کو نصیب ہوتا ہے سکون جنگ میں نہیں، صلح میں ہے اور غالب اور توانا ذات سے اسی صورت میں صلح ہو سکتی ہے کہ اس کی بالادستی کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے فیصلوں کا احترام کیا جائے اور اُن میں مین میخ نکالنے کی خو ترک کر دی جائے۔ کسی بھی صاحب اختیار کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ اُس کے زیرِ سایہ زندگی گذارنے والا انسان اُس کے فیصلوں کو قابلِ تسلیم نہیں سمجھتا۔ اور اطاعت کے لئے یہ شرط لگا رہا ہے کہ وہی حکم مانوں گا۔ اسی کی اطاعت کروں گا۔ جو میری عقل کے مطابق ہو۔ میرے ذوق و وجدان کو نہ کھٹکے۔ اور اس کے ذریعے میرے مفادات کو نقصان پہنچنے کا کوئی امکان نہ ہو۔ تو ایسی اطاعت گذاری۔ کو وہ اس کے منہ پہ دے مارے گا۔ اور اُسے اطاعت گذاروں کی صف سے نکال کر باغیوں اور سرکش الف لوگوں کے زمرے میں شامل کر دے گا۔ ہر اختیار کا خاصا اپنی برتری کا اعلان و اظہار

ہوتا ہے، خواجہ، بندہ کو اپنی رضا میں شریک کر لیتا ہے اپنے اختیارات کی بے پایاں وسعتوں کے باوجود اس کے احساسات کی نزاکتوں کی رعایت بھی برتنے لگتا ہے۔ لیکن یہ مقام ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہ اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب بندہ اپنی دلربائیوں سے خواجہ کے دل میں جگہ پیدا کرے۔ اُس کا دِل موہ لے، اور اُس کی اطاعت گذاری کو اپنی زندگی کا شعار بنالے۔ وہ چیز اُسے مرغوب ہو۔ جسے خواجہ پسند کرے، اور اسی کو اپنے لئے ہلاکتوں کا موجب جاننے لگے۔ جس کے اختیار کرنے سے خواجہ کی ہلکی سی برہمی کا بھی امکان ہو سکے،

رضا کے اس مرتبے پر فائز ہونے کے بعد بندے کو اپنی ضرورتوں کے اظہار و بیان کے حاجت نہیں رہتی۔ خواجہ کا کرم بندے کی پوری زندگی پر محیط ہو جاتا ہے۔ اس کے احساسات کی رعایت بھی برتی جاتی ہے اُس کے جذبات کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ اور اُسے وہ اختیارات بھی تفویض کئے جاتے ہیں۔ جو قُرب خاص کی علامت بن جاتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر صاحبِ اختیار کے مقام و مرتبے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور دنیا کے لئے یہ جاننا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ اس بندے کو خواجہ کی بارگاہ میں کیا مقام نصیب ہے! اِسے قُرب کا کون سا مرتبہ حاصل ہے! یہاں اس بات کو بطورِ خاص ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ کہ بندہ بندگی کی تکمیل کے بعد خواجہ کا کیسا ہی قُرب حاصل کیوں نہ کرلے۔ اُس کی نگاہوں میں کتنا ہی محبوب کیوں نہ بن جائے اُسے یہ زیبا نہیں دیتا کہ اپنے اختیارات کی وسعتوں کا اعلان کرتا پھرے۔ اور ہر کہ و مہ کے سامنے یہ کہتا پھرے کہ مجھے خواجہ کے مزاج میں دخل حاصل ہے جو چاہوں اُس سے منوالوں۔ بندے کے مقام و مرتبے کا اعلان خواجہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ بھکڑ دلے اور لاف گزاف مارنے والوں کو تو دنیا کا کوئی ذی اختیار بھی اپنی بارگاہ میں جگہ نہیں دیتا۔ خدا تعالےٰ سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ بات بات میں نعرہ زنی

کرنے والوں کو اپنی عالی بارگاہ میں جگہ دے گا۔

کرامت اور معجزہ بھی انہی اختیارات کا دوسرا نام ہے جو انبیأ علیہ السلام اور اولیاءٔ کی عظمتِ شان کو آشکارا کرنے کے لئے انہیں دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے ظہور کا بھی ایک خاص وقت ہوتا ہے۔

خدا تعالیٰ جب چاہتا ہے ضرورت کے تحت اُن کا اظہار کر دیتا ہے تاکہ اُس کے مقرّبین کا قرب ظاہر ہو سکے۔ اور منکرینِ حق سے مقابلے کے وقت اُن کی آبرو پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔ خرقِ عادات کا ظہور کبھی حق کے غلبہ کے لئے ہوتا ہے اور کبھی محبوبیت کی شان واضح کرنے کے لئے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں فاعلِ حقیقی اللہ کی ذات ہوتی ہے۔ مقرّبین کو تو اِن کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے۔ اور یہ اجر ہوتا ہے اُس اطاعت گزاری اور جاں سپاری کا، جو خدا کے بندوں کو راہِ حق میں نصیب ہوتی ہے۔ اطاعت ہی قرب عطا کرتی ہے اور اطاعت ہی قرب کے انعامات سے نوازتی ہے۔ عطا بھی اُدھر سے ہوتی ہے اور نوازش بھی، عطا کو اپنی رضا کے تابع نہیں بنایا جاسکتا وہ تو سینے سے لگانے والی چیز ہے۔ خواہ کسی رنگ اور رُوپ میں ظاہر ہو۔ اُس کا ظاہر بھی دل فریب معلوم ہوتا ہے۔ اور باطن بھی، اور عطا پالینے والا دونوں سے لذت یاب ہوتا ہے۔ عطا کا خاصہ ہی لذت ہے۔ اگر وہ لذّت نہ دے تو عطا نہیں، ورد مزا دے تو عطا ہے اور راحت کی زندگی میں چین نصیب نہ ہو تو عذاب ہے۔

عرفان کی منزل

فضیلؒ ابن عیاض اسی قافلۂ شوق کے حدی خواں ہیں جسے حسنؒ بصریؒ نے ترتیب دیا تھا۔

حسن بصریؒ کا جذب و شوق علیؓ ابن ابی طالب کا عطیہ تھا۔ انہوں نے براہِ راست علیؓ ابن ابی طالب سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ اور یہی فیضان اس قافلۂ شوق کا زادِ سفر تھا جس کی منزل دُنیا کے مسافروں کی منزل سے جدا گانہ تھی۔ دنیا کے مسافر ساز و سامان کے بل بوتے پر سفر اختیار کرتے ہیں اور عشق تنہا زمزمہ خوان ہوتا ہے۔

زمزمہ خوانی اُس کی متاع ہے وہ اپنے نغمہ کے سوز سے ہمسفر بھی پیدا کر لیتا ہے۔ اور ہمنوا بھی، حدی خوانی ہر مسافر کا حصہ نہیں ہوتی۔ حدی خوانی کے سوز سے لذت گیر ہونے کی صلاحیت مل جائے تو یہ بھی ایک بڑی دولت ہے۔ لذت میں قدم بھی تیز اُٹھتے ہیں۔ اور راہ کی صعوبت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ بے ذوق راہی نہ نغمہ سے کیف گیر ہو سکتا ہے نہ راہ کی صعوبتوں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ یہ تو لذت ہی کی خاصیت ہے کہ وہ مستیاں عطا کرتی ہے ماحول سے بے گانہ بنا دیتی ہے۔

فضیل ابنِ عیاض جب راہِ شوق میں گامزن تھے۔ تو ایک شام اُن کی ملاقات اپنے عہد کے ایک نامور بزرگ سفیانؒ ثوری سے ہو گئی۔ سفیانؒ ثوری نے انہیں ٹھہرا لیا اور دونوں کے درمیان رات بھر گفتگو ہوتی رہی۔ صبح کے وقت جب دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہونے لگے تو سفیانؒ ثوری نے فرحت و انبساط کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج کی رات بڑی مسرتوں اور کیفیتوں کی رات تھی۔ لیکن فضیلؒ ابن عیاض نے مغموم لہجہ میں جواب دیا کہ آج کی رات بڑی تکلیف دِہ اور پریشان کن تھی۔ خدا زندگی میں ایسی رات کبھی نہ دکھائے!

یہ تاثر سفیانؒ ثوری کی توقع کے خلاف تھا۔ وہ حیران ہو کر بولے! یہ رات کیوں تکلیف دِہ تھی! میں تو اسے زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں۔"

فضیل ابن عیاض نے جواب دیا کہ" رات بھر آپ کی یہ کوشش رہی ہے۔ کہ

آپ مجھے راضی کر سکیں۔ میں آپ کو خوش کرنے میں معروف رہا ہوں۔ آپ کا مقصود میری رضا تھی، اور میرا مقصود آپ کی رضا، خدا کی رضا کہاں گئی! ہم دونوں اگر یک جا جمع نہ ہوتے، تو رات بھر دونوں کا مقصود خدا کی رضا ہوتا۔"

تحویلِ قبلہ

حضور علیہ السلام اپنی مکی زندگی میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ کعبہ حضورؐ کا قبلہ اُس وقت بنا جب حضورؐ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے۔ اور یہ تحویلِ قبلہ حضورؐ کی اُس خواہش کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئی جو سینۂ نبوت میں موجود تھی۔ حضورؐ کبھی کبھار امید بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم آجائے۔ دعا کبھی نہ مانگی۔ آخر یہی ادا قبول ہوئی، جس رحمت پہ نظریں تھیں۔ وہ ہی وحی بن کر نازل ہوئی۔ تحویلِ قبلہ کا حکم آگیا۔ طلب خاموش تھی۔ لیکن عطا گویائی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ عطا کو گویائی کس نے بخشی! اسی طلب نے جو بے زبان تھی۔ جو حرف و صوت سے آشنا نہ تھی۔ ذات سے آشنائی ہو تو بے زبانی بھی مزا دے جاتی ہے۔ دل، دل کے مفاہیم جان لیتا ہے، خاموشی کی زبان سمجھ لیتا ہے۔ دِقت تو نا آشنا کی زبان سمجھنے میں پیش آتی ہے! وہ وضاحت بھی کرے تو اکثر اوقات مفہوم مغلق ہو کر رہ جاتا ہے۔

انسان کمالِ فہم و فراست کے باوجود مزید وضاحت چاہنے پہ مجبور ہوتا ہے آشنائی میں وضاحت نہیں ہوتی۔ اشارے اور کنائے ہوتے ہیں اور یہی اشارے کنائے محبت کی جان کہلاتے ہیں کیوں کہ اُن ہی سے دو رُوحوں کے باہمی تعلق اور ربط کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قرآن ایک اجمالی کتاب ہے اس میں احکام کی تفصیل نہیں۔ اس لئے کہ حضورؐ اپنے رب کی زبان سمجھتے تھے۔ زبانِ نبوت اجمال کو تفصیل کی صورت عطا کر دیتی تھی،

یہی حال محدثینؒ اور مفسرینؒ کا ہے ذات کی آشنائی نے انہیں کبھی اغلاق و ابہام میں مبتلا نہیں ہونے دیا۔ اشارہ پاکر انہوں نے علم و عرفان کے دریا بہا دیئے۔ محبت حبیب مفسر بن کر ظاہر ہوتی ہے تو صفحے کے صفحے اور دفتر کے دفتر بھر کر بھی اُس کے ذوق کی سیرابی نہیں ہوتی۔ ہر مقام پر پہنچنے کے بعد یہی سمجھتی ہے، کہ جمالِ دوست کی تفسیر نہیں ہوسکی۔ اشارہ ناتمام رہ گیا۔ وہ تفسیر کرتے وقت محجوب ہوتی ہے اپنی بے بسی کا اعتراف کرتی ہے۔ عارفِ رُوم کا یہی احساس اُن کے اس شعر میں جلوہ گر ہے؛

یک دہاں خواہم بہ پہنائے فلک
تا بگویم شرحِ آں رشکِ ملک

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں ملّتِ ابراہیمی کا قبلہ وہی خانۂ خدا تھا جسے باپ اور بیٹے نے انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ تعمیر کیا تھا۔ بعد میں یہود و نصاریٰ کا قبلہ بیت المقدس قرار پایا اور پھر حضور علیہ السلام کے عہد میں وہی قبلہ مسجود الیہ بنا۔ جس کی بنیاد دو مقدس نبیوں نے رکھی تھی؛

ابراہیمؑ اور اسماعیل علیہما السلام خانۂ کعبہ کی دیواریں اُٹھا رہے تھے تو اُن کے دل اس آرزو سے معمور تھے کہ اس ربانی گھر کو کوئی ایسی ہستی اپنے جلووں سے معمور کرے! جو ربانی شان کی مظہر ہو۔ مکان کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اُن کے دلوں میں مکین کی تمنا فزوں ہوتی جا رہی تھی۔ جو انجام کار دُعا بن کر لبوں پر آگئی۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا تھی جو مقبولِ بارگاہ ہو کر رہی۔ ارادہ خود اپنا تھا جسے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی دعا بنا دیا۔ تاکہ وہ بھی نوازے جائیں۔ مکان تعمیر کرنے کی سعادت اُن کے حصہ میں آئی ہے تو مکین کی بعثت اور مکین کے ظہور کے آئینے میں بھی اُن کی دعا کی جلوہ گری ہو۔ آئینہ بے مثل تھا اس لئے دعا کو بھی بے مثل حسن عطا کیا گیا۔ باپؑ اور بیٹےؑ کعبے کے لئے بے مثل

سجدوں کا حسن چاہتے تھے، اس لئے جبینِ مصطفیٰؐ کو اس کی طرف جھکانے کے لئے عین حالتِ نماز میں وحی کا نزول ہوا۔ اور حضور علیہ السلام نے بیت المقدس سے منہ پھیر کر کعبہ کی طرف کر لیا۔ کعبے کو اور بھی شرف ملا۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا حسن اور بھی آشکارا ہوا۔ اسماعیل علیہ السلام کے دل کی تمنا حسن بن کر سامنے آ گئی۔ باپؑ اور بیٹاؑ اپنی سعی و کوشش سے بنائے جانے والے مکان کے لئے بیش از بیش عظمتوں کے آرزو مند تھے کعبے کو عظمتیں مل گئیں۔ جبینِ مصطفیٰؐ اُس طرف جھکنے لگی۔ یہ عصر کی نماز کا وقت تھا اور حضور علیہ السلام دو رکعت نماز ادا فرما چکے تھے۔ دو رکعتیں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کی گئیں اور دو رکعتیں کعبہ کی طرف، حضورؐ کے چہرۂ انور کا پھرنا تھا کہ صحابہؓ نے بھی اپنا منہ خانۂ کعبہ کی طرف پھیر لیا۔ وہ جانتے تھے کہ رسولؐ کا ہر عمل مشیتِ ربانی کے مطابق ہوتا ہے، رسولؐ ہی کے قول و فعل سے رضا کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے،

تحویلِ قبلہ نے کافر و مومن اور صدیق و زندیق کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دیا۔ جن دلوں میں کھوٹ تھا۔ وہ پکارنے لگے کہ بیت المقدس کو نظر انداز کر کے کعبہ کو کیوں قبلہ بنایا گیا ہے؟ ایسے لوگوں کو خدا نے ملعون کیا۔ وحی کے ذریعے اُن کی ذہنی پستی اور ضمیر کی گراوٹ کو آشکار کیا۔ مکرم و محترم وہی قرار پائے جو رضا کے بندے تھے رضا کے مقام پہ صدیق بن کر کھڑے تھے جب رسولؐ کا رُخ بیت المقدس کی طرف تھا تو بیت المقدس اُن کا قبلہ تھا۔ رسولؐ نے کعبے کی طرف منہ پھیر لیا۔ تو وہ بھی کعبے کی طرف جھک گئے، اُن کے "ٹھہرنے" اور اُن کے "پھر جانے" میں رضا کی شان جلوہ گر تھی، مقصود نہ کعبہ تھا نہ قبلہ، بلکہ اُس ذات کی اطاعت مقصود تھی جس نے انہیں بیت المقدس کی عظمتوں سے آشنا کیا تھا۔ اور اب انہیں کعبے کی طرف لے آئی

تھی۔ خدا نے بھی تحویلِ قبلہ کی یہی حکمت بیان فرمائی کہ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف منہ پھیر کر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے رسولؐ کی اطاعت کون کرتا ہے۔ اور ظن و قیاس کے گھوڑے دوڑا کر طغیان و سرکشی کی راہ کون اختیار کرتا ہے جب عبادہؓ بن صامتؓ کے ذریعے اُن لوگوں کو تحویلِ قبلہ کی علم ہوا جو نماز میں مشغول تھے۔ تو انہوں نے بھی اپنا منہ کعبہ کی طرف پھیر لیا یہیں سے علمائے مجتہدین نے یہ اخذ کیا کہ اگر حالتِ نماز میں معلوم ہو جائے کہ جس طرف نماز پڑھی جا رہی ہے وہ سمت درست نہیں تو منہ پھیر لینا چاہیئے اور جو نماز پڑھی جا چکی ہے۔ اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ خیر یہ تو فقہاؒ کا نقطۂ نگاہ تھا محدثینؒ نے اپنے مطلب کی بات پالی وہ بولے کہ خبرِ واحد بھی دین میں حجت ہے۔ جو مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہے تھے۔ اُن کے پاس عبادہ بن صامتؓ ایک راوی تحویلِ قبلہ کی خبر لائے تھے۔ جو قابلِ اعتبار قرار پائی۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ صحابہؓ کے نزدیک یہ خبر واحد بھی معتبر تھی۔

بہارِ عالم حسنش دل و جاں تازہ می دارد
بہ رنگ اصحابِ صورت را بہ بو اربابِ معنی را

ابوالحسنؒ

حضرت ابوالحسنؒ احمد بن محمد نوری کا تعلق اس عہد کے مشائخ سے ہے جسے مقتولین کے عہد سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسلام کی جو تڑپ اور لگن آپ کے سینے میں تھی اسی نے آپ کو عوام میں محبوبیت عطا کر رکھی تھی اور یہی شہرت و عظمت اُن لوگوں کو بُری طرح کھٹک رہی تھی۔ جو انہیں اپنی راہ کا کانٹا سمجھ رہے تھے حاسدوں میں سرِ فہرست غلام الخلیل کا نام تھا جسے حکومت میں غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل تھا۔ چنانچہ اُس نے

ابوالحسنؒ کو اپنی سازشوں کا نشانہ بنا لیا۔ جب ابوالحسنؒ ملزم کی حیثیت سے خلیفہ کے دربار میں حاضر کئے گئے تو اُن کے ساتھ ابوحمزہؒ اور رقامؒ بھی تھے خلیفہ کو یہ تاثر دیا گیا تھا کہ یہ لوگ بے دین ہیں غلط عقائد پھیلا کر عوام کی گمراہی کا باعث بن رہے ہیں۔ غلام الخلیل تو ان بزرگوں کی گرفتاری پر اتنا خوش تھا کہ اس کے لئے اپنی خوشی کا چھپانا مشکل ہوگیا۔ وہ خلیفہ سے کہہ رہا تھا کہ امیرالمومنین نے اگر انہیں قتل کرنے کے بعد بے دینی کی جڑ کاٹ دی تو میں خدا کے نزدیک اس کے اجرِ عظیم کا ذمہ دار بن جاؤں گا۔ اور جب خلیفہ نے اُن کے قتل کا فیصلہ سنا دیا اور جلاد رقامؒ کو قتل گاہ میں بٹھانے کے بعد اپنی تلوار کی تیزی آزمانے لگا تو ابوالحسنؒ بڑھ کر جلاد کے سامنے ہو گئے۔ جلاد بولا کہ شیخ! تلوار کوئی ایسی چیز نہیں جس کی کوئی آرزو کرسکے۔ آپ رقامؒ کی جگہ خود کیوں آ بیٹھے ہیں۔

ابوالحسنؒ نے جواب دیا۔ کہ ہم نے دین کی روح کو اختیار کر رکھا ہے اور دین کی روح ایثار ہے، ہم لوگوں نے زندگی میں ایثار کو روح بنا رکھا تھا اب میں اپنی زندگی کا ایثار کرنا چاہتا ہوں تاکہ میرے ایثار کی تکمیل ہو سکے اور میں اخروی زندگی کی سعادتوں سے بہرہ ور ہو سکوں،

جلاد نے ابوالحسنؒ کی یہ بات سنی تو خلیفہ کو آگاہ کیا، جنہیں سُن کر وہ غایت درجہ متاثر ہوا۔ اور اُس نے قاضی سے کہا کہ ان لوگوں سے مل کر حقیقتِ حال معلوم کی جائے۔

اس عہد کا قاضی ابوالعباس بن علیؒ تھا جو تینوں بزرگوں کو اپنے گھر لے گیا اور اس نے اُن سے شرعی امور سے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔ علمی مباحث سے فارغ ہوا، تو اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار تھے۔ ابوالحسنؒ نے قاضی کی وقار آمیز خاموشی دیکھ کر کہا۔ قاضی! تم نے علمی مباحث کو تو بہت طول دیا، لیکن جو بات حیاتِ انسانی کے اساسی مسئلے کی حیثیت رکھتی ہے اس کی طرف مطلقاً توجہ نہیں دی۔ قاضی نے پوچھا وہ کیا؟

ابوالحسنؒ بولے کہ خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جن کی زندگی اور موت خدا کے لئے ہے۔

حمادؒ سرخسی

احمد حمادؒ سرخسیؒ سے حضرت داتا صاحب کو بڑی عقیدت ہے خود فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن حضرت احمد حمادؒ سرخسی سے پوچھا کہ آپ کی توبہ کی ابتداء کیسے ہوئی! جو مقام اور مرتبہ آپ کو رب کے نزدیک حاصل ہے وہ کیسے ملا؟ حمادؒ نے فرمایا کہ میں سرخسیؒ کے جنگل میں اُونٹ چرا رہا تھا۔ کوئی مادی منفعت میرے پیشِ نظر نہ تھی۔ مقصود صرف یہ تھا کہ اس طرح مجھے جو سرمایہ فراہم ہو اُسے خدا کی راہ میں صرف کر سکوں۔

چنانچہ میرا معمول تھا کہ میں غرباء اور مساکین کی خدمت کرتا۔ کیونکہ میرے پیشِ نظر قرآن کی وہ آیت تھی جس میں اہلِ ایثار کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے نفسوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ ضرورت مند ہی کیوں نہ ہوں۔

اسی دوران مجھے ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک دن پہاڑ سے اُتر کر ایک شیر آیا۔ اور اس نے میرے ایک اُونٹ کا شکار کر لیا۔ اُونٹ مارنے کے بعد شیر پھر پہاڑ پر چڑھ گیا اور اس نے دھاڑنا شروع کر دیا۔ شیر کی دھاڑ سن کر جنگل کے جانور جمع ہو گئے اور شیر انہیں اپنے شکار کے پاس لے آیا۔ شیر نے اُونٹ کو چیر ڈالا اور خود پہاڑ پر چڑھ گیا تمام جانور شکم سیر ہو کر چلے گئے۔ تو شیر کھانے کے لئے نیچے اُترا۔ ابھی اس نے کھانے کا قصد ہی کیا تھا کہ اُسے ایک اپاہج لومڑی دکھائی دی جسے دیکھ کر شیر پھر پہاڑ پر چلا گیا۔ جب لومڑی پیٹ بھر کر کھا چکی اور اس نے جنگل کی راہ لی تو شیر آگیا اس نے اُن تمام جانوروں کا پس خوردہ کھایا جو اس کے لطف و کرم پر جی رہے تھے جن کی غذا اس

کے ایثار کی مقت پذیر تھی۔

حضرت داتا کہتے ہیں کہ حماد ؒ نے میرے سامنے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا! کہ میں سمجھ گیا کہ لقمہ کا ایثار تو کتے بھی کر لیتے ہیں۔ شیر جو درندگی میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے لقمہ کے ایثار کی توفیق تو اسے بھی نصیب ہے۔ مردانِ خدا کو تو اس سے اعلیٰ اور ارفع مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ ۔ چنانچہ اب میں جان اور جگر کے ایثار کو اپنا وظیفہ حیات بنا چکا ہوں ۔ اہلِ حاجات کے لئے میری جان بھی حاضر ہے اور جگر بھی۔ یہی وظیفہ میرا معمول حیات ہے اور اسی کی بدولت میں خدا کی عنایات کا مورد بنا ہوں اس وظیفے کے بعد اب ، مجھے کسی مزید وظیفے کی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ یہ وظیفہ قبول ہو چکا ہے۔

شیخ الاسلام

شیخ الاسلام حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے عہد میں اجودھن کے رئیس اور حاکم کے درمیان شدید قسم کی مخاصمت پیدا ہو گئی۔ علاقے کا رئیس ذی اثر آدمی تھا اس نے اپنے اثر و رسوخ کے باعث حاکم کی راہ میں گوناگوں مشکلات پیدا کر دیں، جو اختیار حاکم کے پاس تھا وہ اسے مصائب سے محفوظ نہ رکھ سکا۔ تنگ آکر اس نے شیخ الاسلام سے فریاد کی اور شیخ کو اُن مشکلات سے آگاہ کیا جو اس کے لئے اضطراب کا سبب بنی ہوئی تھیں۔ شیخ الاسلام نے ایک قاصد کے ذریعے رئیس کو سازشوں سے باز رہنے کی تاکید کی۔ لیکن اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ اُس نے قاصد کی بات سُننا بھی گوارا نہ کی۔ قاصد نے واپس آکر شیخ الاسلام کو بتایا کہ اُس نے میری بات کو قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ اُس وقت علاقے کا حاکم بھی شیخ الاسلام کے پاس موجود تھا۔ آپ نے اُس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی آپ کی آرزو کی تکمیل کا وقت نہیں آیا۔ آرزو کی تکمیل

کے لئے جو مناسب اور موزوں وقت ہوتا ہے اسی میں اُسے شرفِ قبول ملتا ہے ہو سکتا ہے کہ یہی آرزو کسی اور کے ذریعے پوری ہو جائے۔ وہ سفارش کرے اور سفارش کے لئے وہ وقت موزوں ہو اسی ضمن میں یہ بھی فرمایا کہ عین ممکن ہے کہ تمہارے پاس کوئی مظلوم فریادی بن کر آیا ہو اور تم نے اُس کی بات نہ سُنی اور جو شخص رحم و کرم کے جذبات سے عاری ہو، جب خود گرفتارِ بلا بنتا ہے تو اُس پر کسی کو رحم نہیں آتا۔ رحم کرنے والا ہی رحم کا مستحق ہوتا ہے،

شیخ الاسلام کے اِن الفاظ سے حاکم کو اپنی چیرہ دستیوں کا عہد یاد آگیا۔ شیخ کی سفارش نہ ماننے کے باعث اُس پر یاس کا غلبہ ہو چکا تھا چنانچہ وہ غایت درجہ ملول ہوا چاروں طرف ظلمتیں نظر آنے لگیں اور امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دی۔ تو وہ اپنے سابقہ گناہوں سے تائب ہونے لگا۔ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ رئیس نے آکر معذرت کی کہ اپنی بعض مصروفیتوں کے باعث آپ کے ارشاد کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ جس کا مجھے غائیت درجہ قلق ہے۔

جلال الدین تبریزی

شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا تعلق اُن مشائخ عظام سے ہے جنہوں نے بے سروسامان ہونے کے باوجود اسلام کی نشرواشاعت میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔ بغداد میں وہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے ملے ہیں۔ نیشا پور میں اُن کی ملاقات شیخ فرید الدین عطار سے ہوئی ہے۔ دِلّی میں اُن کا قیام حضرت نظام الدین اولیاء کے پاس رہا ہے۔ ملتان میں وہ حضرت بہاؤالحق زکریا ملتانی کے مہمان رہے ہیں۔ اور پاکپٹن میں شیخ الاسلام حضرت فرید الدین گنج شکر کی صحبتوں میں تمتیعت ہوئے ہیں۔

حضرت بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ سے گفتگو کے دوران ایک دفعہ جب انہوں نے فرمایا کہ نیشاپور میں جب میں حضرت فرید الدین عطارؒ سے ملا تو انہوں نے مجھے فرمایا کہ مجھے کسی

ایسے خدا کے بندے کی نشان دہی کر دیں جس سے میں استفادہ کر سکوں تو شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے فرمایا کہ آپ نے شیخ شہاب الدین سہروردی کی نشان دہی کیوں نہ کی! یہ اُن کی رہنمائی کر سکتے تھے۔

تبریزی رحمت اللہ نے فرمایا کہ فریدالدین عطارؒ میں مجھے مشغولیٔ حق کی جو شان نظر آئی ہے وہ کسی اور میں دکھائی نہیں دی۔ بلکہ فریدالدین عطارؒ کی مثنوی کے مقابلے میں مجھے دوسروں کی مثنوی معمولی دکھائی دی ہے۔ بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ نے فریدالدین عطارؒ کی رہنمائی کے لئے شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ کا نام اس لئے پیش کیا کہ وہ اُن کے مرید تھے لیکن جلال الدین تبریزی نے اپنا تاثر پیش کرتے وقت اس خیال کو قریب نہیں پھٹکنے دیا کہ اس طرح کا جواب دینے سے میزبان کی دل شکنی ہوگی وہ عطارؒ کی مثنوی کے مقابلے میں دوسروں کی معمولی کا ذکر سُن کر رنجیدہ خاطر ہوں گے جو اُن کا تاثر تھا انہوں نے بے کھٹکے پیش کر دیا۔ یہ للہیت کی ایک بہترین مثال ہے، ورنہ ابنائے زمانہ تو ہر اُس شخص کو خوش کرنے کے لئے دروغ بیانیوں اور مصلحت اندیشیوں سے کام لیتے ہیں جن سے اُن کا معمولی سا مفاد بھی وابستہ ہو اور ضمیر فروشی پر نادم ہونے کی بجائے اسے کمالِ فن جانتے ہیں۔

شیخ جلال الدین تبریزی رح کا بہاؤالحق زکریا ملتانی کے سامنے شیخ عطارؒ کی مثنوی کے مقابلے میں دوسروں کی مثنوی کو معمولی کہہ دینا بظاہر معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ اِن کی حق گوئی کی ایک بین دلیل ہے جو اُن کے کردار کی بلندی کی بھی غمازی کرتی ہے۔

سیف الدین باخرزیؒ

شیخ سیف الدین باخرزیؒ کے عہد میں جب فتنہ و فساد کی آگ بھڑکی، اور

لوگ انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے تو نئے فرماں رما کی تعریف و توصیف میں انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیا جانے لگا۔ شاعر نئے فرماں روا کی بارگاہ میں پہنچ کر قصیدے پڑھ رہے تھے۔ خطیبوں کا سارا زورِ بیان یہ ثابت کرنے پر صرف ہو رہا تھا کہ ایسا انسان مادرِ گیتی نے نہیں جنا، محاسن ہیں تو اس میں، مکارم اخلاق کا مجموعہ ہے تو یہ ذات۔ انہی ہنگامہ آرائیوں میں ایک منجم نے کامیاب ہو کر نئے فرماں روا کی توجہ اس طرف مبذول کرادی کہ تمام شورشوں کا سرچشمہ شیخ سیف الدین باخرزی کی ذات ہے جب تک اس فتنے کا سدِ باب نہیں کیا جاتا امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔

شیخ سیف الدین باخرزی کے دربار میں نہ آنے کے باعث بھی یہ شبہ پیدا ہو چکا تھا کہ یہ نئے انقلاب سے خوش نہیں حالانکہ اُن کی زندگی کا مقصود ایسی ہنگامہ آرائیوں سے بہت بلند تھا۔ وہ داعیٔ حق تھے اُن کی ساری صلاحیتیں حق کو پھیلانے اور برائیوں کا قلع قمع کرنے پر صرف ہو رہی تھیں۔ لیکن جن لوگوں کو اُن کی یہ روش پسند نہ تھی وہ منجم کی بات کو حقیقت پر مبنی قرار دے رہے تھے۔ آخر کار شاہ نے اُسی منجم کو مامور کیا کہ وہ شیخ سیف الدین باخرزی کو دربار میں لائے۔ رذیل کو جب اختیار مل جائے، تو وہ اپنی رذالت کے اظہار کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہونے دیتا۔

منجم جب اسلام کے اس داعی کو دربار میں لایا۔ تو اُن کی حالت، انتہائی قابلِ رحم تھی انہیں اُنہی کے دستار سے باندھا گیا تھا اور اُن کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہ ایک عامی کے ساتھ بھی موزوں نہیں ہو سکتا۔ شاہ کو ایک عالمِ دین کی یہ ذلت پسند نہ آئی اور اُس نے سیف الدین کا غایت درجہ احترام کیا۔ معافی مانگ کر جب انہیں غایت درجہ احترام کے ساتھ واپس کیا گیا تو اُس کا تأسف پھر بھی ختم نہ ہوا۔ اور آخر کار اس منجم کو پابہ زنجیر شیخ کے پاس بھیج دیا۔ اور کہلا بھیجا کہ آپ کا مجرم یہ ہے، جو سلوک بھی آپ اس کے ساتھ کریں گے وہ مناسب ہو گا۔ شیخ نے منجم کو اس حال میں دیکھا تو اُن

کے اضطراب کی کوئی حد نہ رہی۔ منجم کی زنجیریں کھول کر وہ غایت درجہ شفقت و محبت کا اظہار کر رہے تھے،

آخری لمحات

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے انتقال کے وقت اُن کا ایک عماد نامی بیٹا بہت پریشان تھا۔ اُس کی پریشانی کا باعث یہ نہ تھا۔ کہ شفقتِ پدری سے محروم ہو رہا ہے یہ احساس بھی اُس کی پریشانی کا موجب نہ تھا کہ شیخؒ کے انتقال کے بعد لوگ ایسی شخصیت سے محروم ہو جائیں گے جس کا وجود رحمت کی حیثیت رکھتا ہے جس کا تقویٰ مثالی ہے جس کے افکار کی روشنی میں جادۂ حق کے مسافر اپنی منزل کا سُراغ پاتے ہیں جو ہدایت کا راہبر ہے حق گوئی و بے باکی جس کا شعار ہے جس نے دلوں کو اِک تازہ ولولہ بخشا ہے، مُردہ دلوں کو اِک تازہ زندگی عطا کی ہے، بھٹکے ہوؤں کو اپنی شعلہ نوائی سے راہ پر لے آیا ہے، جو عزم و یقین کی قندیلیں لے کر اندھیرے عالم میں دیوانہ وار پھرا ہے، جہاں گیا ہے، روشنی عطا کی ہے جہاں پہنچا ہے مستیاں بخشی ہیں عشق اُس کا پیام اور محبت اُس کی انیس تھی،

عمادؒ کو اس قسم کے مشاغل سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اُس کا مقصودِ حیات، شیخؒ کے مقصودِ حیات سے یکسر مختلف تھا وہ دنیوی زندگی کی دلفریبیوں کو مقصودِ حیات جانتا تھا اسی لئے اُس میں وہ شقاوت پیدا ہو چکی تھی جو نفس کے بندوں کو انسانی صفات سے محروم کر دینے کے بعد حیوانیت کے مقام پر لے آتی ہے اسی شقاوت کا نتیجہ تھا کہ وہ باپ کی موت کے غم سے بے نیاز اُن کا سرمایہ سمیٹنے کی فکر میں تھا۔ نیک دل لوگوں نے اُسے بہت سمجھایا کہ یہ سرمایہ سمیٹنے کا وقت نہیں! شیخؒ کے پاس دُنیا کا مال کہاں؟ لیکن اُسے یقین نہ آیا، کہ جسے روحانی پیشوائی کا منصب نصیب ہو امراؤ سلاطین

اُس کے آستانے پر حاضری دیں۔ وہ بھی دامن کیسے ہو سکتا ہے!

آخر اس شور کی آواز شیخ رح نے بھی سن لی۔ وہ اگرچہ زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے۔ لیکن با این ہمہ انہوں نے صورت حال دریافت کی اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اُن کا بیٹا خزانہ معلوم کرنے کے لئے اُن کے عقیدت مندوں سے لڑ جھگڑ رہا ہے تو انہوں نے اندوہگیں لہجہ میں کہا کہ اسے خزانے کی چابی دے دو۔

چابی سے کر عماد نے دیکھا کہ شیخ رح کا چھوڑا ہوا سرمایہ سو دینار ہیں۔ جو اُن کے کفن دفن کے مصارف پورے کر سکتے ہیں۔ یہ سرمایہ اُسی کام پر صرف ہوا، عماد کے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ خدا کی راہ میں یوں بھی زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔

بایزید رح

انبیاء اور اولیاء کا زمانہ چوں کہ خیر و برکت کا زمانہ ہوتا ہے اس لئے دلوں میں خود بخود نیکی کا جذبہ اُبھرنے لگتا ہے اُن کے انوار جو دلوں پر پڑتے ہیں رائیگاں نہیں جاتے۔

بایزید بسطامی رح کے عہد میں ایک کفن چور تھا جس کے کانوں میں شیخ رح کی للٰہیت اور پارسائی کے واقعات پڑتے رہتے تھے اور آخر اس کا دل معصیت کی زندگی سے نفور اور نیکی کی طرف راغب ہو گیا۔ کفن چور نے کسی خارجی تحریک کے بغیر بایزید رح کی خدمت میں آکر اعتراف گناہ کر لیا۔ اور اپنے گناہوں پر نادم ہو کر بایزید رح سے دعا کا طالب ہوا کہ خدائے رحیم و کریم اس کے گناہ بخش دے اور اُسے سچی توبہ کی توفیق نصیب ہو۔

جب دعا ہو چکی، معصیت سے آلودہ انسان دھل کر پاک ہو گیا۔ بندے اور مولا کے درمیان کوئی حجاب نہ رہا۔ رحمت کی ہم آغوشی کی لذتیں نصیب ہو گئیں۔

تپیدہ روح کو قرار آگیا۔ دل کو تسکین مل گئی تو بایزیدؒ نووارد کی خاطر و مدارت میں معروف ہو گئے۔ یہ خاطر و مدارت مادی نہ تھی بلکہ روحانی تھی اسی ضمن میں بایزیدؒ نے پوچھا بیٹے! اپنی معصیت کی زندگی میں تم نے کتنے مُردوں کے کفن چرائے ہیں!

کفن چور تھوڑے توقف کے بعد بولا، ان کی تعداد کوئی ایک ہزار سے کم و بیش ہوگی۔

بایزیدؒ نے پوچھا: جن مُردوں کے تم نے کفن اتارے ہیں اُن میں سے کسی کا منہ قبلے کی جانب بھی تھا؟

وہ بولا کہ خیال ہے اُن میں صرف دو مُردے ایسے تھے جن کا منہ قبلہ کی طرف تھا ورنہ سب پشت بہ قبلہ تھے۔ حاضرین میں سے بعض لوگوں نے سوال کیا کہ مُردوں کے پشت بہ قبلہ ہونے کی کیا وجہ ہے!

بایزیدؒ فرمانے لگے کہ یہ سب وہ لوگ تھے جن کا اپنے رب پر اعتماد نہ تھا دنیا میں بھی اُن کا رُخ اپنے رب کی رحمت کی طرف نہ تھا۔ اخروی زندگی میں بھی وہ رُو بہ قبلہ نہیں ہو سکتے۔

دو انسان جو رُو بہ قبلہ نظر آئے ہیں وہ خدا پر بھروسہ کرنے والے تھے خدا کی رحمت کے امیدوار تھے اس لئے قبر میں بھی اُن کی نظریں رحمت کی طرف ہیں جس نے یہاں رہ کر اُدھر رُخ نہیں کیا۔ مرنے کے بعد اُن کا رُخ قبلہ کی طرف کیسے رہ سکتا تھا۔

راہ کی لذتیں

منزل ہی لذتیں عطا نہیں کرتی، منزل ہی نہیں نوازتی، جادے بھی عظمتیں عطا کرتے ہیں۔ کیف و سرور بخشتے ہیں۔ جو جادہ کیف نہ بخشے، منزل کے حسنِ جمال سے آشنا نہ کر دے وہ منزل کے حسن و جمال کا نقاد نہیں کہلا سکتا۔ منزل کے حسن و جمال کے آئینہ دار

جادے کی تو شان ہی یہ ہوتی ہے کہ اس میں جو قدم اٹھتا ہے وہ عشق و محبت کے جذبات کا پروردگار بن جاتا ہے۔ منزل خواہ کسی نوعیت کی ہو اپنے فیوض سے متمتع کرے گی۔ اپنے اثرات ڈالے گی اور انسان دور رہ کر بھی ان اثرات کو محسوس کرے گا شرابی کو مے خانے ہی میں لذت نہیں ملتی۔ شراب خانے کی طرف لے جانے والا راستہ بھی اسے لذت آشنا بنا دیتا ہے محبوب کی راہ کیفیتوں سے خالی ہو ہی نہیں سکتی اور اگر کیفیت نہ ہو۔ راہ مزا نہ دے۔ بلکہ دل بے کیفیتوں سے معمور ہو تو ایسی راہ محبوب کی راہ نہیں ہو سکتی محبوب کی ذات سے دور اور نزدیک کا تعلق رکھنے والا ہر جادہ، ہر نشانِ منزل، لذتوں اور کیفیتوں کا گہوارہ ہوتا ہے۔ اس کی عطا، لذت اور کیفیت کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ مسافر کی چال ڈھال بھی بعض اوقات منزل کے تعلق کو آشکارا کرنے لگتی ہے چال میں نشہ ہو، قدم مستی اور سرشاری کے عالم میں اٹھ رہے ہوں تو یہ اس امر کی دلیل ہوتی ہے کہ مسافر منزل آشنا ہے۔ منزل کی اہمیت سے واقف ہے۔ اس کی قدر و قیمت جانتا ہے اور اس کے حسن و جمال کی تجلیوں سے اس کا سینہ معمور ہے چال ہی میں کوئی نشہ نہ ہو، رفتار میں مستی کی کوئی شان نظر نہ آئے۔ بلکہ الٹی چہرے پر مُردنی چھائی ہو قدم بے کیفی کے عالم میں اٹھ رہے ہوں اور نظر اداس دکھائی دے تو یہ منزل شناسی کی دلیل نہیں ہوتی۔ بلکہ منزل سے بیگانگی اور لاتعلقی کا اظہار ہوتا ہے اور ہر قدم پر منزل سے بیگانگی اور لاتعلقی کا اظہار کرنے والا مسافر منزل کی نوازشوں کا اہل نہیں ہوتا۔ ایسے مسافر کو تو منزل اپنے لئے باعثِ ننگ و عار سمجھتی ہے۔ لوگ بھی اس کی بے دلی سے کوئی اچھا اثر قبول نہیں کرتے۔ اسے منزل کے حق میں مفید نہیں جانتے۔ منزل کی عظمتوں کا غمّاز تو وہ مسافر ہوتا ہے جس کی شکستگی بھی منزل کی عظمتوں کی غمّاز بن جائے۔ راہ میں جو پریشانی نصیب ہو، وہ اس کے عزائم کو شکست دینے کی بجائے اور تابندہ بنا دے اور جوان کو دے اور رعنائیاں عطا کرے۔

رعنائی کا اظہار چہرے کی تابندگی اور رفتار کی تیزی ہی سے نہیں ہوتا، کبھی راہ کی پامالی بھی تابندہ جذبات کی غماز بن جاتی ہے۔ ہر زخم اپنے تیر انداز کی عظمتوں کا قصیدہ خواں بن کر دلوں کو گرمانے لگتا ہے جذبات کو تابندگی عطا کرتا ہے۔

صحابہؓ کو راہِ محبت میں جو عظمتیں نصیب ہوئی تھیں وہ ان کے تابندہ تر جذبات ہی کی آئینہ دار نہ تھیں۔ بلکہ وہ ایک ایسے آئینے کی حیثیت رکھتی تھیں جس میں جمالِ نبوت کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی تھیں۔ آئینے کا جمال صاحبِ جمال کی عظمتوں کو ظاہر کر کے دل و دیدہ کو منکیف کر رہا تھا۔ دلوں کو نئی زندگی عطا کرنے کا موجب ثابت ہو رہا تھا۔ بلالِ حبشیؓ کی وہ تب و تابِ جاودانہ جو انہیں اُمیّہ بن خلف کی بھڑکائی ہوئی آگ میں نصیب تھی۔ وہ بلالِ حبشی ہی کی عظمتوں کی آئینہ دار نہ تھی۔ بلکہ اس کے ذریعہ اس ذاتِ گرامی کی عظمتیں بھی آشکار ہو رہی تھیں جس کے حسن و جمال نے بلالؓ کو یہ مستیاں عطا کی تھیں۔ مستی کے ذریعے صہبا کی تندی اور تیزی کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے صہبا اگر خام ہو تو مستی بھی خام ہو گی۔ جام بھی ناقص کہلائے گا۔ اور اگر صہبا کی کشید کسی اعلیٰ بھٹی میں کی گئی ہو تو اس کے لئے جام بھی اعلیٰ تجویز کیا جائے گا۔ وہ اعلیٰ جام ہی کے حصّے میں آئے گی۔

عشقِ رسولؐ کی تند و تیز صہبا جس کی کشید خانۂ قدس کی بھٹی میں ہوئی ہے اور جسے ساقیِ ازل نے اپنے ہاتھوں سے مختلف پیالوں میں بھرا ہے۔ وہ ناقص نہیں ہو سکتے وہ ٹوٹ کر بھی مستیاں عطا کریں گے۔ صحابہؓ کی رگوں پہ بدر و حنین کی رزم گاہوں میں جو نشہ طاری تھا۔ وہ سرمدی تھا۔ ازلی تھا۔ اس کا مصائب و آلام کی زندگی میں اترنا ناممکن تھا ان کی یہی سرمدی کیفیت دوسروں کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ راہ کا نشہ بھی تھا منزل کا نشہ بھی۔ مصائب، راہ تھے اور ذاتؐ منزل اور انہیں یہ دونوں نعمتیں نصیب تھیں راہ کی لذت بھی اور ذات کا جمال بھی راہ میں نظر جب منزل کے حسن و جمال پہ ہوتی ہے تو راہیں خود بخود حسین نظر آنے لگتی ہیں۔ منزل کے حسن و جمال کو نظر انداز کر کے سفر اختیار کرنے والے مسافر

کی راہوں میں نہ کوئی لذت ہوتی ہے اور نہ جلوہ ، وہ دونوں سے بے نصیب رہتا ہے۔

کتاب و حکمت

اپنے روضے اور منبر کی درمیانی جگہ کو حضور علیہ السلام نے جنت کی کیاریوں سے ایک کیاری قرار دیا ہے

جنت عالم دنیا کی چیز نہیں وہ سراسر عالم قدس اور عالم انوار کی چیز ہے جس کی فضائیں لامحدود ہیں۔ لیکن حضورؐ زمین پر اس کے ایک حصّے کی موجودگی کی خبر ہی نہیں دے رہے اس کی حدود بھی متعین فرما رہے ہیں۔ یہ نبوت کے علوم کا ایک معمولی کرشمہ ہے کہ جو چیز نگاہوں سے مستور رہے اور جس کا حواسِ انسانی ادراک نہیں کر سکتے۔ وہ نبوت کے علم و ادراک سے باہر نہیں۔

نبیؑ کی بعثت ہوتی ہی اسی لئے ہے کہ جو چیزیں فہم انسانی میں نہ آسکیں جن کا ادراک ممکن نہ ہو۔ وہ ان کی خبر دے ان حقیقوں سے آشنا کرے جو ماورائے فہم و ادراک ہوں۔ ربّانی علوم کی تشریح و توضیح نبیؑ کا فرضِ اوّلین ہوتا ہے اگر ربّانی کلام نبیؑ کے توسّل کے بغیر سمجھ میں آسکتا تو انبیاؑ کی بعثت کی ضرورت نہ تھی۔ نبی کے ذمہ اُمّت کی تعلیم بھی ہوتی ہے اور تربیت بھی۔ وہ اعلیٰ ارفع اور پاکیزہ نظریات ہی عطا نہیں کرتا۔ پاکیزہ عمل کی تربیت بھی دیتا ہے اس کی صحبت اکسیر کا حکم رکھتی ہے صحابہؓ علم و عمل کے جس اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔ وہ صحبتِ رسولؐ کا فیضان تھا۔ صحابہؓ کے بعد تابعین کو جو رتبہ ملا وہ صحابہؓ کی صحبت کا نتیجہ تھا اسی لئے کہا گیا ہے کہ ربّانی کلام میں جو تدبر و تفکر مشکوٰۃِ نبوت کی روشنی میں کیا جائے گا وہی روح کو زندگی عطا کرے گا۔ اور ذہن کو منور کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ ورنہ فکر کو آزاد چھوڑ دیا گیا۔ تو وہ گمراہیوں کا موجب بن جائے گی۔ صحابہؓ مشکوٰۃِ نبوت کی روشنی میں قرآن کو سمجھتے تھے ان کے نزدیک ذہنی ہفسر

قرآن نہ تھا۔ بلکہ اللہ کا رسولؐ تھا۔ انسانی اذہان کی کی گئی تفسیریں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن معلّم کتاب و حکمت کی کی گئی تفسیر میں اختلاف ممکن نہیں۔

ربّانی کلام

دو ذاتوں کے درمیان جس نوعیت کے تعلقات استوار ہوں گے۔ اسی نوعیت کی جھلک ان کے کلام میں بھی نظر آئے گی کوئی اجنبی کسی عظیم ذات سے بے تکلفانہ انداز میں گفتگو نہیں کر سکتا یہ سب قرب کی باتیں ہیں۔ تعلق عروج کو پہنچ جاتا ہے تو اس کی جھلک کلام ہی میں نہیں انداز و اطوار میں بھی نظر آنے لگتی ہے۔ دوست کی بارگاہ میں دوست کا مقام مجبور و معذور انسان ہی کا نہیں ہوتا عظیم ذات کے دل میں گھر کر لینے کے بعد انسان کو کچھ اختیارات بھی ملتے ہیں۔ دلربائی کی شان بھی عطا ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو تعلق ادھورا رہتا ہے۔ بلکہ ایسا قرب عذاب بن جاتا ہے جو لذّت بخشے نہ کیفیت عطا کرے۔ محبت کی ایک فطرت ہے۔ کبھی وہ اپنا اختیار ظاہر کرتی ہے اور کبھی محبوب کے اختیار کو ظاہر کر کے خوش ہوتی ہے۔

سلیمان علیہ السّلام نے بلقیس کا تخت منگانے کے لئے اپنے دوستوں کی طرف رجوع کیا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی یہ تخت لا سکتے تھے۔ خود لاتے تو ان کے دوستوں کی عظمت ظاہر نہ ہوتی۔ وہ تو بلقیس کے تخت کے ذریعے اپنے دوستوں کی عظمت ظاہر کرنا چاہتے تھے تاکہ لوگ جان لیں کہ یہ لوگ بے اختیار نہیں۔ نبیؑ کی درگاہ سے وابستگی نے انہیں عظیم قوت و طاقت بخشی ہے۔

کسی کلام کو سمجھنے کے لئے اس تعلق کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ جو دو دلوں اور دو ذاتوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جو لوگ خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات کی نوعیت کو نظر انداز کر کے کلامِ ربّانی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جہاں خدا تعالےٰ نے اپنے حبیبؐ کے سامنے اپنے اختیارات

کا اعلان و اظہار فرمایا ہے وہ بھی حق ہے اور جہاں محبوبؐ کے اختیارات کی توضیح کی ہے اس کی صداقت بھی مسلمات کا درجہ رکھتی ہے۔ اپنے اختیارات کے اعلان سے محبوب کے اختیارات کی نفی مقصود نہیں ہوتی۔ کبھی اپنا اختیار واضح کیا جاتا ہے اور کبھی محبوب کا۔

نبوّت کی بشارتیں

قربِ قیامت کے زمانے کو حضور علیہ السلام نے فتنوں کا دور قرار دیا ہے اور اس عہد کی ہولناکیوں کی جہاں تفصیل بیان فرمائی ہے وہیں یہ بھی فرمایا ہے کہ اس عہد میں ایمان پر قائم رہنا ایسا ہی مشکل ہوگا جیسا کہ دہکتے ہوئے انگاروں پر کھڑا ہونا۔ اس عہد کے رائی کے برابر ایمان کو بھی قبول فرما لینے کی بشارت دی گئی ہے۔ کیونکہ انبیاؑ علیہم السلام کا عہد موسم ربیع کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں چھم چھم بارش ہوتی ہے باغ و بستان ہی پر بہار نہیں آتی۔ ویرانے بھی ہرے بھرے نظر آنے لگتے ہیں۔ بہار گذر جانے کے بعد جب موسم خزاں کا تسلط ہوتا ہے تو اس میں سوکھے درختوں کے سائے بھی غنیمت سمجھے جاتے ہیں۔ بہار میں قوتِ نمو سے محروم زمین پر بھی روئیدگی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ اور جو زمین قابلِ کاشت نہیں ہوتی وہ بھی سرسبز و شاداب نظر آتی ہے۔ انبیاؑ کا عہد چونکہ روح کی زمین کے لئے بارانِ رحمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ دلوں میں خود بخود نیکی کی رغبت اور بدی سے اجتناب کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اِس عہد کو مبارک کہا گیا ہے حضورؐ نے خود فرمایا ہے کہ تمام زمانوں سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر وہ زمانہ مبارک ہے جو میرے عہد سے ملا ہوا ہو۔ پھر وہ زمانہ جس کا میرے عہد کے ملے ہوئے زمانے سے تعلق ہو۔

خطِ استوا میں رہنے والوں کو حرارت کی احتیاج نہیں ہوتی سورج ہی انہیں حرارت بخشتا ہے، اور سورج ہی روشنی اور گرمی پہنچاتا ہے آفتابِ نبوت کے سائے میں رہنے والوں کی بھی یہی حیثیت ہے وہ براہِ راست آفتابِ نبوت سے فیضان حاصل کرتے تھے۔

اس لئے ان کے سچ سے بھٹکنے کا احتمال نہ تھا۔ جوں جوں زمانہ حضورؐ کے زمانے سے دور ہوتا گیا اسی قدر خیر و برکت میں کمی آتی گئی۔ اس عہد کا خفیف سا ایمان بھی اس لئے مقبول ہے کہ یہ خیر القرون کا عہد نہیں۔ مفاسد اور فتنوں کے مہیب بادل ہیں۔ جو چاروں طرف منڈلا رہے ہیں۔ دلوں سے خدا کا خوف اٹھ چکا ہے۔ حلال و حرام کی تمیز مشکل ہوگئی ہے۔ جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز ثابت کرنے کے لئے ذہانتیں لڑائی جا رہی ہیں۔ سود جسے خدا نے ناجائز کہہ کر اس سے بچنے کی تلقین فرمائی تھی۔ عہدِ حاضر میں اسے منافع کا نام دے کر شیرِ مادر سمجھ لیا گیا ہے۔ مفاسد کے دروازے اس قدر کھل چکے ہیں کہ انہیں بند کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ اب معاصی سے اجتناب کرنے والا معزز نہیں بلکہ اس کی حیثیت اچھوت کی سی ہے۔ اسے قدامت پسند اور تہذیب و شائستگی سے بیگانہ کہہ کر ناقابلِ التفات سمجھا جاتا ہے۔ مہذب وہ ہے جو زمانے کا ساتھ دے عصرِ جدید کی قباحتوں کو جھولی میں لے کر فخر کرے۔ انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیم کو نظر انداز کرکے، کفار و مشرکین کی تہذیب کو اپنائے۔ اسی کو موجبِ افتخار جانے اور انبیاءؑ کی تعلیم کا مذاق اڑائے ان کے بتائے ہوئے طور طریقوں کو ناقابلِ عمل جانے۔ احکامِ شرعیہ کا نام سن کر اس کی طبیعت مکدر ہو جائے۔ اور الہٰیین کے نافذ کردہ احکام کا ذکر سن کر اس کی باچھیں کھل جائیں۔ ایسے ماحول میں خدا کا نام لینے والا اور اس کے برگزیدہ رسولؐ کی شریعت پر عمل پیرا ہونے کا جذبہ لے کر اٹھنے والا یقیناً مقبول ہے اور حضورؐ نے ایسے ہی انسانوں کو بشارتوں سے نوازا ہے۔

وحی و الہام

غیب جو چیز نگاہوں سے مستور ہو اس پر ایمان لانا آسان نہیں اسی لئے اس مرحلے میں وحی ربانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جہاں حواس کام نہ دیں۔ ذہن و فکر کے تمام زاویے

باطل ہو کر رہ جائیں عقلی و فکری قوتیں بے کار ہو جائیں کانوں کی سماعت اور آنکھوں کی بصارت رہنمائی کے فرائض سرانجام دینے سے عاجز آجائے۔ وہاں وحیِ ربانی کا نور کام دیتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جو ایک نبیؑ کو اپنے عہد کے سیاسی اور ملی رہنماؤں سے ممیز و ممتاز کرتا ہے۔ سیاسی رہنماؤں کا کام مقدمات کو ترتیب دے کر نتائج اخذ کرنا اور ان کی طرف بلانا ہے۔ وہ حالات کا جائزہ لے کر کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اور دلائل و براہین کی روشنی میں اس کے حسن و قبیح پر تبصرہ کرتے ہیں۔ انبیاءؑ حالات کے منت پذیر نہیں ہوتے۔ ان کی نظر اپنے خالق و مالک اور پروردگار پر ہوتی ہے ان کے ملنے جلنے والوں نے بھی کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ جو وحی آپ پیش فرما رہے ہیں۔ ذرا عقلی حیثیت سے بھی اس پر روشنی ڈال دیجئے تاکہ ہمیں مزید اطمینان حاصل ہو جائے۔

انبیاءؑ کے پاس رہ کر جن لوگوں کے روح و قلب پر وحیِ ربانی کے سائے پڑ رہے تھے۔ ان پر وحی کا مفہوم آشکارا ہو چکا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وحیِ ربانی عقل کی میزان میں تلنے والی چیز نہیں۔ عقل کی میزان کی نسبت وہ نبیؑ کے دل کو زیادہ اہم چیز جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وحی کا نزول نبیؑ کے دل پر ہوتا ہے۔ مہبطِ انوار بننے والے سینے کے نور کو انسانوں کی بنائی ہوئی میزانوں میں نہیں تولا جا سکتا۔ جوہری کی میزان اور ایک بھٹیارے کی میزان میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ لعل تولنے کے لئے جو میزان ہوتی ہے اس میں کوئی پتھر نہیں تولتا اور پتھر تولنے والی میزان سے موتی تولنے کا کام نہیں لیا جا سکتا۔

انسانی عقول کا تعلق عالمِ محسوسات سے ہے اور نبیؑ کے احساسات و مدرکات کا تعلق ایک ایسے عالم سے ہوتا ہے جو عقلِ انسانی سے ماورا، فہم انسانی سے دور اور قیاس و گمان کی دنیا سے بہت آگے ہے۔

جبلِ احد

جبلِ احد کو فرمان نبویؐ کے مطابق جو شرف و امتیاز حاصل تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ رضؓ اس پہاڑ سے غایت درجہ محبت کرتے تھے۔ صحابیات رضؓ کو بھی اس سے محبت تھی۔ حضرت انس بن مالکؓ کی بیوی تو اپنے بیٹوں کو اس پہاڑ سے جنگلی پھل لانے کے لئے بھیجتی تھیں۔ اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرماتی تھیں کہ اگر کوئی جنگلی پھل نہ ملے تو گھاس ہی اکھاڑ لانا تاکہ میں اس محبوب مقام کی گھاس کھا کر روح کو ٹھنڈا کر سکوں۔

کوہِ طور کی تکریم کا باعث وہ جلوہ بنا جو موسیٰ علیہ السلام کو نظر آیا اور احد کو جمالِ محمدیؐ کی ضیا پاشیوں نے مکرم بنا دیا۔ حضورؐ اس پر چڑھے۔ اُس پر ٹھہرے اور اس کی ان دھڑکنوں کو محسوس کیا جو اس کے دل میں رسالت کے باب میں موجود تھیں۔ یوں تو کائنات کی ہر چیز تسبیح کرتی ہے اور یہ بھی جانتی ہے کہ حضورؐ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ لیکن احد کی معرفت ان سب سے جداگانہ ہے احد نے زبانِ نبویؐ سے خراجِ تحسین وصول کیا اور یہی اس کی عظمتوں کا ذریعہ بن گیا۔ صحابہ کا ایمان عقلی نہ تھا۔ بلکہ وہ قلبی اور روحی تھا۔ اسی لئے انھوں نے اگر زبانِ نبوتؐ سے یہ سنا کہ احد ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اسے محبوب جانتے ہیں تو اس شبہ کا اظہار نہ کیا کہ آپ جمادات کے دل کی بات کیسے جانتے ہیں؟

صحابہ جانتے تھے کہ جو ذاتِ گرامیؐ رب تعالیٰ کے دل کی بات سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ جماد کے دل کی بات کیسے نہ سمجھے گی؟ جب بغیر واسطہ جبریلؑ بھی حضورؐ کی روح پہ کلام نازل ہوتا ہے اسرارِ ربانی منکشف ہوتے ہیں تو جمادات کی کیفیات کو سمجھ لینا حضورؐ کے لئے کیا مشکل ہے؟ عقلی کا ایمان مشکوک ہوتا ہے۔ اور محب صادق کا صادق و مصدقہ ایمان جب تک ذہن میں رہے ناقص کہلاتا ہے۔ اور جب دل میں اتر جائے تو شکوک و شبہات کے گرد و غبار سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تصدیقِ قلبی کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

سنۃ الوفود

فتحِ مکہ کے بعد قبائلِ عرب کے وفود بارگاہِ نبوی ؐ میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔عربوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قریش کا اقتدار تھا یہ دیوار اٹھ گئی تو ان کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔قبیلۂ تمیم کا وفد آیا تو اس نے غایت درجہ بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔بارگاہِ قدس کے سامنے کھڑے ہو کر عامیانہ انداز میں حضور ؐ کو پکارنا شروع کر دیا۔ان کی یہ پکار رب کو پسند نہ آئی اور انہیں وحی کے ذریعے زجر و توبیخ کی گئی کہ یہ کیا گستاخانہ انداز ہے؟ انہیں بے وقوف کہا گیا۔حالانکہ ان میں ذہانت و فطانت کی کمی نہ تھی۔اور علم و فضل کے ادّعا ہی نے انہیں رسالت سے مقابلے پر آمادہ کیا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ فخر و مباہات کی باتوں میں ہم سے مقابلہ کرو ان کا مقرر ان کے مفاخر بیان کر چکا تو ثابت بن قیس رضؓ نے اس کا جواب دیا پھر ان کا شاعر کھڑا ہوا جو فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھا رہا تھا اس کے دل کا غبار ہلکا ہوا تو حسان بن ثابت رضؓ اشارہ نبوی ؐ پاتے ہی کھڑے ہو گئے یہ بدیہہ شاعری کر رہے تھے، اسی زمین، اسی قافیے، اسی ردیف اور اسی بحر میں ان کے افکار ڈھل کر محفل میں سحر پھونک رہے تھے۔زبان ان کی تھی۔اور بیان روح الامین کا۔شعر ان کے تھے اور تاثیر رب تعالیٰ کی۔شاعری کا آئینہ ان کا اپنا تھا۔اور حسن، اس حسین کا، جو دستِ قدرت کا شاہکار ہے۔حسان رضؓ بول رہے تھے اور تمیم سن رہے تھے۔فن کو معراج اس وقت ملتی ہے جب وہ محبوب کے کام آئے فن محبوب کے دل تک رسائی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے یہ مقصد پورا ہو گیا تو فن کار کامیاب ہے۔

انمول موتی

مال کی اہمیت کو ضرورت قائم کرتی ہے۔ضرورت ہو تو مہنگا بھی سستا معلوم ہوتا ہے۔

ورنہ سستا بھی مہنگا معلوم ہونے لگتا ہے۔

اصل چیز ضرورت ہے۔ مال کی اہمیت کا اندازہ مال کے علم سے ہوتا ہے۔ مال کا علم ہی نہ ہو تو اس کی اہمیت کا اندازہ کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ خریدنے کی طلب کیسے پیدا ہو سکتی ہے طلب کو تو علم اور اندازہ قائم کرتا ہے اسی علم اور اندازے کا دوسرا نام معرفت ہے معرفت کے بغیر کوئی چیز مل بھی جائے تو اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا۔ احساس جب یہ ہو کہ اس نعمت کے حصول کے بغیر زندگی ناتمام ہے اس میں کوئی کشش اور کوئی جاذبیت باقی نہیں رہ جاتی تو انسان نعمت کو ہر قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جان دے کر بھی اسے یہ سودا گراں معلوم نہیں ہوتا۔ گرانی تو اس وقت ہوتی ہے جب طلب ہی نہ ہو۔ ذوق اس کے بغیر بھی کوئی تشنگی محسوس نہ کرے۔ زندگی ویسی ہی بہار آفریں معلوم ہو۔ ویسی ہی رنگینیوں کا مرقع نظر آئے۔ ایسے عالم میں انسان زیادہ قیمت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

طلب کسی چیز کو منزلِ مراد بنا لیتی ہے تو قیمت کا سوال اٹھ جاتا ہے۔ کیونکہ مراد کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ مراد زندگی اور زندگی کے ساز و سامان سے وقیع چیز ہے مراد کے سامنے زندگی اور زندگی کے ساز و سامان کی کوئی قیمت نہیں۔ مراد انمول موتی ہے۔ انمول ہیرا ہے۔ اس کی کوئی قیمت نہیں۔ مراد کے سامنے اگر دوسری چیزوں کی کوئی اہمیت نظر آنے لگے تو وہ مراد، مراد ہی نہیں، ایک دھوکہ اور فریب ہے۔ ایک سراب ہے اور اگر مراد کے حصول کا جذبہ ہر چیز کی نفی کر دے ہر چیز کو کالعدم قرار دینے لگے۔ تو مراد کا حسن آشکار ہونے لگتا ہے اور طلب صدیق بن کر سامنے آجاتی ہے۔

مراد کے حصول کا صدیق جذبہ سود و زیاں سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔ آنکھ رائی مراد کی ہوتی ہے اور جب مراد کا حسن بے حجاب ہو کر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تو صاحب مراد اور مراد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مراد دامنِ نظر میں آجانے کے بعد دل میں اتر جاتی ہے اور دل میں اتری ہوئی مراد کو کوئی دل سے جدا نہیں کر سکتا۔ جدائی تو اس مراد کی ممکن ہوتی

ہے جو دل میں نہ اترے۔ رگ رگ میں نہ سمائے۔ احساسات کو متاثر نہ کرے۔ احساسات کو بلند کرنے والی احساسات میں سمائی ہوئی اور دل میں اتری ہوئی مراد کو دل سے کون جدا کر سکتا ہے؟ وہ توجہات کا طلسم ٹوٹنے کے بعد بھی دل سے جدا نہیں ہوتی۔ روح میں بسی رہتی ہے احساسات کو لذتیں عطا کرتی ہے۔

مراد لذت ہے اور لذت مراد دونوں میں تفریق ممکن نہیں۔ مراد ہوگی۔ تو لذت بھی بے پایاں عطا کرے گی۔ اور بے پایاں لذت کی موجودگی میں مراد دل سے جدا نہیں ہوتی۔ دل بھی تسکین یاب ہوتا ہے اور روح بھی۔ کبیدگی تو پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب مراد اور صاحب مراد میں وصل نہ ہو۔ دونوں میں فاصلے ہوں۔ دونوں میں جدائی ہو۔ جدائی نام ہی مراد سے دوری کا ہے۔ مراد دور رہ کر بھی نوازنے لگے۔ تو دل سے مرحبا کی صدائیں اٹھنے لگتی ہیں۔ اور اگر قرب بھی مراد کو متوجہ نہ کر سکے تو ایسا قرب بھی نعمت نہیں کہلاتا۔

اویس قرنی کی دوری بھی قرب کی حیثیت رکھتی تھی۔ رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی کا قرب بھی حجاب تھا۔ اس لئے کہ وہ قریب رہ کر بھی انوارِ نبوت نہ دیکھ سکا۔ اور اویسؓ قرنی کی صدیق طلب کے جذبات نے قرب کے سارے مراحل طے کرائے۔ دوری کے تمام حجابات کو اٹھا دیا۔ اب صاحب مراد اور مراد میں کوئی بُعد نہ تھا۔ کوئی فاصلہ نہ تھا۔ کوئی دوری نہ تھی۔

یہاں قرب ہی قرب تھا۔ ہجر میں بھی وصل کی لذتیں نصیب تھیں۔ مشاہدے کی دولت دل کو نئی نئی لذتیں عطا کر رہی تھی۔ یہاں دید ہی دید تھی۔ کیف ہی کیف تھا۔ سرور ہی سرور تھا۔ یہ کیف و سرور یکتائی کی لذتوں کا نتیجہ تھا۔ مراد دل میں اترنے کے بعد بے سروسامانی کی زندگی میں بھی سروسامان رکھنے والوں سے زیادہ کیف و سرور بخش رہی تھی۔

مراد کی نوازشات ان چیزوں کی نوازشات سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔ جو ذوق سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ ذوق کو سیراب نہ کریں۔ ذوق کو تسکین نہ بخشیں۔ ایسی نوازشات چونکہ صرف صاحب مراد کا حصہ ہوتی ہیں۔ اس لئے ان سے کوئی دوسرا انسان لذت گیر نہیں ہو سکتا

مراد جس نوعیت کی ہوگی ویسی ہی لذتیں عطا کرے گی۔ کثیف ہوگی تو کثافتیں بخشے گی۔ لطیف ہوگی تو لطافتوں سے ہم آہنگ کر دے گی۔

اور پھر لطافتوں کے بھی مختلف درجے ہیں۔ جس رنگ کی مراد لطیف ہوگی۔ ویسی ہی لطیف لذتیں ملیں گی۔ لطافت سے لطافت کے سوا اور کیا۔ صادر ہو سکتا ہے۔؟

نبیؐ اور رسول

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کو حضور علیہ السلام نے ایک قادگی طرف امیر لشکر بنا کر بھیجا تو انہیں یہ تاکید فرما دی کہ جب تم معاہدہ کر دیا تو ڈر تو اسے اپنی صواب دید پر موقوف سمجھنا یہ نہ کہنا کہ یہ کام میں خدا کی مرضی سے کر رہا ہوں۔

مقصود رسالت یہ تھا کہ نبیؐ اور رسول پر وحی کا نزول ہوتا ہے۔ وحی کے ذریعے اسے خدا کی مرضی سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ اور تمہاری یہ حیثیت نہیں۔ تم حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ تمہارا فعل خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم نیک نیتی سے کام کرو۔ لیکن وہ درست نہ ہو۔ خدا کی مرضی؛ وہ نہ ہو۔ نبیؐ اور رسولؐ کے اقدامات چونکہ وحی ربانی کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں غلطی کا شائبہ نہیں ہوتا۔ کبھی نبیؐ کے فیصلے کو بھی وحی کے ذریعے بدل دیا جاتا ہے اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ کی شان ظاہر ہو اکہ کوئی انسان عبودیت کے کتنے ہی اعلیٰ اور ارفع مقام پر فائز کیوں نہ ہو جائے اس کا علم اور فہم رب تعالیٰ کی حکمتوں کو محیط نہیں ہو سکتا۔ نبوت کے جو فیصلے بدلے نہیں جاتے۔ وہ عندیہ من اللہ ہوتے ہیں۔ اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہوتے ہیں۔ کہ ان میں رب تعالیٰ کی شان کی جلوہ گری ہے۔

غرض نبیؐ کے فیصلے کو کوئی دانشور نہیں بدل سکتا۔ نبیؐ اگر کسی کی درخواست کو شرف پذیرائی بخشتی دے اس کی التجا پر اپنے فیصلے میں ترمیم کرلے تو اس کا اسے پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح نبیؐ اور رسولؐ کے اختیارات ظاہر ہوتے ہیں جو اسے رب تعالیٰ کی طرف سے

تفویض ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی انسان نبی کے فیصلے پر حرف گیری نہیں کرسکتا۔

صحابہؓ جن پر نبوت کا مفہوم آشکارا تھا۔ ان کی زندگیوں میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا۔ کہ انہوں نے نبوت کا کوئی فیصلہ بدلنے کی کوشش کی ہو۔

جنّت اور دوزخ

انسان جسے احسن التقویم کا لباس پہنایا گیا ہے اس کی تخلیق دوسری اشیائے عالم سے یکسر مختلف واقع ہوئی ہے قدرت کی ندرت کاریاں اور حیرت زائیوں کا یہ حسین و جمیل مجموعہ اپنی تخلیق کے اعتبار ہی سے منفرد شان کا حامل نہیں، اپنے اخلاق و اعمال، جذبات و خیالات اور گفتار و کردار کی جو یہ بوقلموں تصویریں پیش کرنے اور انہیں نئے نئے رنگ دینے کی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ ان سے دوسری مخلوق محروم ہے خواہ وہ ارضی ہو یا سماوی عالم سفلی اور علوی سے تعلق رکھنے والی تمام چیزوں کے فرائض حیات محدود ہیں۔ وہ اپنی محدود دنیا سے آگے گذر کر کوئی شعبدہ نہیں دکھا سکتیں۔ لیکن انسان کی کرشمہ سازیوں کا جہان غیر محدود ہے۔ یہ چونکہ ایک لامحدود قدرتیں رکھنے والی حیّ و قیوم ذات کا مظہر ہے۔ اس کے ذریعے ذات و صفات کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ اسی لئے اسے بھی بے پناہ قوتوں سے نوازا گیا ہے۔ یہ جلال کا مظہر بھی ہے اور جمال کا بھی، ہدایت دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اور گمراہ کرنے کی قوت بھی۔ خیر و شر کے اس مجموعے کو بلندیاں بھی نصیب ہیں اور پستیاں بھی پستی اور بلندی دونوں کی اسے مقدرت دے دی گئی ہے۔ پرواز کرنے پر آتا ہے تو قدسیوں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ ان کی عظمتیں بھی اس کی عظمت کے سامنے ہیچ نظر آنے لگتی ہیں۔ اور قعرِ مذلّت میں گرتا ہے تو اس کی پستیوں کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ عظمت حاصل کرنے کی جو اسے قوت دی گئی ہے وہ قدسیوں کو بھی نصیب نہیں۔ اس لئے کہ ربانی ارشاد کے مطابق قدسیوں کا ایک مقام معلوم ہے تسبیح و تقدیس کی بدولت وہ اپنے مقام معلوم سے آگے نہیں جا سکتے اور اس کی تسبیح و تقدیس کی شان نرالی ہے۔ یہ تسبیح و تقدیس کی

کثرت اور لذت کی بدولت ہر مقام سے گزر سکتا ہے۔ اس کے لئے قرب و معرفت اور عرفان کا کوئی دروازہ بند نہیں۔ قدسیوں کا عرفان محدود ہے ان کی معرفت بھی غیر محدود نہیں۔ اور ان کے قرب کی حد دو بھی متعین ہیں۔ لیکن انسان کا نہ عرفان محدود ہے اور نہ معرفت، نہ قرب اس کی ترقی کی رفتار سے قدسیوں کی ترقی کی رفتار کو کوئی نسبت نہیں۔ وہ حضر میں ہیں۔ اور یہ سفر میں، اور اس کے سفر کو کوئی انتہا نہیں۔ نور کی منزل کا یہ مسافر اگر ظلماتی سفر اختیار کر لیتا ہے۔ تو ظلمتیں ہی اس کے جلو میں ہوتی ہیں اور ظلمت ہی اس کی آخری منزل۔ نور کی منزل کا نام جنت ہے کیونکہ وہاں حسنِ مطلق کی جلوہ نمائی ہوگی۔ نور کی منزل کا مسافر نور کو بے حجاب دیکھے گا۔ نورانی جلوؤں سے اپنے دیدہ و دل کو تسکین دے گا اور ظلماتی منزل کا مسافر ظلمات کی آخری منزل دوزخ میں ہوگا۔

جنت اور دوزخ دو مختلف منزلیں ہیں۔ ایک یار کی جلوہ گاہ ہے اور اسے جنت کا نام دیا گیا ہے۔ اور ایک پردہ و حجاب جو دوزخ کے نام سے موسوم ہے۔ جنت جمال کی تجلّی کا مقام ہے اور دوزخ جلال کا آئینہ۔ آئینے دونوں ہیں۔ جنت بھی اور جہنّم بھی، لیکن ایک سراسر جمال ہے اور ایک سراسر جلال۔ دونوں کے حصول کی اسے مقدرت عطا کر دی گئی ہے۔ ظلمت کی راہ پر گامزن ہو کر یہ ظلمت کے منتہا کو پہنچ سکتا ہے ظلمت کے اسی منتہا کا نام جہنم ہے اور نور کا سفر اسے نور کی آخری منزل جنت میں لے جائے گا۔ طلب کوئی بھی خالی نہ جائے گی۔ نہ جنت کی نہ جہنم کی۔ نور کی منزل کے ہادی کا نام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اور ظلمت کی منزل کے رہبر کا نام ابلیس۔ حضورؐ کی تخلیق نور سے ہوئی ہے۔ اسی لئے وہ نور کی منزل کی طرف بلاتے ہیں۔ شیطان ناری ہے وہ نار تک پہنچا کر دم لے گا۔ نور و نار کی اس آویزش کا نام معرکۂ کفر و دیں ہے اور یہ معرکہ صرف رزم گاہوں ہی میں نہیں لڑا جاتا۔ دلوں کے محاذ پر بھی لڑا جاتا ہے۔ دل کے محاذ پر شیطان کو شکست دینے والا عظیم غازی کہلاتا ہے۔ اسی لئے کہ اس محاذ پر جو دشمن اپنا لاؤ لشکر لے کر حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ نظر نہیں آتا۔ اسے صرف ایک لطیف حِس ہی محسوس کرتا

کرسکتی ہے جسے ایمان کا نام دیا گیا ہے۔

معاملات

خانۂ کعبہ جن دنوں قریش کی تحویل میں تھا اور وہ اپنے ذوق و وجدان کے مطابق اس کی حفاظت و صیانت کا فریضہ سر انجام دے رہے تھے۔ ان کا احساس یہ تھا کہ ہم ان لوگوں سے بہتر ہیں جو ترکِ وطن کرکے مدینے جا چکے ہیں اور انہوں نے ایک نئے دین کو دستورِ حیات کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے جب انہوں نے مسلمانوں کے سامنے اِس احساس کا اظہار کیا کہ ہم حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں۔ اور کعبے کی حفاظت و صیانت نے ہمیں مکرم بنا دیا ہے۔ تو مسلمانوں نے جواب دیا کہ ہم نے ایمان لاکر ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کی فضیلتوں کا اجر و ثواب ہمارے حصے میں آیا۔ انجام کار وحی کے ذریعے مسلمانوں کے احساس کی تائید و تصدیق کی گئی اور کعبے کی مجاورت اور زائرین کی تواضع پر فخر کرنے والوں کے اس احساس کو باطل قرار دیا گیا کہ وہ ان لوگوں کے مثیل و مماثل ہو سکتے ہیں۔ جو خدا کی راہ میں ہجرت کے مصائب و آلام سے دوچار ہیں۔ اور انہیں جہادِ حق کی سعادتیں نصیب ہیں۔ کعبے کی مجاورت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا گیا۔ کہ ہمیں اِس کی ضرورت نہیں۔ اور اِس کے مقابلے میں ان لوگوں کی خانہ ویرانی اور بھوک پیاس کو قبول کر لیا گیا۔ جن کی بے سر و سامانی اور خانہ ویرانی اِس یقین و اعتماد کی غمّاز تھی۔ جو انہیں اپنے خالق و مالک پر تھا۔

بھوکے کسی تعلق کی غمّاز بن جائے۔ وہ اس آسودگی کی زندگی سے بہتر ہوتی ہے جو بے ربط، بے نسبت اور بے تعلق رہ کر حاصل ہو۔ ہر ذات اپنی راہ میں پامال ہونے والوں کی عزت و عظمت کی محافظ ہوتی ہے۔ کوئی بھی اپنے دیوانے کی تحقیر برداشت نہیں کرتا۔ اور ذاتِ حق تو بڑی غیور ہے وہ اپنے چاہنے والوں کی ذلّت کیسے برداشت کر سکتی ہے؟ قریش نے ذرا اپنے تفوّق کا اظہار کیا تو رحمتِ حق جوش میں آ پڑی وحی کا نزول شروع ہو گیا کہ یہ بات نہیں جو تم کہہ رہے ہو۔ معاملہ کچھ اور ہے۔

مدرکات

صحابہؓ کا جو وقت بھی حضورؐ کے ساتھ کٹا وہ انعام تھا۔ خواہ یہ وقت کتنا بھی صبر آزما اور مصائب و شدائد سے لبریز کیوں نہ ہو۔ اسی لئے انہوں نے مصائب کی کبھی شکایت نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ قرب سے بڑھ کر کوئی انعام نہیں، جو مصیبت قرب عطا کر دے وہ نعمت ہوتی ہے غم کی زندگی میں اگر محبوب ساتھ ہو تو غم، غم نہیں رہتا۔ کیف و سرور کا پیام بن جاتا ہے۔ محبوب کی معیت میں اگر غم کا احساس باقی رہے۔ دل کی تپش کم نہ ہو۔ درد مزا نہ دے تو یہ تعلق خام ہے محبت کی آگ ابھی بھڑکی نہیں۔ محبوب کی موجودگی کا احساس، غم و آلام کی شدت پر غالب آنے اور اسے محو کر دینے کے قابل نہیں ہو سکا۔ وہ ابھی مغلوب ہے اور حرارت و آلام کے اثرات غالب ہیں۔ محبت کی اس سے بڑھ کر کوئی اور شکست نہیں ہو سکتی کہ کوئی اور جذبہ اسے دبا لے اسے مغلوب کر لے۔ وہ تو ہر میدان میں غالب رہنا چاہتی ہے اپنی صداقت کا لوہا منوانا اور اپنی عظمت قائم کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے اس نے بھی کبھی شکست کھائی ہے؟ ہار مانی ہے؟ وہ تو ازل سے فاتح ہے۔ سر کاٹ کر اسے نیزے کی انی پر ٹانگ دیا جائے۔ تو وہ عظمت کا نشان بن جاتی ہے۔ ہر رنگ میں اسی کا بول بولا رہتا ہے۔ وہ تو زندگی کی رزم گاہ میں آتی ہی۔ اس لئے ہے کہ محبوب کی عظمت کا نشان کہلائے۔ اس کے ذریعے ذی جاہ ذات کی عظمتوں کا اظہار ہو۔ یہ مقصد اسے جان سے عزیز ہوتا ہے۔ اسی دھن میں رہتی ہے۔ یہی سودا اسے مست و سرشار رکھتا ہے۔ مستی میں اسے زیاں کا احساس کہاں ہوتا ہے؟ اس کا تو اپنا کوئی احساس ہی نہیں۔ محبوب کی ذات اسے اپنے احساسات و مدرکات کا آئینہ بنا لیتی ہے۔

دائمی زندگی

دنیوی زندگی غایت درجہ محدود ہے۔ خواہ وہ کتنی بھی طویل کیوں نہ ہو۔ اسے اخروی زندگی

کے جاوداں اور غیر فانی لمحات سے کوئی مماثلت نہیں ہو سکتی۔ وہ بہرحال محدود کہلائے گی محسوب شمار ہو گی۔ کیونکہ وہ ایک جچے تلے اندازے کے مطابق ہوتی ہے اس کے روز و شب کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ماہ و سال اندازے سے باہر نہیں۔ یہ شان تو صرف اخروی زندگی ہی کی ہے کہ اسے عقل کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا وہ سرمدی ہے۔ ابدی ہے۔ اسے روز و شب اور ماہ و سال میں تقسیم کرنا ممکن نہیں۔ شب و روز کے تغیرات اور بہار و خزاں کے موسم آفتاب و ماہتاب کی گردشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لیکن اخروی زندگی میں یہ آفتاب و ماہتاب نہ ہوں گے۔ وہاں جمال کا سورج چمکے گا۔ جس کی روشنی کو زوال نہیں۔ عبودیت کے دل کے چاند کی پھوار ہو گی۔ جو ہمیشہ رہے گی فرق نہ جلوؤں میں آئے گا، نہ انوار میں، جلوہ بھی دائمی ہو گا۔ اور نور بھی سرمدی، اس لئے تغیر و تبدل کی کوئی صورت ممکن نہ ہو گی۔ تغیرات تو ارتقاء کے لئے ہوتے ہیں۔ تکمیل کے بعد تغیر کیسا؟ تکمیل کے بعد تو ثمر اور نتیجہ ہوتا ہے۔ ثمر کی حلاوتیں اور لذتیں ہوتی ہیں۔ نتائج کی صورتیں متشکل ہو کر سامنے آتی ہیں۔ اخروی زندگی بھی دنیوی زندگی کا ثمر اور نتیجہ کہلاتی ہے۔ عامتہ الناس میں یہی مشہور رہے کہ اخروی زندگی دنیوی زندگی کے اعمال کی جزا ہو گی۔ اور یہ کسی حد تک غلط بھی نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے اعمال محدود ہیں۔ جن کی جزا غیر محدود ہو گی۔ دراصل یہ اعمال کی جزا نہ ہو گی۔ اس نیت کی جزا ہو گی۔ جسے محدودیت کی حدود میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔ مومن کی نیت چونکہ یہ ہوتی ہے کہ اگر عمر خضر بھی مل جائے۔ تو نیکی کا تسلسل نہیں ٹوٹنے دوں گا۔ عبودیت کے اظہار کا جو سلسلہ میں نے بندگی کی راہ اختیار کرنے کے بعد شروع کر رکھا ہے وہ تادم زیست جاری رہے گا۔ نیت کا یہی دوام اسے دائمی انعامات کا مستحق بنا دیتا ہے ورنہ محدود زندگی کی محدود عبادت کو تو محدود اجر ہی مل سکتا تھا۔

خدا کے بندے

مقرّب کی بارگاہ نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ نہیں ہوتی۔ اور جو شخص یہ دعویٰ کرنے لگے کہ وہ اپنے پاس آنے والوں کی خواہشات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ وہ شیطان کا نمائندہ تو ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے رحمانی نسبت حاصل نہیں ہو سکتی۔

مقربینِ حق خدا کے بندوں کو حق کی دعوت دیتے ہیں اپنے قول اور عمل سے ان کی اصلاحِ احوال کرتے ہیں۔ عقبیٰ کی زندگی کی بشارات سے بھی نوازتے ہیں۔ لیکن انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تمہاری غربت، امارت سے بدل جائے گی۔ آسمان سے تم پر ہن برسنے لگے گا۔ اور زمین تمہارے لئے اپنے مخفی خزانے اگل دے گی۔ یہ مسخروں اور بہروپیوں کا طرزِ عمل ہے۔ انبیاؑ نے کبھی کسی کو لالچ دے کر نہیں بلایا ان کے پیروکاروں نے بھی ایسا نہیں کیا۔ ہاں رحمت کا قصیدہ پڑھا ہے اپنے رب کی رحیمی و کریمی کے تذکروں سے آنے والوں کی آتشِ شوق تیز کی ہے۔ زخمی دلوں پر مرہم رکھا ہے۔ مایوس دلوں کو زندگی عطا کی ہے لیکن وہ داعی اور رحمت کے قصیدہ خواں کے منصب سے گزر کر ذمی اختیار نہیں بنے۔ بالادستی انہوں نے ہمیشہ اپنے رب ہی کی تسلیم کرائی ہے زندگی میں کبھی کبھار ناز کیا بھی ہے تو اس کی حیثیت محض یہ تھی کہ محبت کا پیمانہ چھلک گیا۔ وفورِ جذبات میں وہ بے قابو ہو گئے۔ محبت کبھی بے قابو کر کے بھی نوازتی ہے لیکن بے قابو کر دینے اور بے قابو ہو جانے میں فرق ہے۔ ایک کیفیت حق ہے اور ایک باطل، دنیا کا لالچ دے کر نہ کبھی قدسی بارگاہوں نے بلایا ہے۔ اور نہ لوگ یہ ہوس لے کر وہاں گئے ہیں جب سے ہوس کی گرم بازاری ہوئی ہے۔ اسی وقت سے تقدس زر و سیم کے حصول کا ذریعہ بنا ہے۔

تقدّم و تاخر

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ممتاز صحابی کعب بن احبارؓ کے حالات میں مذکور ہے

کہ ان کا معمول تھا۔ نماز کی پچھلی صف میں آ کر شریک ہوتے اُن کا یہ طرزِ عمل بعض صحابہؓ کے لئے حیرت کا موجب تھا۔ انہوں نے کعبؓ سے اس کی وجہ دریافت کی کعبؓ بولے کہ میں نے ایک آسمانی صحیفہ میں دیکھا ہے کہ نبی آخر الزّماں کی اُمّت میں بعض ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے پیچھے نماز پڑھنے والا بھی خدا تعالیٰ کے خصوصی انعامات سے محروم نہ رہے گا۔ وہ ابھی سجدے سے سر بھی نہ اٹھائیں گے کہ پیچھے نماز پڑھنے والا بخشا جائے گا۔

کعب بن احبارؓ کا یہی احساس تھا جو انہیں پچھلی صف میں کھڑا ہونے پر مجبور کر دیتا ورنہ صفِ اولی کے فضائل بھی کوئی کم نہ تھے۔ ہوس کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہر جگہ اپنی تقدیم چاہتی ہے ہر جگہ خود کو صفِ اولی میں دیکھنا چاہتی ہے لیکن صدّاقی جذبات ہوں تو انسان خود کو بلند و بالا مقام پر دیکھنے کی بجائے محبوب کی بلندی اور اسی کی سرفرازی کا آرزو مند رہتا ہے اپنی تقدیم و تاخیر اس کے پیشِ نظر نہیں ہوتی تاخر اگر اسے محبوب کی نظروں میں مقرّب بنانے کا ذریعہ نظر آئے تو وہ تقدّم کو نظر انداز کر کے تاخر کو معمولِ حیات بنا لیتا ہے اور اگر تقدم کے ذریعے محبوب کی شان کے اظہار کا امکان ہو تو وہ اسے اختیار کر لیتا ہے اس لئے اس کا تاخیر بھی تقدم ہے اس کی تاخیر بھی تقدیم پر فوقیت رکھتی ہے کیونکہ اس کی تقدیم و تاخیر اپنی ذات کے لئے نہیں ہوتی۔ محبوب کی رفعتِ شان کے اظہار کے لئے ہوتی ہے۔

عملی نفاق

نفاق کی ایک قسم تو یہ ہے کہ دل میں ایمان موجود نہ ہو اور زبان اسلام کی زمزمہ خواں رہے منافقین کی یہ قسم عہدِ رسالت میں پائی جاتی تھی۔ جو زبان سے توحید و رسالت کا اقرار بھی کرتی تھی۔ اسلام کے محاسن بیان کرنے میں بھی پیش پیش تھی۔ لیکن اپنے ابنائے جنس کے پاس جا کر اسلام کا مذاق اڑاتی تھی۔

منافقین کی ایک قسم وہ ہے جو دل سے ایمان لانے کے بعد ان اعمال سے گریز نہیں کرتی

جنہیں نفاق کی علامت کہا گیا ہے۔ جھوٹ بولنا۔ راہِ حق سے گریز کرنا۔ اسلام کو مظلوم و مقہور دیکھ کر اسے ظلم کے پنجے سے نجات دلانے کے لئے عملی جد وجہد نہ کرنا۔ خدا کی راہ میں مال صرف کرنے سے گھبرانا۔ امانت میں خیانت کرنا۔ اس نوع کے اعمال کا تعلق بھی نفاق سے ہے گو یہ عملی نفاق ہے اعتقادی نفاق سے اس کا تعلق نہیں۔ لیکن اسے نفاق سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ خیانت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کسی کے مال میں تصرّف کیا جائے۔ کسی کا راز افشا کر دینا بھی خیانت ہے بندہ کو اللہ کریم نے جو نعمتیں عطا کی ہیں ان سب کی حیثیت، امانت کی ہے۔ مال و دولت ہی انعام نہیں عزت و شہرت بھی انعام ہے اور جن صلاحیتوں سے قدرت نے انسان کو نوازا ہے وہ بھی انعام ہی کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں خیانت کرنے والا بھی مجرم ہوگا زبان کا غلط استعمال بھی خیانت ہے۔ ذہانت کو معروفات کی بجائے منکرات میں صرف کیا جائے گا۔ تو وہ بھی خیانت کہلائے گا۔ اپنے اثر و رسوخ سے باطل کی حمایت کی جائے گی۔ تو وہ بھی مجرمانہ فعل ہوگا۔ فکری محاذ پر باطل کو شکست دینے کے عزم کے ساتھ صف آرا ہو جانا بھی ایک جہاد ہے اور اس سے تساہل برتنا بدترین قسم کا جرم ہے جسے عملی نفاق سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ غرض خیانت یہ ہے کہ امانت میں تصرّف کیا جائے۔ اور صلاحیتیں سب امانت کے زمرے میں آتی ہیں۔ غلط استعمال ہوں گی تو پھر بھی انسان خائن ہوگا۔ سرے سے انہیں استعمال ہی نہ کیا جائے گا تو یہ بھی خیانت ہوگی۔ یہ تو کسی مقصد کے لئے دی گئی ہیں۔

احکام و مسائل

دینی احکام کو دو اقسام پر منقسم کیا گیا ہے ایک قسم کا تعلق معتقدات سے ہے اور دوسری کا اعمال سے، اعمال سے تعلق رکھنے والے احکام کو احکام فرعیہ کا نام دیا گیا ہے اور جن احکام کا معتقدات سے تعلق ہے انہیں احکام اصلیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

دونوں قسم کے احکام کتاب وسنت اور اجماع وقیاس سے مستنبط ہوتے ہیں۔ اعتقادی احکام کی علمِ کلام سے بھی تعبیر کی گئی ہے لیکن فقہ کو فروعی مسائل کا مجموعہ کہا گیا ہے، فقہ لغوی اعتبار سے تو فہم کو کہا جاتا ہے لیکن اصطلاحِ شرح میں اس کا اطلاق ان شرعی احکام ومسائل پر ہوتا ہے۔ جن کا تعلق اصول سے نہ ہو بلکہ وہ فروعات سے تعلق رکھنے والے ہوں۔ فقہ مرادِ متکلم کو پالینے کو نام بھی ہے اور جو اپنے مخاطب، اپنے متکلّم کی مراد پالے اسے امام اور مجتہد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مخاطب خواہ کوئی ذات ہو اس کی مراد پانے کے لئے اس کی زبان کا جاننا ہی ضروری نہیں ہوتا۔ اس سے شناسائی اور روحانی رابطہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ روحی رابطہ کے بغیر محض لغت کی مدد سے جو مفہوم اخذ کیا جائے گا وہ لغت دانی کا آئینہ دار تو ہوسکتا ہے لیکن اسے مزاج شناسی اور مزاج دانی کا آئینہ دار نہیں کہا جاسکتا۔

ربّانی کلام کو سمجھنے کے لئے اگر محض لغت کے اوراق کی ورق گردانی کافی ہوتی۔ تو نعوذ باللہ خدا تعالےٰ کو اس کثرت اور تواتر سے انبیا علیہم السلام کو بھیجنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اتنا کہہ دیا جاتا کہ لغت کے اوراق کی ورق گردانی کر لو۔ ہمارے کلام کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ لیکن قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ اے رسول ! یہ قرآن تیری زبان سے آسان کر دیا گیا ہے۔

گویا مفسّر زبانِ رسالت قرار پائی ہے حضورؐ کا فعل بھی مفسر ہے قول بھی مفسر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے غلام بھی جنہوں نے انوارِ نبوّت سے بہرہ ور ہو کر ربّانی تعلیمات کو پیش کیا ہے قرآن میں حضورؐ کو معلّم کتاب وحکمت بھی کہا گیا ہے مزکّی کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے یہ رسالت کے فرائض ہیں اور انہی پر نوعِ انسانی کی بھلائی کا دار و مدار ہے۔

خواب اور تعبیر

خواب اور خواب کی تعبیر کے متعلق اسلام میں جو تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کا عشرِ عشیر بھی کسی اور مذہب میں نظر نہیں آتا۔ اسلام چونکہ ایک مکمل مذہب اور دینِ فطرت ہے اس

لئے وہ حیات کے حسن و قبح ہی سے بحث نہیں کرتا - ان عوامل و مضمرات اور اسرار و رموز پر بھی بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے - جن کا حیاتِ انسانی سے گہرا ربط اور رشتہ ہے۔
ظاہر ہے کہ خواب بھی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی طرح ایک قوی حقیقت ہے بعض حقیقتوں کو ہم بیداری میں دیکھتے ہیں - اور بعض کو خواب میں - بعض کا تعلق سر کی آنکھوں سے ہوتا ہے - اور بعض کا روح و قلب کی آنکھوں سے ، انسانی زندگی صرف روحِ حیوانی ہی سے عبارت نہیں اصل چیز انسان میں وہ جوہرِ لطیف ہے جو حیات کا مقصود و منشا ہے جسے انسانی تصویر میں رنگ بھرنے کے لئے دکانِ ازل سے لایا گیا تھا - جو قرآن کی زبان میں امرِ رب کہلاتی ہے اسی نے صبحِ ازل کی جمال آفریں روشنی میں آنکھ کھولنے کے ساتھ ہی اقرارِ ربوبیت کیا تھا - جو تخلیق کے مطلع اوّل پر ابھرنے کے ساتھ ہی خطاب کی لذتوں سے بہرہ یاب ہوئی - عالمِ ہست و بود میں آئی تو روحِ انسانی کہلائی - یہی روح نیند میں حواس کی گرفت کمزور ہو جانے کے باعث بدن سے نکل کر سیر و سیاحت کے لئے روانہ ہوتی ہے اسی کے مشاہدات کو خواب کا نام دیا جاتا ہے - اپنے اپنے مقامات و درجات کے اعتبار سے چونکہ سیر و سیاحت کے عالم بھی مختلف ہوتے ہیں - اسی لئے مشاہدات میں بھی فرق ہوتا ہے - اندھے یا کمزور بینائی رکھنے والے کا مشاہدہ بینا کے مشاہدے کے مماثل نہیں ہو سکتا۔
انبیائے علیہم السلام کے خواب اسی لئے حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں کہ ان کی روحیں غایت درجہ لطیف اور پاک ہوتی ہیں - جن فضاؤں میں ان کی پرواز ہوتی ہے وہاں بھی انوار کے سوا کچھ نہیں ہوتا - نبیؑ کی روح بے پردہ و بے حجاب دیکھتی ہے -
اس میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا - بیٹے کو خواب میں ذبح کرتا ہوا دیکھے تو اسی کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے عمرہ کا منظر نظر آئے تو حالات کی ناسازگاری کو نظر انداز کر کے احرام باندھ لیتا ہے - قدم مکّے کی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔
حضرت یوسفؑ اور یعقوبؑ کی دنیا بھی خوابوں سے لبریز ہے - کتنے حقائق خواب

بن کر ابھرے اور ان کی دنیا پر چھا گئے خواب کی کبھی تعبیر کی جاتی ہے اور کبھی خواب میں نظر آنے والے حقائق و مناظر ہو بہو سامنے آجاتے ہیں۔ خواب کی یہ دوسری قسم رویا کہلاتی ہے۔ اس میں تمثیل، اشارہ اور کنایہ نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقت کی جلوہ گری ہوتی ہے حضرت یوسف ؑ کے خواب میں چاند، سورج، ستاروں سے مراد ماں باپ اور بھائی ہیں۔ عزیز مصر کو بھی خواب میں جو موٹی اور تپلی گائے نظر آئیں ان سے بھی تنگی اور خوش حالی کے سال مراد تھے۔ اور قید خانے میں بھی یوسف علیہ السلام نے جو دو تعبیریں دیں۔ ان میں بھی خواب اور رویا کا فرق نمایاں تھا۔ سر سے پرندوں کے گوشت کھانے کا مفہوم موت تھا۔ اور ساقی گری کے معنی قرب یہ یوں ہی واقع ہوا۔

نبی ؑ کے خواب کی طرح نبی ؑ کی دی ہوئی تعبیر بھی غلط نہیں ہوتی۔ ایک عورت نے حضور علیہ السلام کے پاس آکر ایک دفعہ یہ خواب بیان کیا کہ اس کے گھر کا ستون گر گیا ہے حضور ؐ نے اس کی تعبیر دی کہ تیرا شوہر سفر سے واپس آجائے گا۔ ایک سے زائد بار خاتون نے خواب دیکھ کر زبانِ نبوت سے یہ تعبیر سنی لیکن ایک دفعہ یہی خواب دیکھ کر وہ تعبیر معلوم کرنے کے لئے آئی۔ تو اسے حضور ؐ کی زیارت نہ ہو سکی۔ چنانچہ اس نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضؓ کی طرف رجوع کیا۔ اور انہوں نے یہ تعبیر دی کہ تیرا شوہر حالتِ مسافرت میں فوت ہو گیا ہے جب اس واقعہ کا حضور ؐ کو علم ہوا تو آپ نے عورت سے فرمایا کہ تو نے اکیے مجھ سے کیوں نہ پوچھا؟ عائشہ رضؓ سے کیوں استفسار کیا؟ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعبیر کا خواب سے گہرا لگاؤ ہے۔ تعبیر لیتے وقت بڑی رعایتوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے سچے خواب بھی انعاماتِ ربانیہ میں سے ہیں۔ اور ان کی تعبیرات کا علم بھی عنایاتِ ربانیہ پر موقوف ہے جو انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے۔ جو فیوضِ نبوت سے بہرہ ور ہوں۔

خلاف اور اختلاف

امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک عبادت کی دو قسمیں ہیں ایک عبادتِ مقصودہ اور ایک عبادتِ غیر مقصودہ۔

عبادتِ مقصودہ، امام اس عبادت کو قرار دیتے ہیں۔ جو بذاتِ خود عبادت ہو اور کسی دوسری عبادت کے لئے آلہ اور وسیلہ نہ ہو اور غیر مقصودہ عبادت وہ اسے کہتے ہیں۔ جو خود تو عبادت نہ ہو لیکن دوسری عبادت کے لئے آلہ اور ذریعہ ہو۔ نماز، روزہ حج، زکواۃ وغیرہ چونکہ کسی دوسری عبادت کے لئے وسیلہ نہیں اس لئے امام حنیفہ رح انہیں عبادتِ مقصودہ کا نام دیتے ہیں۔ عبادتِ مقصودہ میں امام رح کے نزدیک نیت شرط ہے لیکن عبادتِ غیر مقصودہ میں وہ نیت کو فرض نہیں مانتے۔ ہاں سنت قرار دیتے ہیں۔ شریعت کے باقی ائمہ رح کے نزدیک عبادتِ غیر مقصودہ میں بھی نیت ضروری ہے لیکن امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر صرف نظافت حاصل کرنے کے لئے غسل کر لیا جائے اور کپڑے بدل لئے جائیں۔ تو ایسے پاک صاف بدن سے نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ گو وضو کا ثواب نہ ملے گا۔ کیونکہ غسل کے وقت وضو کی نیت نہ تھی۔ تیمم چونکہ وضو کا قائم مقام ہے اس لئے امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک اس میں نیت ضروری ہے نیت کے باب میں اس اختلاف کے باعث بہت سے فروعی مسائل میں اختلاف ظاہر ہوتا ہے جو امام اعظم کے مسلک کو دوسرے ائمہ دین کے مسلک سے جدا کرتا ہے۔

لیکن یہ اختلاف مذموم نہیں اس لئے کہ اس کی بنیاد للہیت اور تقویٰ پر قائم ہے جن لوگوں سے یہ اختلاف ظاہر ہوا، اوّل تو انہیں دین میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ پھر ان کی زندگیاں راست بازی اور تقویٰ شعاری کی مکمل تصویریں تھیں۔ مادی منفعت سے ان کا دامن آلودہ نہ تھا۔ مزید برآں ان کے کچھ اصول تھے جہاں نہ اصول ہوں نہ دلیل۔

و برہان اور تقویٰ تو ایسے لوگوں کے عقائد و اعمال اور افکار و نظریات کو اختلاف کا نام نہیں دیا جاسکتا یہ سراسر خلاف ہوتا ہے ۔ اختلاف میں دلیل ہوتی ہے اور خلاف، نفس کی سرکشی کا آئینہ دار کہلاتا ہے ۔ جو خدا سے لاتعلقی اور نفس کی بغاوت کے نتیجے میں ظہور پاتا ہے خلاف کو کُریدکر دیکھا جائے تو اس کے پس پردہ ضرور ہوس کی کارفرمائی ہوگی ۔ اختلاف میں یہ بات ممکن نہیں ۔

ربّانی تیور

قوی بارگاہ میں اپنے ضعف کا اعتراف انسان کو مزید انعامات کا مستحق بنا دیتا ہے ۔
موسیٰ علیہ السلام کو جب نبوّت ملی عصا اور یدِ بیضا سے نوازا گیا ۔ انشراحِ صدر ہو چکا ۔
ہارون عؑ کی رفاقت نصیب ہو گئی اپنے رب کی ہم کلامی کی لذت سے سینہ معمور ہو گیا ۔
اور انہیں فرعون کی طرف جانے کی ہدایت ہوئی تو انہوں نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہیں وہ میرے ساتھ زیادتی نہ کرے ۔

یہ مزید انعامات کی طلب تھی جو اندیشے اور کھٹکے کی صورت میں ظاہر ہوئی ۔ اس اندیشے میں چونکہ اپنے ضعف اور فرعون کے اس غلبے کی طرف اشارہ تھا ۔ جو اسے ساز و سامان کی بدولت حاصل ہو چکا تھا ۔ اس لئے ارشادِ ربّانی ہوا کہ اچھا چلو ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے ؟

موسیٰ علیہ السلام اگر عصا اور یدِ بیضا پانے کے بعد ان نعمتوں سے نوازے جانے کے باوجود جو انہیں وادئ ایمن میں عصا اور یدِ بیضا کے علاوہ عطا ہوئی تھیں ۔ خاموش رہتے اور اپنے ضعف کا اعتراف نہ کرتے تو انہیں اس انداز سے معیتِ حق نصیب نہ ہوتی ۔ جس کا یہ کہہ کر برملا اظہار کیا گیا کہ چلو ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں ۔ فرعون کو دیکھتے ہیں کہ وہ کتنے پانی میں ہے اس کا ساز و سامان کیا حیثیت رکھتا ہے ؟ یہ معیت اظہارِ ضعف کے نتیجے میں انعام

کے طور پر ملی تھی۔

ربانی تیور صاف بتا رہے ہیں کہ خدا تعالےٰ کا قہر و غضب جوش میں آچکا ہے۔ جلالِ الٰہی کی نمود ہو چکی ہے - فرعون ہلاک ہو گا - اور موسیٰؑ کامیاب ہوں گے۔ یہ قہر و غضب کا اظہار اور فرعون کو نیست و نابود کر دینے کا عزم، موسیٰؑ کے اسی ایک جملے کی بدولت ہوا جو انہوں نے اپنے رب کے سامنے اپنے ضعف کے اظہار کے لئے ادا کیا۔ موسیٰ علیہ السلام پر ہی کچھ موقوف نہیں۔ بندہ خواہ کتنا ہی عاصی اور خاطی کیوں نہ ہو۔ جب وہ سچے دل سے اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیتا ہے تو خدا کی نصرتیں اسے پہنچتی ہیں۔ رزم گاہِ حیات میں وہ تنہا ہوتے کے باوجود تنہا نہیں ہوتا غیر مرئی قوتیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں - جو اسے بچاتی ہیں - سہارا دیتی ہیں - اور ہر شر سے محفوظ رکھتی ہیں۔

بشارت اور دُعا

مومن کو دنیا اور آخرت دونوں جہان میں حسنات ملتی ہیں ان حسنات کا دائرہ کوئی محدود نہیں - دنیا میں بھی ان کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں اور آخرت میں بھی ان کا سلسلہ بڑا وسیع ہو گا ۔ اعمال کا حسن جو اخروی نعمتوں کی صورت میں سامنے آئے گا۔ اور دنیا میں انسان کا نام نیکو کاروں اور خدا تعالیٰ کے نیک اور پاک انسانوں کے نام کے ساتھ اگر زندہ رہ جاتا ہے تو اسے بھی حسنات ہی کی ایک صورت کہا جا سکتا ہے۔ موت کے بعد بھی مومن کو نیک دعاؤں کا اجر و ثواب ملتا ہے۔ یہ بھی حسنات کی تبدیلی کی شے ہے کافر کو اس نوع کا ثواب نہیں ملتا۔ اس کے حق میں ایسی دعا نہیں کی جاتی یوں بھی کافر کا تصوّرِ حسنات بہت محدود ہے وہ دنیا میں بھی صرف ایسی چیزوں کو حسنات جانتا ہے جو حیات دنیوی میں نفع پہنچانے والی ہوں اور آخرت کا تصوّر تو کفار و مشرکین پر واضح نہیں اس لئے وہ اُس جہان میں ملنے والی اَن گنت نعمتوں کا تصوّر کیسے کر سکتے ہیں۔ مومن اپنے رب کی بے پناہ رحمتوں پر یقین رکھتا ہے - اسی لئے وہ

اپنے مرحومین کے لئے دعاؤں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے خواہ اسے اُن کے مغفور ہونے کا یقین ہی کیوں نہ ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ اُن کے مقامات و درجات میں اضافہ ہو۔ مقبول بندوں کے لئے جو دعائیں کی جاتی ہیں۔ ان کا مقصود بھی یہی ہوتا ہے۔

مومن کو جب مومن سلام کہتا ہے تو اس کی حیثیت بھی حسنات کی ہوتی ہے۔ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے لئے اچھا خواب دیکھتا ہے تو حدیثِ نبوی کے مطابق اُس کی حیثیت مبشرات کی ہوتی ہے۔ بعض اوقات مومن کو اپنے متعلق کوئی اچھی بات نظر آجاتی ہے۔ اور بعض اوقات کوئی نیک اور پاک باز انسان دعائیں دینے لگتا ہے۔ یہ سب حسنات کی قبیل کی چیزیں ہیں۔ دعا اور بشارت بھی انعام ہے خواہ یہ دعا سوز مندی کے ساتھ خود کی گئی ہو یا دوسرے نے دی ہو۔ بشارت کا بھی یہی معاملہ ہے بشارت خود کو ملی ہو۔ یا کسی نے خواب دیکھا ہو۔ بشارت ہر حال میں بشارت ہے۔

اذان حضرت عمرؓ نے خواب میں سنی تھی جو پوری امت کے لئے بشارت بن گئی۔ حضورؐ نے اسے شرفِ قبول بخشا اور مساجد کی فضائیں اِن نغموں سے معمور ہو گئیں تو اب ایک مومن کا تھا۔ اور نوازے سب گئے ایسے ہی یا ساریۃ الجبل کہہ کر حضرت عمرؓ نے حضرت ساریہؓ کو جو ندا دی تھی وہ بھی بشارت تھی۔ ایک بشارت کا تعلق خواب سے تھا۔ اور ایک کا بیداری سے، بیداری میں حضرت عمرؓ کو جنگ کا نقشہ دکھایا گیا تھا۔ اور انہوں نے سالارِ لشکر ساریہؓ کو آواز دے کر پہاڑی کی اوٹ میں ہو جانے کے لئے کہا تھا یہ بشارت اگرچہ حضرت ساریہؓ کو دی گئی تھی۔ لیکن اس کا مسلمانوں کے اجتماعی مفاد سے تعلق تھا۔ غرض انفرادی یا اجتماعی بشارات صرف مومنوں کے لئے ہیں۔ کفر کا اس نوع کی بشارات سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے ربّ تعالیٰ کی طرف سے خواب یا بیداری میں کوئی بشارت نہیں ملتی۔ خوف یا حزن کے وقت مسلمان کو جو تسکین مل جاتی ہے حالات کے ناساز گار ہونے کے باوجود وہ مطمئن نظر آنے لگتا ہے تو یہ بھی ربانی بشارت ہی ہوتی ہے۔ یہ تسکین

روح و قلب بن کر اس پہ اترتی ہے حالات خوش ہونے ہیں۔ اور وہ اپنے رب سے لَو لگائے ہوتا ہے۔ اس کا دل شہادت دیتا ہے کہ رنج و غم کی یہ ساعتیں دائمی نہیں۔ مصائب و آلام کے بادل چھٹ جائیں گے۔ اور زندگی کے مطلع پر مسرتوں کا آفتاب تجلیاں بکھیرے گا۔ یاس کے دھندلکوں میں یقین کا یہ نور جو فروزاں نظر آنے لگتا ہے۔ یہ بھی خصوصی کرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بھی ربانی انعام کہا جاتا ہے کا فر بے چارگی میں کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ بندۂ اسباب ہوتا ہے۔ اسباب ہی اسے رنجیدہ اور شاداں بناتے ہیں۔ اور مومن کو بے کلی اور بے بسی میں ملنے والی تسکین عطیۂ ربانی کہلاتی ہے وہ خارجی دنیا سے تعلق رکھنے والی چیز نہیں ہوتی ولیِ یزداں سے عطیہ بن کر آتی ہے اور دل میں اتر جاتی ہے روح کی سرستی دل و جاں کی سیرابی اور نظر کی شادابی کا تعلق اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت سے ہے یہ اسباب و علل کی پابند نہیں۔ اسباب و علل کے جہان سے ماورا اور بھی جہان ہیں۔ جہاں کی لذتیں اہلِ ایمان کے لیے ہیں۔ اور جنہیں کوئی نہیں چھین سکتا۔

سعی و عمل

انسانی سعی و کوشش کا تعلق انسان کی ذات سے ہے اور کوشش کو بارآور کرنا محنت کو ثمر دینا رب تعالیٰ کی شان ہے بسا اوقات جب ہم اپنی محنت کا حاصل ناکامیوں اور نامرادیوں کی صورت میں دیکھتے ہیں تو ہم مضطرب ہو جاتے ہیں۔ کہ ایسا کیوں ہوا۔ ہمیں تو اپنی اخلاص مندی کا پورا پورا اجر ملنا چاہیئے تھا۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ نتیجہ ہمارے اختیار میں نہیں اور نہ خدا کے افضال و اکرام کی بارش اسباب کی منت پذیر ہے حیات جو خود ایک بہت بڑا انعام ہے کسی سبب کا نتیجہ نہیں۔ انبیاء علیہم السلام نے زندگی بھر اصلاحِ احوال کی کوشش کی اُن میں سے بیشتر نے طویل عمریں پائی ہیں ان کی کوشش یہی رہی ہے کہ انسان سیدھی راہ پر آجائے۔ طاغوت کی بندگی چھوڑ کر خدا کی عبادت کرنے لگے لیکن انہیں اس سعی و کوشش کا جو صلہ ملا۔ وہ ہم سے پوشیدہ نہیں۔ انبیاء

کو جھٹلایا گیا ان کی تکذیب کی گئی اور انہیں طرح طرح سے تنگ کیا گیا لیکن انہوں نے اپنے رب سے یہ شکایت نہیں کی کہ ہماری کوشش یں رائیگاں گئی ہمارے اخلاص کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا حالانکہ انبیاؑ کی کوشش کوئی معمولی کوشش نہ تھی ۔ انہیں کڑے امتحانوں سے گزرنا پڑا ۔ راہِ حق میں انہوں نے عظیم قربانیاں دیں ۔ اَن گنت مصائب و آلام برداشت کیے ۔ لیکن ان کی زبان شکوہ سے آلودہ نہیں ہوئی ۔ اور نہ اپنی محنت کو رائیگاں دیکھ کر انہوں نے سعی و عمل کا سلسلہ بند کیا جو کام انہوں نے شروع کیا اسے زندگی بھر نبھایا اور اپنے رب سے یہ بھی نہیں کہا کہ جب یہ لوگ ہدایت کی بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں تو کیوں نہ رشد و ہدایت کا سلسلہ بند کر دیا جائے ، وہ جانتے تھے کہ یہ طرزِ عمل منشائے ربانی کے خلاف ہوگا ۔

یہ درست ہے کہ بعض انبیاؑ علیہم السلام نے نافرمان انسانوں کی ہلاکت کی آرزو کی ہے لیکن یہ آرزو بھی منشائے ربانی کے تحت تھی ۔ رب تعالیٰ کی منشا کے تحت نہ ہوتی تو انہیں ایسی آرزو کرنے سے روک دیا جاتا ۔ رب تعالیٰ کی یہ قدیم سنّت ہے کہ وہ کسی فرد یا قوم کو اپنے لطف و کرم کا مورد بنانا چاہتا ہے ۔ تو اسی نسبت سے اسباب مہیّا فرما دیتا ہے ۔ ایسے ہی عذاب دینا چاہتا ہے تو پھر بھی حالات کے دھارے کا رُخ موڑ دیتا ہے مختصر یہ کہ انبیاؑ کی آرزو از خود نہ تھی خدا کے ارادے کا پرتو تھی اور وہ گھبرا کر از خود دفتہ نہیں ہوتے وہ رضا کے پیکر تھے ۔

زندگی اور موت

حضور علیہ السلام نے لمبی عمر اور مرگِ مفاجات سے پناہ مانگی ہے ۔ حالانکہ لوگ لمبی عمر کی آرزو کرتے ہیں ۔ اور دفعتاً مر جانے والوں کو نظرِ استحسان سے دیکھتے ہیں ۔ یہ نہیں سوچتے کہ اچانک موت میں انسان تو یہ نہیں کر سکتا ۔ وصیّت کرنے کے مواقع کھو بیٹھتا ہے ۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بیماری میں جو تکلیف ہوتی ہے وہ گناہوں کو دھو ڈالتی ہے ۔ کفارۂ گناہ

کا موجب بن جاتی ہے اور انسان مغفرت و رحمت کے قریب ہوجاتا ہے۔ طویل بیماری کی
وہی حیثیت ہوتی ہے۔ جو کسی لڑکی کے والدین کے گھر سے سسرال جانے سے قبل اس کی اس خلوت
کی ہوتی ہے جس میں اسے بٹھا دیا جاتا ہے خلوت میں رہ کر لڑکی کو سسرال کے گھر کا وہ اجنبی
ماحول یاد آتا ہے جس میں اس نے گھر کی مالکہ کی حیثیت سے مستقل زندگی گذارنی ہوتی ہے۔ تنہائی
میں دھیان پچوں کر لئے ماحول کی طرف رہتا ہے سسرال کے گھر کی خیالی فضاؤں دو ماغ پر
چھائی رہتی ہے ذہن نئے نئے نقشے تراشنے لگتا ہے اسی عالم خیال میں میاں کی صورت نظر آنے
لگتی ہے۔ نئے افراد کے نئے چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس طرح اسی ماحول سے یک گونہ
ذہنی و روحانی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے جو لڑکی کے لئے بالکل نیا اور اجنبی ہوتا ہے۔ اجنبیّت
کا یہ احساس مٹ جانے کے بعد جب لڑکی نئے ماحول میں داخل ہوتی ہے تو اسے کوئی زیادہ
وحشت نہیں ہوتی۔ ایسے ہی بیمار کو بھی اپنی علالت کے دوران عالم آخرت سے ایک مناسبت
پیدا ہو جاتی ہے۔ جو اجنبیت کے احساس کو بڑی حد تک کم کر دیتی ہے۔ خیال میں رچا لیسا ماحول
جب سامنے آتا ہے تو فکر و خیال کی دنیا کو اور بھی حسین بنا دیتا ہے آناً فاناً "لقمۂ اجل بن جانے
والا انسان ان لذتوں سے شناسا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے آخرت کے جہان کی ہر چیز نئی ہوتی ہے
جو خیالات سے ماوراً اور احساس کی دسترس سے باہر ہوتی ہے اس لئے اسے وحشت ہونے
لگتی ہے۔ اس کے علاوہ اچانک موت یوں بھی انتہائی اذّیت ناک چیز ہے حضور علیہ السلام
نے اس موت کو اس چادر سے تشبیہ دی ہے جسے خاردار جھاڑی پر ڈال کر دفعتاً" کھینچ لیا جائے
اور اس کا تار و پود بکھر جائے۔ زندگی بھی وہی بہتر ہے جو غم اور خوشی دونوں سے عبارت ہو۔
اور موت بھی وہی قابل رشک جو بیماری کے بعد آئے اس طرح انسان دھل کر اپنے رب کی بارگاہ
میں حاضر ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ جس طرح ہر موت نعمت نہیں بعض کے
لئے یہی موت مستقل عذاب کا ذریعہ بن جاتی ہے ایسے ہی ہر بیماری رحمت ہے جو صبر و شکر کی
غمازّ ہو۔ بیماری میں صبر و شکر کی نعمت میسر ہو تو وہ رحمت سے واصل کر کے رہتی ہے۔

شانِ رزّاقی

رزق، جو بندے کو اپنے رب کی طرف سے ملتا ہے۔ عارفینِ حق نے اسے چار اقسام پر منقسم کیا ہے۔

رزق کی ایک قسم تو وہ ہے جو نیک و بد، کافر و مومن بلکہ جانوروں تک کے لئے مخصوص ہے اس میں کسی کی تمیز و تخصیص نہیں اسے رزقِ مقسوم کہا جاتا ہے۔

ایک رزقِ موعود ہے ربّانی ارشاد کے مطابق یہ اپنے رب پر تکیہ کرنے والوں، اسے اپنا حاجت روا اور مشکل کشا جاننے والوں کے لئے مخصوص ہے یہ خواص کا حصّہ ہے۔ جو بندۂ اسباب نہیں ہوتے۔ ان لوگوں کے لئے غیب سے نئے نئے دروازے کھلتے ہیں۔ ان کے ساتھ جس نوعیّت کے رزق کا وعدہ ہے۔ اسی کو رزقِ موعود کہا جاتا ہے۔

ایک رزقِ معلوم ہے جو اسباب و علل کا منّت پذیر ہوتا ہے۔ یہ اسباب کے ذریعے سے ملتا ہے۔ جیسے نوکری اور جائیداد وغیرہ۔

رزقِ مبسوط ان تمام اقسام پر فوقیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس کی شان نرالی ہوتی ہے۔ وہ اپنے رب کی شانِ رزّاقی ہی کا آئینہ دار نہیں ہوتا۔ اس کے ذریعے رب تعالیٰ کی قدرت و عظمت بھی آشکار ہوتی ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے۔ اس دولت سے نوازتا ہے۔ رزقِ موعود بھی گو اسباب و علل کا محتاج نہیں ہوتا یہ متوکّلین کا حصہ ہے لیکن اس میں بھی بندے کی سعی و کوشش کا تھوڑا بہت حصہ ہے اسے توکل کرنا پڑتا ہے رزقِ مبسوط توکل کا نتیجہ بھی نہیں ہوتا یہ خالصتاً افضالِ ربّانی کہلاتا ہے اور یہ اسی ذات کی مشیّت و قدرت پر موقوف ہے جسے چاہے عطا کر دے اور جب چاہے نواز دے۔

مقرّبینِ حق کا رزق ضروری نہیں کہ اسباب سے وابستہ ہو۔ ذاتِ حق کی وابستگی انہیں بھوکا نہیں رہنے دیتی۔ لیکن ہر آدمی کو یہ مقام نہیں مل سکتا جس نوع کا بندہ ہوگا۔

رزق کی شان بھی وہی ہوگی۔

اجتہادات

حضرت عمر فاروق رضؓ نے جب ملکِ شام کا سفر اختیار کیا تو اس وقت شام وبائی مرض کی لپیٹ میں آچکا تھا۔

فاروقِ اعظم کو صورتِ حال کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے رفقا سے مشورہ طلب کیا کہ ایسے حالات میں ہمیں شہر میں داخل ہونا چاہیئے۔ یا نہیں؟ صحابہ رضؓ کا مشورہ یہ تھا کہ وبائی صورت میں شہر میں داخل ہونا درست نہیں۔ فاروقِ اعظم رضؓ کی بھی یہی رائے تھی۔ لیکن ابوعبیدہ رضؓ کا فیصلہ اس کے خلاف تھا۔ وہ فاروقِ اعظم کے سامنے اپنی دلیل پیش کرکے یہ کہہ رہے تھے۔ کہ آپ تقدیرِ الٰہی سے بھاگ رہے ہیں۔ فاروقِ اعظم کا جواب یہ تھا کہ میں تقدیر سے تقدیر ہی کی طرف جارہا ہوں۔ فاروقِ اعظم کی نظر میں ابوعبیدہ رضؓ کا استدلال درست نہ تھا جبھی تو وہ یہ کہہ کر حیرت واستعجاب کا اظہار کر رہے تھے۔ کہ آپ ایسے جلیل القدر انسان سے ایسی سطحی بات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہ تو بالکل عامیانہ بات ہے۔ غرض ابوعبیدہؓ نے جو استدلال کیا تھا وہ فاروقؓ کے نزدیک، درست نہ تھا اجتہادی مسائل میں صحابہؓ کے اختلاف کی یہ ایک مثال نہیں۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ لیکن یہ اختلاف فروعی مسائل میں تھا۔ اصول میں نہ تھا اور یہ اختلاف زمانۂ نبوی کے بعد ہی ظہور پذیر نہیں ہوا۔ عہدِ نبوی میں بھی اس کے بہت سے نظائر ملتے ہیں۔

خالد بن ولیدؓ جب ایک قبیلے کی طرف مامور کیئے گئے تو انہوں نے ان لوگوں کی زبان سے ایک مبہم سا جواب سن کر یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ مرتد ہوگئے ہیں اور انہوں نے انہیں قتل کر دیا ان کا یہ قیاس درست نہ تھا۔ لیکن با ایں ہمہ ان سے شرعی مواخذہ نہ ہوا۔ اس لئے کہ یہ اجتہادی غلطی تھی احد کی گھاٹی پہ متعین کئے جانے والے تیر اندازوں کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ ورنہ انہیں یوں نظرانداز

نہ کیا جاتا - فروعی مسائل میں مجتہدین کا اختلاف ناممکن نہیں بلکہ یہ ایک طبعی امر ہے لیکن اختلاف اور چیز ہے اور خلاف اور چیز، دونوں میں بڑا فرق ہے -

رحمت کے کارواں

جو لوگ ربانی ہدایت سے فیضیاب ہو کر دوسروں کے لئے منفعت بخش بنتے ہیں - حضور علیہ السّلام نے انہیں اس زمین کے مشابہ قرار دیا ہے - جو بارش کے اثرات سے خود بھی محروم نہیں رہتی اور دوسروں کے لئے بھی زندگی کا سامان مہیا کرتی ہے - اس میں پھل پھول اُگتے ہیں سبزہ زاروں کا سماں دیکھنے میں آتا ہے - تو زندگی ایک نئی کروٹ لیتی ہے کام و دہن کو نئی لذتیں نصیب ہوتی ہیں نئی بہاریں مسکراتی نظر آنے لگتی ہیں -

اور جو لوگ خود تو ربانی ہدایت سے مستفیض ہوتے ہیں لیکن ان کی ہدایت دوسروں کے کام نہیں آتی - انہیں اس زمین کے مماثل قرار دیا گیا ہے جو دامن میں پانی لے کر دوسروں کی پیاس تو بجھا دیتی ہے - لیکن پھل پھول اور زندگی کو تقویت دینے والے ان اثمار و نتائج سے محروم رہتی ہے - جن کا وجود حیاتِ انسانی کے لئے ضروری ہوتا ہے تیسری قسم کے لوگوں کی سنگلاخ زمین سے مثال دی گئی ہے - جس میں نہ خود بارش سے استفادے کی صلاحیت ہوتی ہے نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتی ہے -

یہ زبانِ نبوت سے دی گئی ایک تمثیل ہے جس کی اہمیت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم ان لوگوں کی زندگیوں پر نظر ڈالتے ہیں جو اپنے ریوڑ لے کر پانی اور سبزے کی تلاش میں صحراؤں میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کر رہے تھے سبزے اور پانی کی جستجو جن کی زندگی کا شعار بن چکی تھی یہ تمثیل بیان کرنے سے مقصودِ نبوت یہ ہے کہ مومن کی زندگی ایسی بہار آفریں ایسی منفعت بخش اور ایسی سیراب کر دینے والی ہونی چاہیئے جس میں نگاہ و دل کی تسکین کا سامان بھی موجود ہو اور ذوق بھی غیر آسودہ نہ رہے سبزہ زاروں اور چشمے اگلنے والی زمینوں

پر کارواں اترتے ہیں اور مومن کا وجود جب یہی حیثیت کر لیتا ہے تو وہ رحمت کے کاروانوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ بنجر اور بے آب و گیاہ زمین کو کارواں شایانِ توجہ نہیں سمجھتے اور بانجھ روحیں رحمت کی مستحق قرار نہیں پاتیں۔

جود و کرم

اللہ کریم کے اسما میں سے جوّاد بھی ایک اسم ہے لیکن اسے سخی نہیں کہہ سکتے کیوں کہ سخاوت کرتے وقت اپنے اور بیگانے میں تمیز کی جاتی ہے اور یوں بھی سخاوت اسباب وعلل کی محتاج ہوتی ہے جود میں یہ بات نہیں نہ وہ اسباب وعلل کا نتیجہ ہوتی ہے اور نہ کسی تفریق کو گوارا کرتی ہے وادِ حق میں قابلیّت شرط نہیں اس لئے کہ وہ جوّاد ہے۔

سخی کا اطلاق ذاتِ حق پر اس لئے بھی ممنوع ہے کہ اس کی کوئی شرعی دلیل نہیں ذاتِ حق پر صرف اسی لفظ کا اطلاق درست ہو سکتا ہے جس پر کتاب وسنت شاہد ہوں۔ معنوی اعتبار سے خواہ کوئی لفظ کتنا بھی پسندیدہ کیوں نہ ہو۔ اگر وہ شریعت نے حق تعالیٰ کے لئے استعمال نہیں کیا تو اس کا اطلاق صحیح نہ ہو گا۔ عاقل اور ہوشمند بھی ذاتِ واجب الوجود کو نہیں کہا جاتا۔

غرض جود کا مقام سخا سے ارفع واعلیٰ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ایک مہمان آیا تو آپ نے اس لئے اس کی تواضع سے انکار کر دیا کہ وہ مسلمان نہ تھا آتش پرست تھا اس پہ ان سے مواخذہ ہوا کہ ہم اب تک اسے کھلا رہے ہیں جب کہ اس کی عمر ستر سال سے متجاوز ہو گئی ہے اور آپ ایک وقت بھی نہ کھلا سکے؟

ہمارے حضور ﷺ مقام جود پر تھے اسی لئے آپ کا ابرِ کرم دشت وجبل میں تمیز نہ کرتا تھا۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر مساوی طور پہ برستا تھا۔ عطا وبخشش کے وقت اپنے اور بیگانے میں تمیز نہ تھی۔ اسی وجود کی حضور ﷺ نے اپنے غلاموں کو تعلیم دی ہے جس کے مظاہر حضور ﷺ

کے غلاموں کی زندگیوں میں نظر آتے ہیں۔ عطا و بخشش اور رحم و کرم کسی خاص طبقے کے ساتھ مخصوص نہیں۔ یہ جنس ہر ایک کے لئے ہے کیونکہ یہ صاحب جود کا فیضان ہے جسے محدود نہیں کیا جا سکتا۔

یہی منشا اس فرمان کا بھی ہے۔ جس میں مومن کو صفاتِ الٰہی کے جمال کا عکس اپنی سیرت میں پیش کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔

ابو یوسف رح

حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد رشید امام ابو یوسف رح ایک جگہ درس حدیث دے رہے تھے حقائق و معارف کا ایک سمندر موجزن تھا جس کی لہروں میں سامعین کے ذوق کو لذتیں نصیب ہو رہی تھیں۔ اور ان پر معرفتِ رسول ؐ کے نئے نئے دروازے کھل رہے تھے۔ اسی دوران میں ایک اجنبی آکر درسِ حدیث میں شامل ہو گیا چند ثانیے گزرنے کے بعد اس نے امام ابو یوسف رح سے سوال کیا کہ حضور علیہ السلام جو ٹوپی پہنتے تھے اس کا رنگ سیاہ تھا یا سفید؟۔

امام نے فرمایا حضور کی کلاہ کا رنگ سفید تھا۔ وہ پھر بولا، وہ اونچی تھی یا سر کے برابر؟ امام نے فرمایا وہ بلند نہ تھی۔ وہ بولا آپ نے سیاہ ٹوپی کیوں پہن رکھی ہے اور یہ سر سے اونچی کیوں ہے۔

امام ابو یوسف رحمتہ فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ تمہارے اسی اندازِ خطاب کا محرک کون سا جذبہ ہے تم مجھے حاضرین محفل کے سامنے رسوا کر کے اپنا علمی تفوق ظاہر کرنا چاہتے ہو یا تمہاری نیت بخیر ہے۔ اگر میری تذلیل مقصود ہے تو یہ جان لو کہ عزت و ذلت کا مالک پروردگار ہے کسی کے ذلیل کرنے سے کوئی ذلیل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ خدا کی مشیّت کارفرما ہو تو ذلیل کرنے والے کو ذلتیں نصیب ہوتی ہیں۔ اور اگر تمہارے پیش نظر اصلاح احوال تھی۔ تو مجھے خلوت

ہیں کہہ دیتے۔ کیونکہ جس اصلاح میں محبت کا جذبہ ہو۔ وہ زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے
امام ابو یوسف رحمہ کے نزدیک وہ ٹوپی غیر مشروع نہ تھی۔ آئمۂ اسلام ہر ایسے مسئلے
میں اباحت کے قائل ہیں۔ جس کے عدم جواز کی کوئی دلیل نہ ہو۔ سیاہ ٹوپی پہننے کے عدم
جواز کی چونکہ کوئی دلیل نہ تھی۔ اس لئے امام نے اسے جائز سمجھا۔ اور اجنبی نے جو رویہ
اختیار کیا تھا۔ اس کی اصلاح ضروری تھی۔

بیتِ قدس

حضرت عمرؓ اپنے دورِ جاہلیت میں ملکِ شام سے مالِ تجارت خرید کر مکہ کی طرف
آرہے تھے کہ راہ میں انہیں ایک ایسا کام یاد آگیا جس کی تکمیل ضروری تھی۔ چنانچہ وہ اسی
غرض کے لئے قافلے سے جدا ہو کر دوبارہ شام پہنچ گئے۔ شام کے بازار میں انہیں ایک پادری
ملا جو انہیں کلیسا میں لے گیا۔ اور انہیں مٹی کا ایک ڈھیر صاف کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ پادری
کلیسا کا دروازہ بند کر کے چلا گیا تو حضرت عمر اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے طریقوں
پر غور کرنے لگے دوپہر کو وہ آیا تو حضرت عمرؓ خاموش بیٹھے تھے۔ چنانچہ دونوں میں تکرار ہو
گئی۔ اور حضرت عمرؓ نے کدال کی ایک ہی ضرب سے اس کا کام تمام کر دیا۔ وہ جان
بچانے کے لئے بھاگے دن کے علاوہ رات بھر ان کی دوڑ دھوپ کا سلسلہ جاری رہا صبح کے
وقت وہ جہاں ستانے کے لئے ٹھہرے وہ بھی عیسائیوں کا ایک مقدس مقام تھا۔ چنانچہ کلیسا
کے راہب نے انہیں دیکھ لیا۔ اور ان کے متعلق عجیب وغریب سوال کرتے لگا۔ آخر کار
وہ حضرت عمرؓ کے لئے کھانا لایا۔ حضرت عمرؓ کھانے سے فارغ ہوئے تو اس نے ان کے
سامنے کاغذ رکھ کر کہا کہ آپ اس کاغذ پر لکھ دیں کہ جب آپ ملک شام کے بادشاہ ہوں گے
تو میرے کلیسا کی جائداد سے تعرض نہ کریں گے۔

حضرت عمرؓ اس طرزِ عمل سے بہت حیران ہوگئے لیکن وہ یہی کہہ رہا تھا کہ تورات کی اطلاع

کے مطابق ایسا ہو کر رہے گا۔ آخر حضرت عمرؓ نے چند سطور لکھ دیں۔ اپنے عہد خلافت میں جب وہ شام کی طرف گئے تو راہب وہی تحریر لے آیا اور اصرار کرنے لگا کہ بیت المقدس کی تمام جائیداد اسی کی تحویل میں رہنے دی جائے لیکن حضرت عمرؓ کا جواب یہ تھا کہ اس جائداد پر مجھے تصرّف کا حق نہیں یہ ملک و ملّت کی دولت ہے اور میں اس کا نگران ہوں۔

غفور اور رحیم

اسلام چوں کہ عفت و عصمت کا مذہب ہے۔ اس لئے وہ فکر و نظر کی تطہیر اور ظاہر و باطن کی پاکیزگی کا غایت درجہ خیال رکھتا ہے جہاں فکر و نظر کی لغزشوں کا امکان ہو اور غلط جذبات کے پھوٹ نکلنے کا احتمال پایا جائے وہ تعزیر کے پہرے کڑے کر دیتا ہے ان مفاسد کے سدِّ باب کے لئے اپنی کوششوں کو بروئے کار لانا ضروری خیال کرتا ہے جن سے عصمت و پاکیزگی کے دامن پر کوئی ہلکا سا چھینٹا بھی پڑ سکتا ہو۔ دل و نظر اور زبان کی حفاظت کا اسلام نے جو اہتمام کیا ہے اور ان کی نگہداشت کے متعلق جو احکام جاری کئے ہیں۔ وہ اسی پاکیزگی کے آئینہ دار ہیں جو اسلام اپنے پیرو کاروں کی زندگی کے ہر شعبے میں دیکھنا چاہتا ہے۔ جہاں نظر کی عصمت آلودہ ہونے کا خطرہ ہو وہاں وہ نظر جھکانے کی تعلیم دیتا ہے جہاں زبان کو خطرہ ہو وہاں زبان کی حفاظت کے آداب سکھاتا ہے اور جہاں دل کی حفاظت ضروری ہو وہاں دل کو قابو میں رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ گناہ کے ارتکاب کے ذرائع چونکہ یہی ہیں۔ نگاہ دیکھ کر دل کو اطلاع دیتی ہے دل میں تخلیقِ گناہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور زبان اس کے اظہار و بیان کا ذریعہ بنتی ہے۔ اسی لئے گناہ کے انہی سرچشموں کو مطیع و فرمانبردار بنانے پر زیادہ زور دیا گیا ہے نظر مسلمان بن جائے دل مطیع ہو جائے۔ اور زبان کی بد لگامیوں کے امکانات ختم ہو جائیں۔ تو مملکتِ وجود میں گناہوں کی فرماں روائی نہیں رہ سکتی۔ اطاعت ہو گی تو اسی ذات کی، جو وجود کی مالک ہے جو احساسات کی دنیا میں جھانک کر دیکھنے کی قدرت رکھتی ہے اور جس کی نظر سے ہمارا کوئی جذبہ پوشیدہ نہیں۔ جذبات کو تند و تیز نشہ بھی

اسی کے منے خانۂ قدس سے ملتا ہے اور احساسات کی موت بھی اس کے علم وارادہ کے باہر نہیں ہوتی - انسان غلاظتیں سمیٹ کر دامن میں بھر لیتا ہے اور اس کی وہ لطیف حس مر جاتی ہے جو گناہ و ثواب میں امتیاز کرنے کے لئے قدرت کی طرف سے اسے عطیے کے طور پر ملی ہوتی ہے تو اس موت پر قدرت کا دل خوش نہیں ہوتا جس نے انسان کو اپنی ذوقی و وجدانی لطافتوں کی نمود و نمائش کے لئے مظہرِ ذات و صفات کی حیثیت سے تخلیق کیا ہے - وہ اس آئینے کو گرد و غبار میں اٹا دیکھ کر مغموم ہو جاتی ہے - اور اگر اس کی آب و تاب نظر فروز ہو دلکش اور دیدہ زیب ہو تو دیکھنے والوں ہی کے دلوں کو جلا نہیں بخشتی قدرت بھی اس سے لطف اندوز ہوتی ہے - اور اسے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر جان کر نظر کے سامنے رکھنا قبول کر لیتی ہے - سعدی کا یہ شعر انہی حقیقتوں کی غمازی کرتا ہے -

کرم بین و لطفِ خداوندگار

گنہ بندہ کرد است و او شرمسار

رب تعالیٰ جذباتی نہیں وہ اعتدال پسندی کا خالق ہے اور اسی کی تعلیم دیتا ہے لیکن انسان جب اعتدال کی راہوں کو روندتا ہوا بے اعتدالی کی حدود کو چھونے لگتا ہے تو اس کے دل میں ترحم کے جذبات پیدا ہوتے لگتے ہیں - وہ رحم و کرم سے تربیت کرنا چاہتا ہے اور جب ترحم کا کوئی جذبہ انسان کو اصلاحِ احوال کی طرف متوجہ نہ کر سکے تو اس کا قہر و غضب بھڑک اٹھتا ہے اور اس کے غضب کی آگ انسان کو محیط ہو جاتی ہے جب بھی انسان کا احساس جاگ اٹھے وہ اپنے خالق مالک اور پروردگار کو نصرت و اعانت کے لئے پکارنے لگے اپنے رب کی نصرت کو دور نہیں پاتا - نصرت اس کی یاور و مددگار بن جاتی ہے - اور اس پہ کشادگی کی نئی نئی راہیں کھلنے لگتی ہیں - لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب احساسِ ندامت سے دل کی دنیا معمور ہو - اپنے رب سے تعلقات خراب کر لینے کے بعد وہ ان کی استواری کا آرزومند ہو تعلق کی استواری کا جذبہ ایک طرف پیدا ہوگا - تو دوسرے دل پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا - اسلئے کہ وہ ذات

جبار و قہار کی نسبت زیادہ غفور اور رحیم ہے پکڑ لینے کی نسبت اسے معاف کر دینے میں زیادہ مزا آتا ہے اور یہی اس کی شان ہے۔

کافر و مومن

کافر و مومن کے اعمال اپنی شکل و صورت میں مساوی ہونے کے باوجود نتائج کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور یہ اختلاف اُخروی زندگی ہی میں ظاہر نہ ہوگا۔ دنیوی زندگی میں بھی اسے دیکھا جا سکتا ہے۔

کافر کی نیکی میں لذت نہیں ہوتی خواہ صورتاً وہ کتنی بھی حسین و دلآویز ہو۔ دان کرتے وقت اسے جو لذت محسوس ہوتی ہے۔ اسے نفس کی لذت تو کہا جا سکتا ہے لیکن روح کی لذت سے اسے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ روح کی لذت، جب نشہ بن کر رگ و پے میں دوڑنے لگتی ہے۔ تو اس کا اثر چہرے پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ چہرے کو نور نصیب ہوتا ہے زبان کو شکر کی لذت ملتی ہے اور حیات کے تناور درخت میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان عبادت کے بعد خوئے نیاز مندی سے آشنا ہو جاتا ہے۔

کافر دان کر کے اکڑتا ہے خود کو دوسروں سے بلند سمجھنے لگتا ہے۔ عبادت کے وقت گداز کی لذت اسے نصیب نہیں ہوتی۔ نہ آنکھیں برستی ہیں نہ دل تڑپتا ہے۔ مومن کے سجدوں کا گداز دوسری چیز ہے اس کی سخا کے انداز میں بھی اپنے تفوق و برتری کا اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ادائے فرض ہی کی ایک صورت ہوتی ہے جو اسے شکر کی توفیق بخشتی ہے۔ یوں۔ بھی کافر نیکی کا اجر دنیا ہی میں چاہتا ہے۔ دان کرتا ہے تو اس لئے کہ دولت فزوں ہو، سرمایہ بڑھے عبادت و ریاضت کے ذریعے وہ مہاتما بننے کی کوشش کرتا ہے۔ بندگی کی شان کا ظہور اس کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ گویا وہ اپنے رب سے بھی ذاتی مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر تعلق استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مومن کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے وہ تاجر نہیں شیدا ہے۔

ایمان اور گناہ

مسلمان کے ساتھ محبت کرنا بھی ایمان کے لوازم میں سے ہے اسی لئے کسی مقام پر مسلم کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ مسلم وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں کسی جگہ یہ فرمایا گیا ہے کہ مومن وہ ہے جو اپنے بھائیوں کے لئے بھی وہی پسند کرے جو اسے مرغوب ہو۔

ہر راہ کا مسافر اپنے ابنائے جنس کو پسند کرتا ہے۔ ذہنی و قلبی یگانگت دو بیگانوں کو یگانہ بنا دیتی ہے دونوں میں جو نظری و فکری اتحاد ہوتا ہے وہ انہیں ایک مرکز پر لے آتا ہے۔ ایک کو دوسرے کے قریب کر دیتا ہے کسی خارجی تحریک کے بغیر بھی ایک کے دل میں دوسرے کی ہمدردی و خیر خواہی کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔

ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے ایک مومن جب کسی مسلمان کو نظرِ استحسان سے دیکھتا ہے۔ تو دراصل اس کی یہ نظر اس یقین و اعتماد کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے جو اسے خدائے واحد و قہار پر ایمان لانے۔ رسالت کو تسلیم کرنے۔ حشر و نشر کو ماننے بعثِ بعد الموت کا عقیدہ رکھنے انبیاء ملائکہ اور آسمانی کتابوں کو حق جاننے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

یہ محبت ایک فطری چیز ہے لیکن یہاں ایک مقام بڑا نازک ہے بعض نیک دل معصیت کاروں اور گناہ گاروں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ نفرت ذات سے نہیں صفات سے ہونی چاہیئے۔ ماں بچے کو غلاظتوں میں اٹا ہوا دیکھتی ہے تو بچے کو قابلِ نفرت نہیں جانتی۔ غلاظت سے نفرت کرتی ہے۔ ایسے ہی معصیت کار انسان قابلِ نفرت نہیں۔ نفرت کی چیز گناہ ہے۔ حسین کا لباس گندہ ہو تو وہ حسن کے منافی ضرور ہے حسن کی لطافت کو مجروح کر سکتا ہے اسے چھپا سکتا ہے لیکن حسن کی ذات کو نہیں مٹا سکتا۔

ذکرِ الٰہی

قرآن حکیم میں ذکرِ الٰہی کو مختلف عنوانوں اور پیرایوں سے بیان کیا گیا ہے رزم ہو یا بزم، خلوت ہو یا جلوت، غم کی ساعتیں ہوں یا مسرت و شادمانی کے لمحات، ان میں مومن کو ذکرِ الٰہی کی تعلیم دی گئی ہے ابدی خوشی اور ابدی شادمانی کو ذکرِ الٰہی سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ دینوی اور اخروی فوز و فلاح کو اسی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے کسی ابہام اور اغلاق کے بغیر واضح ترین الفاظ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو لوگ ہمارے ذکر سے اعراض برتیں گے ان پر زندگی کی راہیں مسدود کر دی جائیں گی۔ اسبابِ مسرت ہونے کے باوجود وہ حقیقی مسرت سے محروم رہیں گے۔ اور انہیں وہ روحانی امن و سکون حاصل نہ ہو سکے گی جو ذاکرین کے لئے مخصوص ہے

یہ بھی ارشاد ہے کہ ایسے لوگوں کو قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا۔ غرض ربانی فیصلے کے مطابق کامرانیاں ذکر سے ملتی ہیں۔ اسی سے انجمن آراستہ کی جاتی ہے۔ اور جلوت کو وہی فروغ بخشتا ہے ذکر کی لذت مذکور کا فیضانِ جمال ہوتی ہے۔ مذکور جس نوعیت کا ہو گا ذکر میں بھی اسی نوعیت کی لذت ہو گی۔ ذکر کا رشتہ بڑا قوی اور توانا رشتہ ہے جو دوری کو قرب میں بدل دیتا ہے۔ احساسات کو اسی سے زندگی نصیب ہوتی ہے اور جذبات اسی سے فروغ پاتے ہیں۔ ذکر نامہ بر بھی ہے۔ اور نامہ بر بھی، راہ بھی اور راہ نما بھی، یہ جادہ، منزل سے دور نہیں۔ منزل اسی کی آغوش میں ہے۔

اسی لئے قرآن حکیم میں کہا گیا ہے کہ تم مجھے یاد کرو۔ میں تمہیں یاد کروں گا۔ ذکر کا کمال یہ ہے کہ وہ مذکور تک پہنچا دے۔ مذکور کے لبوں پر ذاکر کا نام آنے لگے۔ اور اس سے بڑھ کر کوئی اور کامیابی نہیں۔

اصحابِ صُفّہ رضی اللہ

اصحابِ صفہ کی زندگی کا دارو مدار بغیر کسی وسیلے کے خدا کی رحمت پر تھا. وہ رحمت کے جویا بن کر رحمت کے آستانے کو اپنا مقصود بنا چکے تھے ۔ اسی لئے رحمت انہیں نوازنے کے لئے بے قرار رہتی تھی ۔

ایک دن بارگاہِ قدس میں خورد نوش کا کچھ سامان آیا اور حضور علیہ السلام نے ایک صحابی رضی کو یہ سامان دے کر فرمایا کہ اسے اصحابِ صفہ کے پاس لے جاؤ ۔ اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرما دی کہ سامان دیتے وقت ان کے احوال و کیفیات پر بھی نظر رکھنا ان میں سے جو شخص کوئی بات کہے وہ مجھے آکر بتانا ۔

چنانچہ قاصدِ رسول جب یہ سامان لے کر گیا تو حضرت ابوہریرہ رضی نے اسے دیکھ کر خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنا شروع کر دی اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میرے خدا کی یہ شان ہے کہ جو اسے نہ بھولے وہ اسے نہیں بھولتا ۔ مقصود یہ تھا کہ ذاکر رب تعالیٰ کی نظر میں ہوتا ہے یہ الفاظ ابوہریرہ رضی کے تھے ۔ جو قاصدِ رسول نے بارگاہ جمال میں لوٹ کر دہرا دیئے قاصدِ رسول نے ابوہریرہ رضی کا نام لئے بغیر یہ الفاظ دہرائے تھے جنہیں سن کر حضور کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمکنے لگا اور حضور نے صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا تمہارا کیا خیال ہے یہ الفاظ کس کے ہو سکتے ہیں ؟ ۔

صحابہ نے یک زبان ہو کر جواب دیا " یا رسول اللہ ! یہ الفاظ تو ابوہریرہ رضی کی زبان سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔

الفاظ واقعی ابوہریرہ رضی کے تھے جو توکل کے اعلےٰ ترین مقام پر فائز تھے ۔ جن کی محبت کا یہ عالم تھا ۔ کہ انہیں بارگاہِ رسالت سے جو کی روٹی کا ایک ٹکڑا بھی مل جاتا تو انہیں مست و سرشار بنا دیتا ۔ اس لئے کہ ان کی زبان شاکر تھی ۔ ان کے دامن میں صبر و شکر کے سوا کچھ نہ تھا

انسان کی نظر منعم پر رہے تو اسے شکر نصیب ہوتا ہے منعم کی بجائے نعمت کو دیکھتا رہے تو منعم کی عطا کے مزے نہیں لوٹ سکتا۔ عطا کبھی سوکھے ٹکڑوں کی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے اور رگ و ریشے کو ملذّذ کر دیتی ہے۔

اجماعِ امّت

ان امور کی تصدیق کے بغیر انسان مومن نہیں ہو سکتا۔ جو حضور علیہ السلام لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ انسان ان کی تفصیلات سے آگاہ ہو یا نہ ہو۔ بس یہ جان لینے کے بعد کہ حضورؐ سے یہ ثابت ہے اس پر ایمان لانا ضروری ہو جاتا ہے فقہاؒ کی اصطلاح میں ایسے ایمان کو ایمانِ مجمل کا نام دیا جاتا ہے اور ایسے احکام و مسائل جو ہر دور میں مسلّمات کا درجہ رکھتے ہوں اور ان پر ہر دور میں مسلمانوں کا متفق ہو جانا عقلاً محال ہو ضروریاتِ دین کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ نماز کی رکعتیں زکواۃ کی تفصیل، حج کے مناسک اور اسی نوع کے دوسرے مسائل اسی حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن پر کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ ہر دور کے مسلمانوں کا ان پر اتفاق رہا ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ یہ ثابت شدہ حقائق ہیں۔ جن پر رائے زنی کرنا اور انہیں بحث و تکرار کا موضوع بنانا ممکن نہیں۔ کفر کے لئے یہی ضروری نہیں کہ انسان پورے دین کا انکار کر دے ثابت شدہ حقائق کو نظر انداز کر دینا یا ان کی ایسی تعبیر و تفسیر شروع کر دینا جو اس تعبیر سے یکسر مختلف ہو جو ہر دور کے مسلمانوں میں متفق علیہ رہی ہے۔ یہ بھی کفر ہی کی علامت ہے آئین کی تعبیر و تفسیر جو کسی ملک اور قوم کے دانشوروں میں مسلّمات کا درجہ رکھتی ہو اور جس پر ہمیشہ عمل کیا جاتا رہا ہو کسی فاترالعقل کے کہنے سے غلط نہیں ہو سکتی۔ اسلام میں بھی یہی قانون نافذ ہے یہاں بھی وہ امور ضروریاتِ دین کا درجہ رکھتے ہیں۔ جو ہر عہد میں شک و شبہ سے بالا سمجھے گئے ہیں۔ ائمۂ اسلام نے ان پر اتفاق کیا ہے۔ فقہائے نے ان کی تصدیق کی ہے اور جمہور نے کبھی ان سے روگردانی کی جسارت نہیں کی۔ اجماعِ امّتِ دین میں حجت ہے اور اس لیے

انحراف، ضلالت و گمراہی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

ذاتی اور صفاتی

انسانی تخلیق کا مقصود اپنے رب کی معرفت اور محبت ہے۔ انسان ان وسائل سے جتنا قریب ہو گا۔ اسی نسبت سے اسے خدا کا قرب نصیب ہو گا۔ اسی ضمن میں بعض عارفین ؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت دو اقسام پر مشتمل ہے ایک ذاتی اور ایک صفاتی، ذاتی کو وہ خالصتاً عطیۂ ربانی قرار دیتے ہیں۔ جس کا انسانی سعی و کوشش سے کوئی تعلق نہیں خدائے قادر وقیوم جسے چاہے اس دولت سے نواز دے۔ البتہ صفاتی محبت کو سعی و کوشش سے متعلق قرار دیتے ہیں اور یادِ الٰہی کو اس کے حصول کا ذریعہ گردانتے ہیں یاد جتنی پائیدار ہو گی۔ اسی نسبت سے اپنے فیوض سے نوازے گی۔ وہی رنگ دکھائے گی۔ جو یاد کا رنگ ہو گا۔ وہی اثر مرتب کرے گی جو یاد میں رچا بسا ہو گا۔ بے روح یاد اور بے اثر ذکر، مذکور کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا۔ التفات، توجہ کا خاصا ہوتا ہے اسی لئے یادِ الٰہی کے وقت توجہ کو اسی کی طرف مبذول رکھنا ضروری سمجھا گیا ہے حضورِ قلب کے بغیر نماز نہیں ہوتی قلب جتنا غافل ہو گا۔ اسی نسبت سے دوری کا باعث بنے گا۔ غفلت تو حضوری کی قاطع ہے۔ حضوری تو نام ہی سراسر احساسِ جمال کا ہے۔ سرے سے احساس ہی مفقود ہو تو حضوری کیسی؟ ایسی حضوری تو لعنتوں اور پھٹکار کا ذریعہ بن جاتی ہے بعض نمازیوں کی حالت پر قرآن میں اظہارِ تاسف کیا گیا ہے یہ ایسی ہی نماز ہے جو حضورِ قلب کے بغیر ہو خیال ذاکر بن جائے دل اپنے پروردگار کی محبت سے سرشار ہو تو ایسے عالم کی خاموشی بھی عبادت بن جاتی ہے۔ خاموشی کو بھی وہ لذتیں نصیب ہوتی ہیں جن کے مفہوم کو الفاظ کے ذریعے بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ رب تعالیٰ اپنے ذاکرین سے صرف زبان کا ذکر نہیں چاہتا وہ تو دل کی عبادت چاہتا ہے لسانی ذکر میں اگر دل شامل نہ ہو تو وہ بے کار ہے دل کی یاد زبان کے ذکر کے بغیر بھی مقبول ہے۔ اور اسی سے عبودیت کا اظہار ممکن ہو سکتا ہے۔

عطّارؒ اور رومیؒ

مولانا جلال الدین رومؒ کا مشہور شعر ہے

عطّار روح بود و سنائی دو چشم ما

ما در پسِ سنائی و عطّار آمدیم

یعنی عطّار میری روح اور سنائی میری دونوں آنکھیں ہیں۔ ہم ان دونوں کے بعد آئے ہیں۔ بظاہر شعر کے دونوں مصرعوں میں کوئی تعلق اور ربط معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن مولاناؒ بڑی بلیغ بات فرما رہے ہیں۔ حیاتِ انسانی کا دارومدار روح پر ہوتا ہے اور آنکھیں دیکھنے اور چلنے کے لئے ہوتی ہیں۔ عطّار کو روح کہہ کر مولانا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ میری زندگی عطار ہیں اور بینائی مجھے حکیم سنائی سے ملی ہے زندگی کا سفر انہی کی عطا کردہ روشنی میں طے کر رہا ہوں۔ اور قطعِ مسافت کے لئے جس تاب و توان کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مجھے عطّار سے ملی ہے یہاں ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا بھی شاید نامناسب نہ ہو۔ مولانا رومؒ کی عمر کوئی چھ سات سال کی تھی کہ ان کے والد انہیں ساتھ لے کر حج کے لئے روانہ ہوئے۔ جب وہ نیشاپور پہنچے تو ان کی شیخ عطّار سے ملاقات ہوئی شیخ عطار نے مولانا روم کو دیکھ کر ان کے والد سے کہا کہ آپ کو معلوم ہے آپ کے پاس کیا دولت ہے؟ یہ بچہ بڑا ہو کر پوری امت کی رہنمائی کرے گا۔ چنانچہ مولانا کے والد شیخ عطار کی زبان سے یہ مژدہ سن کر واپس لوٹ آئے۔ اور انہوں نے راستے ہی میں قونیہ میں قیام کر لیا۔ جہاں مولانا کا مرقد ہے۔

مولانا کی ساخت پرداخت میں ان کے نیک دل والد کی سعی و کوشش ہی کا عمل دخل نہیں عطّار کے مشورے بھی اس سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور حکیم سنائی کے افکار نے بھی مولانا کی زندگی پر بڑا خوش گوار اثر ڈالا ہے۔ اب شاید عطار کو روح اور سنائی کو آنکھیں کہنے کا مطلب اور بھی واضح ہو گیا ہو۔ استعارے کی زبان میں بات کرنا مولانا کی عادت ہے اسی لئے

انہیں تمثیلات کا بادشاہ کہا جاتا ہے ۔ عظیم تر حقائق کو وہ عام فہم حکایات کے ذریعہ اس طرح واضح کر دیتے ہیں ۔ کہ سننے والے کو کوئی اشکال باقی نہیں رہتا ۔ مولانا کی عظمت ان کے شاعرانہ کمالات کے باعث ہی نہیں اصل چیز ان کا جذب و شوق ہے اسلام کی صہبا جب وہ اشعار کے پیمانوں میں بھر دیتے ہیں تو اس کی تندی و تیزی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں ان کا جذب و شوق بھی شامل ہوتا ہے زبان و بیان کے بدل جانے سے اگر الفاظ کی تاثیر بدل جاتی ہے مفاہیم کو نیا حسن عطا ہوتا ہے ۔ تو ماننا پڑے گا کہ مولانا کے سینے کا سوز ان کا حسنِ ذاتی ہے جو کلام کو آتشیں بنا دیتا ہے ۔

اسلام کو مولانا نے شفیق ماں سے تشبیہ دی ہے جو بچے کے آرام و آسائش کے لئے اپنی آسائشیں قربان کر دیتی ہے اور اس کا محبت بھرا ہاتھ تسکین و راحت کا موجب بن جاتا ہے زخم پر مرہم رکھنے کی قدرت نہ بھی رکھتی ہو ۔ درد دل اور دکھوں کا مداوا کرنے کے قابل نہ بھی ہو تو اس کی خالی خولی محبت ہی مسیحا بن کر شفا بخشی دیتی ہے قدرت نے اس کے دستِ شفقت ہی میں وہ شفا رکھی ہے جو کسی مسیحائے دوراں کے پاس موجود نہیں ۔

مولانا کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح شفا ماں کے ہاتھ میں ہوتی ہے ۔ ایسی ہی جملہ بیماریوں کا حل اسلام کے سایۂ عاطفت میں ہے ۔ ناجنسوں کی طرف رجوع کرنے سے تو بیماریوں میں اضافہ ہوگا ۔ درد اور بڑھے گا تسکین میسر نہ ہو گی ۔ کیوں کہ ناجنس کی تیمار داری کی نسبت ماں کی آغوش میں آ جانا ہی کافی ہوتا ہے ۔ ماں کو یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کہ تیمار داری کرو زخموں کو دھو کر مرہم رکھو یہ فریضہ وہ خود ادا کرتی ہے ۔ کیوں کہ یہ اس کی محبت کا تقاضا ہوتا ہے ۔ ناجنس کی تیمارداری میں وہ لذت نہیں ہوتی جو ماں کے آغوش میں ہوتی ہے ۔

مولانا انسانی دکھوں ، درد دل کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کا اصل سبب یہ ہے ۔ کہ تم نے رحمت کی آغوش کے مزے نہیں لوٹے ۔ ناجنسوں کو مسیحا سمجھ لیا ہے اور جو حقیقی مسیحا ہے ۔ اسے نظر انداز کر دیا ہے مولانا حیاتِ انسانی کے اسی نازک موڑ پر کھڑے پکار رہے ہیں کہ

سوئے مادر آ

گھر سے بھاگ کر زندگی کی شاہراہوں پر آوارہ پھرنے والے بچے کو گرد وغبار میں اٹا ہوا اور زخموں سے چور دیکھ کر جب خدا کا کوئی نیک بندہ گھر کی طرف لوٹنے کی دعوت دیتا ہے۔ تو اس کی آواز میں لطف وکرم کے ساتھ ایک تحدید آمیز کڑک بھی ہوتی ہے یہی متنوع کیفیات مولانا کا پیغام ہیں اور "سوئے مادر آ" انہی کیفیات کی صدائے بازگشت۔

تائیدِ ربّانی

ماء الفرس اس چشمے کا نام ہے جو افریقہ کے صحرا میں اس وقت دریافت ہوا جب غازیانِ اسلام حضرت عقبہؓ کی قیادت میں افریقی ممالک میں پیش قدمی کر رہے تھے۔ اور ان کی منزل ایک ایسا صحرا تھی جہاں پانی کا ملنا ناممکن تھا۔ لشکر کو پیش آنے والی مشکلات کے تصور سے سالارِ لشکر کا پریشان ہو جانا۔ قدرتی امر تھا۔ عقبہؓ کو جب معلوم ہوا کہ پانی ملنے کی تمام کوششیں بے کار ہو گئی ہیں۔ تو انہوں نے خدا کی ذات کی طرف رجوع کیا۔

عقبہؓ کی دعا کا خشوع وخضوع اپنی ذات کے لئے نہ تھا۔ دعا میں خشوع خضوع آتا ہی اس وقت ہے جب بندگی کا جوہر آشکار ہو۔ نفس کی آلودگیوں سے پاک اور منزہ دعا جب حسن بن کر نمودار ہوتی ہے تو اجابت کا حسن اس سے ہم آغوش ہونے کے لئے لپکتا ہے۔ لطافت کھینچتی ہے جلوہ آئینے میں سمٹ آتا ہے۔

عقبہؓ خود پاک تھے۔ ان کی دعا پاک تھی۔ اجابت نے دوڑ کر اسے گلے لگا لیا۔ ان آنسوؤں کو پذیرائی ہوئی، عقبہ کی آنکھوں سے غازیوں کی تشنہ لبی کے لئے بہہ رہے تھے۔ سیراب ہمیشہ محبت ہوتی ہے۔ ہوس نے کبھی سیرابی کے مزے نہیں چکھے قدرت کے کرشموں کا ظہور کبھی ہوس کے لئے نہیں ہوتا۔ یہ نعمت بھی ازل سے محبت کے حصے میں آئی ہے۔

سیرابی غازیانِ اسلام کا حصہ تھی۔ چنانچہ ابھی عقبہؓ کی دعا کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک

نوجوان نے اطلاع دی کہ ایک گھوڑے کے پاؤں کی ٹھوکر سے چشمہ نکل آیا ہے۔

اسمٰعیل علیہ السلام کے پاؤں کی ٹھوکر نے آبِ زمزم کو روانی بخشی تھی اور غلامانِ محمدؐ کے گھوڑے کی ٹھوکر سے چشمہ نکل آیا تھا۔ وہاں ہاجرہؓ کی طلب تھی۔ ہاجرہؓ کے دل کا اضطراب چشمہ بن کر پھوٹا تھا۔ اور یہاں عقبہؓ کی بے قراریوں کو شرفِ قبول ملا قبولیت ہر جگہ صداقت محبت کی ہوئی۔ وہاں بھی جیت اسی کی تھی۔ اور یہاں بھی اسی نے رحمت کا دل لوٹا خود کو لٹانے والا ہی رحمت کا دل لوٹ سکتا ہے۔ اپنی ہی ذات پیشِ نظر ہو تو رحمت کو بیقرار ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

جنتی اور دوزخی

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خدا کے مقبولوں نے ہمیشہ امراء و سلاطین کی رہنمائی کی ہے جب بھی ان سے ملے ہیں۔ انہیں حق کی طرف بلایا ہے۔ حق کو حق اور باطل کو باطل کہا ہے۔ مردود انسانوں کا شیوہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے قصیدہ خوانی تو کی ہے لیکن ان کی زبان پر کلمۂ خیر نہیں آیا۔ باطل کو جب بھی انہوں نے فروغ پذیر صورت میں دیکھا ہے۔ اسی کو حق قرار دیا ہے۔

دراصل یہی وہ نازک مرحلہ ہے جہاں حق کے داعیوں اور باطل کے پرستاروں کی پہچان ہوتی ہے رسمِ شبیریؓ چونکہ ایک نایاب دولت ہے۔ یہ ہر ایک کے دامن میں نہیں آتی۔ صرف انہی کو ملتی ہے جو بلالؓ حبشی کے ہم مذاق ہوں صہیبؓ رومی اور عمارؓ ابن یاسر کے ذوق سے حصہ گیر ہوں۔ اسی لئے یہ راہ صدّیقوں اور زندیقوں کو جدا کر دیتی ہے۔

مکہ مکرمہ میں سلیمان ابن عبدالملک اور حازمؒ کی ملاقات ہوئی تو حق کے داعی کا جذبہ صدق ابھر کو سامنے آ گیا۔ ایک طرف خلیفۂ وقت تھا۔ اور دوسری طرف ایک فقیر بے نوا۔ لیکن ابو حازم اس سے مرعوب نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنا فرض ادا کیا۔ سلیمان نے پوچھا کہ قیامت کے دن بندے کی اپنے مولا سے کیسے ملاقات ہوگی؟ ابو حازم نے کہا کہ اس کی مثال یوں سمجھئے۔ کہ ایک شخص اپنے خاندان سے جدا ہو کر محنت مزدوری کرے۔ اور خوب سرمایہ سمیٹ کر گھر پہنچے

اس کی خوب تعظیم و تکریم ہو گی۔ بھاگا ہوا غلام خواہ کیسی بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہو۔ وہ جب بھی پکڑا جائیگا سزا پائے گا۔

سلیمان نے کہا کاش! مجھے اپنی حیثیت معلوم ہو سکتی۔ ابو حازم بولے کہ قرآن نے دو گروہ بیان کئے ہیں۔ ایک جنتیوں کا اور ایک دوزخیوں کا۔ آپ اپنے اعمال سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ آپ کا تعلق کن لوگوں سے ہے۔ سلیمان بولا کہ اگر نجات کا دارو مدار اعمال پر ہے تو رحمت کہاں گئی۔

ابو حازم نے جواب دیا۔ کہ رحمت کی آڑ میں طغیان و سرکشی کی اجازت نہیں دی جا سکتی بہت جلد اس فریب کا پردہ چاک ہو جائے گا۔

خدا کے فقیر

قرآن ان لوگوں کو بڑی اہمیت دیتا ہے جو خدا کی راہ میں روک دیئے گئے ہیں۔ انہیں فقیر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور اغنیاء کو ان کی خبر گیری کی ہدایت کی گئی ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض جاہل ان کے سوال نہ کرنے کے باعث ان کو غنی سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا فقرِ غنا آمیز ان کی پیشانیوں سے ظاہر ہے۔ خدا کی راہ میں رک جانے کا باعث ایک تو علمی انہماک ہے۔ تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کی مشغولیت انسان کو کاروبارِ حیات کی فرصت نہیں دیتی۔ ایسے انسان بھی مالی اعانت کے مستحق ہیں اور فقراء کا ایک گروہ وہ ہے جسے مشغولیتِ حق نے پا بزنجیر بنا رکھا ہے۔ التفاتِ دوست اور کرمِ دوست انہیں اٹھنے نہیں دیتا۔ وہ حریمِ جمال کے آستانے پر ایستادہ ہیں وہ عابد ہیں۔ زاہد ہیں صابر ہیں۔ شاکر ہیں ان کی ہر سانس عبادت ہے ان کی زندگی کا گذرنے والا لمحہ ذکرِ حق کی عملی تفسیر ہے اور ربانی ارشاد کے مطابق اس تفسیر کو ان کا لوحِ جبیں پر لکھی ہوئی تحریر کے ذریعے پڑھا۔ اور دیکھا جا سکتا ہے۔ اصحابِ صفہ کا شمار اسی قبیل میں ہوتا ہے۔ وہ رب تعالیٰ کی راہ کے فقیر تھے۔ جمالِ محبوب نے انہیں روک لیا تھا وہ کاروبارِ

نیازمندِ کشش کو آستانۂ رسول ﷺ پر جاگزیں تھے - یہ جگہ ان کے لئے طور بن چکی تھی - تجلّی محبوب ﷺ کی تھی - اور نظر اصحاب صفہؓ کی نہ تجلّی میں کمی ہوتی تھی نہ ان کا ذوق سیراب ہوتا تھا -

اصحاب صفہؓ کو دنیوی فرائض سرانجام نہ دینے کے باوجود بیکار نہیں کہا جا سکتا - جمال کا تماشا گر بیکار نہیں ہوتا - وہ دید کے مزے لوٹتا ہے اور جمال کے جلووں کو نظروں میں سمیٹ کر دوسروں کو سرشار بنا دیتا ہے آئینے کا کام جلوہ نمائی اور جلوہ پذیری ہے اسی لئے وہ حسن کے پیشِ نظر رہتا ہے - حضور ﷺ اصحاب صفہؓ کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے - جمال نے انہیں روک لیا تھا - اور جمال ہی ان کا محافظ و نگران تھا -

ایمان کے انوار

نعمت کو بعض عارفین نے دو اقسام پر منقسم کیا ہے - ایک کا تعلق انسانی سعی و کوشش سے ہے اور ایک خالصتاً افضالِ ربانی کہلاتی ہے یہ سعی و کوشش کے بغیر حاصل ہو جاتی ہے - انسانی زندگی خود انعام ہے یہ کسی جدوجہد کا نتیجہ نہیں - مشیئت نے چاہا اور انسان معرضِ وجود میں آ گیا انسان کی چاہت کبھی مقبول ہوتی ہے - جدوجہد کے لئے جو توفیق نصیب ہو - وہ بھی خدا کے لطف و کرم پر موقوف ہوتی ہے - اور جدوجہد کو ثمرات عطا کرنا بھی رب تعالیٰ کی شان ہے - کرم یاور نہ ہو تو جدوجہد بے مراد رہتا ہے - غرض ایک نعمت کوشش سے ملتی ہے - اور ایک سعی و کوشش کے بغیر جھولی میں آ جاتی ہے -

پھر اس نعمت کی دو قسمیں ہیں - ایک کا تعلق دنیوی انعامات سے ہوتا ہے اور ایک دینی چیز ہے - یا یوں کہیے کہ ایک جسم سے تعلق رکھتی ہے - اور ایک روح سے - دنیوی انعامات اور دینی انعامات میں یہ بنیادی فرق ہے کہ دنیوی انعامات صرف دنیوی زندگی تک ساتھ دے سکتے ہیں - اور دینی انعامات کا سلسلہ ابدی زندگی تک پھیلا ہوتا ہے - جسم سے روح کی مفارقت کے بعد جسم سے تعلق رکھنے والے انعامات ختم ہو جاتے ہیں - اور روحانی انعامات کو فنا نہیں ہوتی -

مال و زر حسن و جمال دنیوی چیزیں ہیں جو باقی رہنے والی نہیں لیکن روح کا جمال ابدی چیز ہے یہ روح سے جدا نہ ہوگا۔ صبحِ محشر اور شامِ ابد اس کی تجلیوں سے منور ہوگی۔ جلوے اس سے فروغ پائیں گے۔ دنیوی اور اخروی انعامات میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ دنیوی انعامات حد سے فزوں ہو جانے کے بعد عذاب بن جاتے ہیں اور اخروی انعامات کی فزونی گراں نہیں گزرتی وہ سراسر رحمت کہلاتی ہے اور رحمت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ روح کے انعامات، ایمان کے وہ انوار ہیں جو روح کو زندگی اور تابندگی بخشتے ہیں اور روح ان سے اپنی منزل کا سراغ پاتی ہے۔

عبودیّت کے انعامات

تخلیق کا کمال یہ ہے کہ وہ خالق کو پسند آجائے خالق کے دل میں اُتر جائے، اور وہ اسے اپنے لئے سرمایۂ نازش و افتخار سمجھنے لگے۔ اور بندہ وُہ ہے جسے رب پسند کرے۔ اُس کی عبودیت پر اُسے خوشی محسوس ہونے لگے۔ جو تخلیق خالق کو پسند نہ آئے، وُہ اُسے شوکیس میں نہیں سجاتا اُسے اپنے لئے باعثِ افتخار نہیں جانتا، بلکہ اُسے خالق کی طرف منسوب کر دیا جائے تو وُہ خفت محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ میرے فن کی آئینہ دار نہیں، اس میں میرا فن ظہور پذیر نہیں ہو سکا۔ تخلیق وہی خالق کا دِل لبھاتی ہے جس میں خالق کا فن ظہور پذیر ہو کر دیکھنے والوں کو حیران و ششدر کر دے اور انھیں تخلیق کے ذریعے خالق کی عظمتِ فن کی معرفت حاصل ہونے لگے۔ ایسی ہی تخلیق خالق کی نظروں میں محبوب ہوتی ہے اور وہی دیکھنے والوں کو اپنے خالق کی معرفت عطا کر سکتی ہے، ناکارہ، بھدّی، بھونڈی اور نامکمل تخلیق تو خالق کے لئے باعثِ ننگ و عار ہوتی ہے اور وہ اُسے دوسروں کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

بندگی بھی جب اوجِ کمال حاصل کر لیتی ہے تو اپنے خالق و مالک اور پروردگار کا دل لبھانے لگتی ہے۔ وہ دوسروں کے لئے ہی باعثِ افتخار نہیں ہوتی، خود خالق کو بھی اس پر ناز ہوتا ہے اور وُہ اُسے

اپنی عظمتوں کی آئینہ دار سمجھ کر مثال کے طور پر دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اپنی راہ میں کڑی آزمائشوں سے گذرنے والوں اور جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ خود قرآن میں کہتا ہے کہ یہ لوگ فائز ہیں، یہ مجھ سے راضی ہیں اور میں ان سے راضی ہوں میرے اُخروی انعامات اُنہی کے لئے ہیں، انہی کے لئے میں نے جنت کے باغ و بستان سجائے ہیں انہی کے لئے کوثر و سلسبیل کی نہریں جاری ہیں انہی کے اعمال کے حُسن سے میں نے حورانِ بہشتی کے چہرے کو فروغ بخشا ہے انہی کی لذتِ کردار سے میں نے عقبےٰ کے باغ و بستان کی ہواؤں کی مستیاں عطا کی ہیں، انہی کے جمال کی دلفریبیوں سے میں نے غلمانوں کے حسن و جمال کو رنگینیاں عطا کی ہیں، یہ عبودیت کی تکمیل کرنے والوں کے حُسنِ کردار پر ناز نہیں تو اور کیا ہے؟ بندگی کا حُسن تو نکھرتا ہی اس وقت ہے، اُس کے چہرے کو نئی طلعتیں ملتی ہی اُس وقت ہیں جب خالق کو پیار آنے لگے، خالق کا دل اس کی رعنائی و زیبائی کی جاذبیت و کشش کی طرف کھنچنے لگے۔

تصویر کو مصوّر کا موئے قلم ہی آب و رنگ نہیں بخشتا، اس کی پیار کی نظریں بھی تصویر میں رنگ بھر دیتی ہیں، اُسے رعنائیاں عطا کرتی ہیں۔ اُسے زیبائیوں سے روشناس کرا دیتی ہیں۔ پیار کی اُٹھی ہوئی ایک نظر تصویر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔ مصوّر کے دل سے موجِ نشاط اُبھر کر جب آنکھوں میں آ جاتی ہے تو وہی پیار بھری نظر تصویر کا رنگ و روغن بن جاتی ہے۔ بندے کو بھی جب اُس کا خالق و مالک اور آفرینندۂ جمال پیار کی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے تو اُس کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ وہ کُندن بن جاتا ہے۔ ہر چیز کا حسن و جمال اُس کے جمال کے سامنے ہیچ نظر آنے لگتا ہے۔

بلالِ حبشیؓ کی سیاہی کے آئینے میں جو حُسن جھلکتا تھا اُسے مبداءِ فیاض سے رعنائیاں ملی تھیں، اُن رعنائیوں کو اُمیّہ بن خلف کی بھڑکائی ہوئی آگ جھلا نہ سکی، بلکہ وہ اُس آگ میں پڑنے کے بعد اور نکھریں اور اُبھریں، اور انہوں نے کئی دلوں کو نئی زندگی عطا کی، نگاہِ نبوت نے انہیں جلا بخشی اور وہ زندۂ جاوید بن گئیں۔ آستانۂ نبوی کی حاضری پر بلالؓ ہی کو فخر نہ تھا۔ آستانۂ رسولؐ بھی بلالؓ کی وابستگی پر نازاں تھا۔ کسی آستانے سے وابستگی کے بعد انسان کو جب تخصیص حاصل ہو جاتی ہے تو اُسے اُسی

آستانے سے کچھ خصوصیات عطا ہوتی ہیں، جو اُسے اپنے ابنائے جنس سے ممیز و ممتاز کرتی ہیں، بلالؓ کو بھی یہ خصوصیات مل چکی تھیں۔

بلالؓ اذان کہتے وقت جب "ش" کو اپنے مخرج کے ساتھ ادا نہ کر سکتے تو اُن پر اعتراض ہونے لگا کہ یہ "ش" درست ادا نہیں کر سکتے، لیکن اُن کی یہی ادا حضورؐ کو پسند آ گئی تھی۔ ارشاد ہوا کہ بلالؓ کا "س" بھی "ش" ہے۔ خدا نے بھی اُن کی اسی ادا کو پسند کر لیا۔ اُمیّہ کی غلامی میں ابتلا و امتحان کی کڑی آزمائشوں میں ثابت قدمی دکھانا کمالِ عبودیت تھا اور یہ اُسی عبودیت کا انعام تھا۔

ربّانی نشان

ہجرت کے بعد جب حضورؐ کا قیام قبا میں تھا تو یہاں مسجد تعمیر کی گئی۔ یہ پہلی مسجد تھی جو خدا کے رسولؐ نے انصارؓ و مہاجرینؓ کے تعاون سے تعمیر کی لیکن تین دن کے بعد جب حضورؐ مدینہ کی طرف تشریف لے گئے تو بعض لوگوں نے مسجدِ ضرار کا فتنہ کھڑا کر دیا۔ انہیں خدا کے رسولؐ کی بنائی ہوئی مسجد پسند نہ تھی حالانکہ اُسے حضورؐ نے تعمیر کیا تھا اور جگہ کا انتخاب خدا کی مشیت کے مطابق ہوا تھا۔ تعمیرِ مسجد سے پہلے حضورؐ نے صحابہؓ کو اُونٹنی پر سوار ہو کر گھومنے کے لئے کہا تھا۔ صدیقؓ و فاروقؓ نے اُونٹنی پر سوار ہونے کی کوشش کی تو وہ نہ اُٹھی علیؓ سوار ہوئے تو وہ کھڑی ہو گئی اور اسی جگہ آ کر رک گئی جو علم الٰہی میں مسجد کے لئے موزوں تھی۔ زبانِ نبوت نے بھی یہ کہہ کر اُونٹنی کی حیثیت واضح کر دی کہ یہ مامور ہے۔

اب یہ ثابت ہو چکا تھا کہ اونٹنی امرِ الٰہی کا نشان ہے اور نشان پر علیؓ ہیں جن کی تغلیط ممکن نہیں لیکن جن لوگوں کے دل میں نفاق تھا اُن کے لئے ربّانی نشان کی کوئی حیثیت نہ تھی وہ مسجدِ ضرار کی ظاہری آرائش و زیبائش کو خلوص کا معیار قرار دے رہے تھے اور مدینہ آ کر حضورؐ سے تقاضا کر رہے تھے کہ ان کی بنائی ہوئی مسجد میں نماز ادا کی جائے خدا تعالیٰ کی طرف سے حضورؐ کو مسجدِ ضرار میں نماز پڑھنے سے روک دیا گیا۔ تعریف اسی مسجد کی ہوئی جو اگرچہ ظاہری شان و شوکت سے محروم تھی لیکن اس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی۔ خلوص کی تعمیر نے ان لوگوں کی نیّت کا حسن بھی واضح کر دیا جن

کے دلوں میں ایمان کا نور فروزاں تھا اور جو منافق تھے مسجد ہی اُن کے نفاق کی علامت بن گئی۔ اس کے ذریعے ان کا نفاق واضح کیا گیا۔ کہا گیا کہ یہ تفریق بین المسلمین کے لئے تعمیر کی گئی ہے یہ کسی نیک جذبے کی پیداوار نہیں بلکہ اس کا سبب کفر ہے۔ وہ نفاق ہے جو ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے اور جو خلوص کی بنا پہ مسجد تعمیر کرنے والے تھے ان کے ایمان ہی کو ظاہر نہیں کیا ان کے عمل کی بھی تعریف ہونے لگی کہ یہ پاکیزہ صفات ہی پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں۔

تقویٰ کی شان

ایک تقویٰ عقلی ہوتا ہے جو قانون کی گرفت سے باز رہنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ اس میں حلاوت و لذت نہیں ہوتی۔ یہ تو سراسر اندیشوں اور وسوسوں سے معمور ہوتا ہے ہر قدم پر یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں یہ غلط نہ اُٹھ گیا ہو۔ پکڑا نہ جاؤں۔ گرفت میں نہ آجاؤں جو تقویٰ اپنے رب کی محبت میں مبتلا ہو کر اختیار کیا جائے اس میں اِسی کی شان جلوہ گر ہوتی ہے وہ محبت کا آئینہ کہلاتا ہے لذتیں بخشتا ہے کیفیتیں عطا کرتا ہے۔ قرب کا زینہ ہوتا ہے ایسے تقوے میں رب اپنے بندے سے جدا نہیں ہوتا، جدائی وہاں ممکن ہوتی ہے جہاں قانون کا تعلق ہو۔ محض قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لئے تعلق قائم کر لیا گیا ہو، ... نہ دل اٹکا ہو نہ جان پُر سوز ہو، دل کے تعلق کے تقاضے محض قانون کے تقاضے پورے کر دینے پورے نہیں ہوتے وہ ہر مرحلے پہ پہنچ کر نا تمام رہتے ہیں۔ دل کے تعلق کے تقاضوں میں گھرا جا کر بھی یار کی تواضع کی جائے تو ذوق آسودہ نہیں ہوتا یہی احساس رہتا ہے کہ شایانِ شان خدمت نہ ہو سکی اور قانونی تعلق میں یہ احساس شکست نہیں ہوتا۔ وہاں قانون کے تقاضے پورے کر دینے کے بعد انسان اکڑنے لگتا ہے کہ میں نے بڑا تیر مارا قانون کے تعلق میں تیر کھایا جاتا ہے۔ تیر بھی مزا دیتا ہے اور تیر کی خلش بھی۔ دو ذاتوں اور دو روحوں کے درمیان جو روحانی تعلق ہوتا ہے وہ چونکہ دونوں کے راز اور بھید کی حیثیت رکھتا ہے جس کی تشہیر جائز نہیں ہوتی۔ اسی لئے تقویٰ کی تشہیر ایک سنگین جرم ہے اس لیے کہ یہ بندے اور مولے کے درمیان ایک راز ہے اس راز کو راز ہی رہنا چاہیے کہ تقویٰ کی اصل

حقیقت یہی ہے وہ خدا اور بندے کے سوا کسی تیسری ذات یا ہستی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

نبوّت کے فیوض

حضرت علیؓ کی والدہ ماجدہ فاطمہ بنتِ اسد سے حضورؐ کو جو تعلقِ خاطر تھا وہ شرح و بیان کا محتاج نہیں، حضورؐ انہیں اپنی والدہ ماجدہؓ کے مقام پر سمجھتے تھے ان کا وصال ہوا تو حضورؐ نے فرمایا کہ ابو طالب کے بعد مجھ سے اتنی محبت کسی نے نہیں کی ان کی آخری آرام گاہ تک حضورؐ نے جنازے کو کندھا دیا قبر کھد گئی تو حضورؐ لحد میں لیٹ گئے۔ لحد کی مٹی بھی اپنے ہاتھوں سے صاف کی، یہ منظر صحابہؓ نے بھی دیکھا تھا چنانچہ انہوں نے استفسار کیا کہ کفن میں قمیص مبارک کے رکھنے اور لحد میں لیٹنے کی کیا وجہ ہے؟

حضورؐ نے فرمایا کہ میری قمیص کے باعث یہ عذاب قبر سے محفوظ رہیں گی اور لحد میں لیٹنے کی یہ وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ ان کی قبر کو وسیع سے وسیع تر بنا دے، دفن کے بعد یہ بھی فرمایا کہ ان کے سوا قبر کے عذاب سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپ کے صاحبزادے قاسمؓ بھی جو صغر سنی میں فوت ہوئے ہیں؟ فرمایا کہ قاسمؓ تو پھر بھی بڑے تھے ان سے چھوٹے ابراہیمؓ بھی مستثنیٰ نہیں۔ قبر کے اندیشوں اور کھٹکوں سے حضورؐ نے اگر کسی کو مستثنیٰ قرار دیا تو وہ صرف حضرت علیؓ کی والدہ ماجدہ ہیں کھٹکے اور اندیشے کا تعلق انسان کے دل سے ہے جسے حضورؐ دیکھ رہے ہیں اور بیان فرما رہے ہیں، یہ نبوت کی آنکھ کا اعجاز ہے جو قبر کے اندر بھی انسانی احساسات، و جذبات کو دیکھ لیتی ہے، دل کی کیفیات بھی اس سے مستور نہیں رہتیں چہ جائے کہ برزخی زندگی میں پیش آنے والے حالات جو ظواہر سے تعلق رکھتے ہیں، یہ مقامِ نبوت ہے جو فلسفیوں اور مادہ پرستوں کے فہم و ادراک سے بالا ہے۔

معجزہ اور دلیل

انبیاء علیہم السّلام کو معجزات بھی عطا ہوتے ہیں اور دلائل بھی۔ معجزہ، حسّی چیز ہے اور دلیل کا تعلق معقولات کی دنیا سے ہے۔ ایک امرِ معقول ہے اور ایک امرِ محسوس، معقول بات سمجھنے کی چونکہ ہر ایک میں صلاحیت نہیں ہوتی۔ بعض لوگ کوڑ مغز اور غبی ہوتے ہیں زندگی بھر حسّ کی دنیا سے آگے نہیں گذر سکتے۔ اِس لئے اُن کے سامنے معجزہ پیش کیا جاتا ہے۔ ذہین اور طبّاع لوگوں کا فطری رجحان چونکہ دلائل کی طرف ہوتا ہے۔ اس لئے وہ دلیل و برہان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے انبیاء کے دلائل ہوتے ہیں۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا معاملہ بالکل جداگانہ نوعیت کا ہے۔ حضورؐ کا معجزہ قرآن ہے۔ جو حسّی بھی ہے اور معقولی بھی، دلیل بھی ہے اور اعجاز بھی، دلائلِ ربوبیّت، شواہدِ نبوّت، اسرارِ معرفت یا رموزِ ملکوتی اور اسی نوع کے دوسرے خزائنِ علم و عرفان اُن لوگوں کے لئے ہیں۔ جو طبعِ سلیم رکھتے ہیں اور انہیں معقولیّت کے جہاں سے لگاؤ ہے۔ جو اِن صفات سے عاری ہیں وہ اعجازِ بیان کے منکر نہیں ہو سکتے۔

غرض نبوّت کی شان یہ ہے کہ وہ دلیل بھی ہوتی ہے اور اعجاز بھی، بعض لوگ دلیل سے متاثر ہوتے ہیں اور بعض اعجاز سے، ان دونوں گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہے اور وہ نبیؐ کی ذات سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ شیدائیوں کی جماعت کہلاتی ہے۔ اسے عشّاق کا نام دیا گیا ہے۔ صدّیقین کے لقب سے پکارا گیا ہے۔ اِن کی نظر دلیل اور اعجاز پہ نہیں ہوتی۔ صاحبِ اعجاز پہ ہوتی ہے۔ وہ ذات کو دیکھ کر کلمہ پڑھتے ہیں۔ جمال کو دیکھ کر ایمان لاتے ہیں۔ صدیقؓ و فاروقؓ، عثمانؓ و علیؓ، بلالؓ و صہیبؓ، عمّارؓ و یاسرؓ، ابوذرؓ اور اسی نوع کے نفوسِ قدسیہ کا ایمان اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔

نبیؑ اور وحی

ہر نبیؑ پر اسکی قوم کی زبان میں وحی نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ تورات و انجیل، زبور اور قرآن اس پر شاہد ہیں۔ ایک نبیؑ بھی ایسا نہیں ہوا جس کی وحی کی زبان اس کی قوم کی زبان سے الگ ہو۔

نبیؑ کی اپنی زبان بھی قومی زبان رہی ہے۔ اور اُس کی وحی کی زبان بھی قومی زبان سے مختلف نہیں ہوئی۔ بایں ہمہ نبیؑ کو وحی کا ترجمان بنایا گیا ہے۔ اگر وحی کے سمجھنے کے لئے محض زبان دانی کافی ہوتی تو انبیاءؑ کی بعثت کی ضرورت نہ تھی لوگ خود بخود وحی کا مفہوم سمجھ لیتے۔

شعیب علیہ السّلام جو اپنی قوم ہی کے ایک فرد تھے، ان کی بولی بھی وہی تھی۔ لیکن قوم نے اُن کی زبان سے ربّانی کلام سُن کر کہا کہ آپ کی بیشتر باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ حضرت شعیبؑ ملکی زبان ہی میں اُن سے مخاطب تھے۔ لیکن وہ لوگ ربّانی کلام کا مفہوم نہ سمجھ سکے۔

ربوبیّت کا جو تصوّر موسیٰ علیہ السّلام نے فرعون کے سامنے پیش کیا وہ بھی اسے نہ سمجھ سکا۔ اور چیخ اٹھا کہ یہ ربّ العٰلمین کیا ہے؟ اور حضرت موسیٰؑ کو یہ مفہوم سمجھانے کے لئے مختلف اسالیبِ بیان اختیار کرنے پڑے۔ جن کا تذکرہ قرآنِ حکیم میں موجود ہے۔ نمرود کو بھی رب کا مفہوم سمجھ نہ آیا۔ تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو کئی مثالیں دینی پڑی تھیں۔

متمرّد اور سرکش انسان تفصیل کو بھی نہیں سمجھ سکتا اور سلیم فطرت رکھنے والے کے لئے اجمال بھی کافی ہوتا ہے۔ صدّیقؓ کے لئے اجمال کافی تھا اور ابوجہل کے لئے تفصیل بھی مکتفی نہ ہو سکی۔ نبیؑ کی ایک توضیح اپنوں کے لئے ہوتی ہے اور ایک بیگانوں کے لئے۔ شرح و بیان کے ذریعے وہ اپنوں کی آتشِ شوق کو تیز کرتا ہے۔ انہیں لذّت آشنا بنا دیتا ہے لیکن بیگانوں کے سامنے کی جانے والی شرح کا یہ مقصد نہیں ہوتا۔ وہ تو لذّت ہی کے مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

نبیؐ اور اُمّتی

اُمّتی خواہ کتنے بھی اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز ہو، نبیؐ کا مثیل و مماثل نہیں ہو سکتا۔ نبیؐ اپنی ذات اور صفات میں منفرد ہوتا ہے۔ اُسے رب کی بارگاہ سے انفرادیت ملتی ہے۔

اُمّتی نام ہے جویائے منزل کا، طالبِ منزل کا، اور نبیؐ کی جھولی میں مراد ہوتی ہے۔ وہ منزل سے جادے کی طرف آتا ہے تاکہ مسافروں کو فائزِ منزل بنائے۔ انہیں منزل کا سراغ دے، منزل کی حقیقت سے آگاہی بخشے۔ یا یوں کہیئے کہ ایک جادہ شناس بھی نہیں ہوتا اور ایک منزل سے باخبر، منزل کا ہادی، منزل کا مخبر اور مبشّر ہوتا ہے۔

اُمّتی دنیا سے گذر کر اپنے رب کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے اور نبیؐ رب کی طرف سے مبعوث ہو کر لوگوں کے پاس آتا ہے۔ تاکہ انہیں رب کی معرفت عطا کرے۔ نبیؐ کا رخ مخلوق کی طرف ہوتا ہے اور مخلوق کا خالق کی طرف۔ نبیؐ کی ایک جہت جو ابلاغ و تندیر سے تعلق رکھتی ہے مخلوق سے ملی ہوتی ہے اور ایک جہت اپنے خالق سے واصل۔ وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایک رشتے اور ذریعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُمتی کی جہت خالق سے واصل نہیں ہوتی۔ وہ نبیؐ سے مل کر واصل بنتا ہے۔ وصال اُسے نبوّتؐ عطا کرتی ہے۔ نبوّتؐ کے انوار میں جو قدم اٹھاتا ہے، وہی قربِ خداوندی کا ذریعہ بنتا ہے۔ قرب اور معرفت، نبوّتؐ کا فیضان ہوتے ہیں۔ ان دیکھی راہوں کا سفر طے کرنے کے لئے حتمی اور یقینی علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظنّ و قیاس کے گھوڑے دوڑانے سے یہ سفر محفوظ نہیں ہو سکتا، اور عُقبیٰ کی منزل طے کرنے کے لئے جس علم کی ضرورت ہوتی ہے، وہ نبوّت عطا کرتی ہے۔ یہ قیاس و گمان کی راہ نہیں، یقین کی راہ ہے اور یقین نبوّت کا علم بخشتا ہے اس لئے کہ نبیؐ کا دامن یقین ہی سے معمور نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کو بھی یقین سے معمور کر دیتا ہے۔ یہاں ریب و شک، کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

اجمال اور تفصیل

عہدِ نبوی کے اُن خطبات کو جب ہم دیکھتے ہیں جو حضورؐ نے مختلف اوقات میں صحابہؓ کے سامنے ارشاد فرمائے ہیں تو اُن میں غایت درجہ کا اختصار نظر آتا ہے۔ کہیں بھی طول وطویل بحث نہیں۔ امن کے زمانے کے خطبات ہوں یا جنگ کے زمانے کے، ہر جگہ یہی اجمال و اختصار کی شان جلوہ گر نظر آئے گی۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، دعوت و ارشاد کے سلسلے دراز ہوتے گئے۔ بیانوں میں طوالت آگئی۔ اجمال نے تفصیل کی صورت اختیار کر لی۔ علوم و فنون کا سلسلہ اتنا پھیلا کہ دفاتر کے دفاتر سیاہ ہونے کے باوجود بھی ناکافی سمجھے جانے لگے۔ فکرِ انسانی نے ایک ایک موضوع کو لیا اور اُس کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کیا۔

قرآن بھی ایک اجمالی کتاب ہے لیکن اس کی جو تفاصیل مختلف رنگوں اور صورتوں میں سامنے آئی ہیں وہ بے شمار ہیں۔ اربابِ نظر و فکر نے کتاب اللہ سے جو معانی اخذ کئے ہیں اور انہیں قاعدوں اور ضابطوں میں ڈھالا ہے اُن کی فہرست کوئی معمولی نہیں۔ آئمۂ اسلام کی وہ جگر کاویاں اور جاں فشانیاں یقیناً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔ جو اُن سے قرآنی علوم کے پھیلانے اور ظاہر کرنے کے سلسلے میں ظہور پذیر ہوئی ہیں فقہی مسائل کے وہ دریا جو الفاظ کے کوزوں میں بند ہیں قرآن اور صاحبِ قرآن کے علوم کی بے پناہی، جامعیت اور آفاقیت کا پتہ دیتے ہیں یہ ساری تفصیل اسی اجمال کی ہے۔ جو ایک مختصر سی کتاب کی صورت میں اللہ تعالےٰ کے آخری نبیؐ اور رسولؐ کے قلب پر نازل ہوا تھا۔

غرض قرآن ہو یا حدیثِ پاک، ان دونوں میں اجمالی صورت نظر آتی ہے لیکن آگے چل کر یہی حقیقت اتنی پھیلی کہ قلزمِ ذخار بن گئی۔ پے در پے پردے اٹھتے گئے اور حقیقت کا حسن و جمال فزوں سے فزوں تر ہوتا گیا۔

کوئی حقیقت جب اجمالی صورت میں سمٹی ہوتی ہے تو بہت کم نظریں اس کی ماہیت معلوم کر سکتی

ہیں۔ یہی حقیقت اجمال کی حدود سے نکل کر تفصیل کا رنگ اختیار کر لے تو عوام کی نظریں بھی اس طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ وہ بھی اس کی اہمیت و افادیت کا اعتراف کر کے اس کی طرف جھکنے لگتے ہیں۔

قرآن جو ایک ربانی نوشتہ ہے اور سراسر اجمال ہی اجمال ہے۔ جب زبانِ نبوت نے اس کی شرح و تفصیل بیان کی تو یہی اجمال تفصیل کی صورت اختیار کر گیا۔ قرآن میں نماز کا ذکر مجملاً ہے۔ رسولؐ کے قول و فعل سے اس کی تفصیل ہو گئی۔ حج کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ رسالت کے آئینے میں حج کے ارکان کی تفصیلات نظر آنے لگیں تو کوئی اغلاق و ابہام باقی نہ رہا۔ شریعت کے ایسے متعدد امور ہیں۔ جن کا حسن و جمال رسالت کے آئینے میں آنے کے بعد ظاہر ہوا۔ اسلام جب مکے میں محدودیت و مستوریت کی زندگی گذار رہا تھا تو اس کی حیثیت ایک اجمال کی تھی۔ جہاں صرف خدیجۃ الکبریٰؓ، علی المرتضیٰؓ، صدیقؓ و فاروقؓ اور بلالؓ و صہیبؓ جیسے بالغ نظر اور حقیقت بین انسانوں کی نظریں پہنچ سکتی تھیں۔ یہی اجمال مدینے میں پہنچ کر تفصیل کی صورت اختیار کر گیا تو دوسرے بھی اس سے فیض یاب ہونے لگے۔

اجمال اور تفصیل دونوں حقیقتیں ہیں۔ اور دونوں کی افادیت مسلّم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اجمال دیدہ ور کے لئے ہوتا ہے اور تفصیل عوام کو مطمئن کر سکتی ہے۔ اجمال، عوام و خواص کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دیتا ہے اور تفصیل میں یہ صورت نہیں ہوتی۔ مکے اور مدینے کے جن انصارؓ و مہاجرینؓ نے اسلام کو اجمالی صورت میں دیکھ کر قبول کیا۔ وہ قرآن کی زبان میں السابقون الاوّلون کہلائے۔ انہیں رضوانِ الٰہی کی سند ملی۔ وہی مقبولیت ہی کی منزل پر فائز نہ ہوئے بلکہ جن لوگوں نے ان کا اتباع کیا، ان کے نقوشِ قدم کو مشعلِ ہدایت جان کر اختیار کیا، انہیں بھی مقبولیت مل گئی۔ ان کی مثال کوئی نہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے حسنِ مطلق کے جلووں کو اجمالی صورت میں دیکھ کر پہچان لیا۔ یہ اجمال جوں جوں پھیلتا گیا۔ ان کی وذائیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ سیلاب نور بن کر پھیلنے والی یہ حقیقت دراصل ان کے جذبات کی مصدق تھی کہ تم نے ابتداء میں جو کچھ دیکھا تھا وہ حق تھا۔ اسی لئے انہیں لحظہ بہ لحظہ نئی کیفیتیں نصیب ہو رہی تھیں۔

تدبّر و تفکّر

حیوانات کی دُنیا عالمِ محسوسات تک محدود ہے۔ معقولات کی انہیں ہوا تک نہیں لگی۔ معقول بات نہ وہ سُن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ شرف و امتیاز صرف انسان ہی کو حاصل ہے کہ وہ معقولات کے جہان کا درک رکھتا ہے۔ مجہولات کو ترتیب دے کر معلومات کو گرفت میں لے آتا ہے۔ فہم و ذکاء کے ذریعے انجانی حقیقتوں کو معلوم کر لیتا ہے۔ اسی بنا پر وہ شرعی مکلّف بنایا گیا ہے۔ جزا و سزا کا مستحق قرار پاتا ہے یہ امتیاز باقی نہ رہے تو تکلیفِ شرعی بھی باقی نہیں رہتی۔ انسان، دیوانوں، پاگلوں اور معذوروں کے زمرے میں شمار ہونے لگتا ہے۔ کافروں کو قرآن نے چوپایوں سے بدتر قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ محسوسات کی دنیا سے گذر کر معقولات کی دنیا تک آنے کے لئے تیار نہ تھے۔ معجزات بھی اسی لئے طلب کرتے تھے کہ اُن کی دنیا تمام تر حسّی تھی۔ کتاب اللہ کی صورت میں اُن کے سامنے جو ربانی معجزہ موجود تھا وہ بھی معقولات کی دنیا پر مشتمل تھا۔ حسّی دنیا سے اسے کوئی مناسبت نہ تھی۔ اسی لئے وہ اُن کے دل میں نہ اُتر سکا اور وہ اپنے پروردگار کی نظروں میں چوپایوں سے بھی حقیر قرار پائے۔ جن لوگوں کے فکر و عمل کی پرواز عالمِ محسوسات کی فضاؤں تک ہی محدود ہے اور وہ معقولات کے جہان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتے وہ اپنی تمام تر بوالعجبیوں اور طرفہ کاریوں کے باوجود حس کے مقام پر کھڑے ہیں اور حس کا مقام درندوں اور چوپایوں کا مقام ہے۔ انسانیت کا مقام اس سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ وہاں محسوسات ہی کی کارفرمائی نہیں معقولات کی بھی جلوہ نمائی ہے قرآن میں بار بار کفار کے عدمِ تفکّر اور عدمِ تدبّر کا شکوہ کیا گیا ہے۔ وہ قرآن میں غور و خوض نہ کرتے تھے۔ تدبّر و تفکّر کی جو قوت انہیں دی گئی تھی وہ دوسرے کاموں پر تو صرف ہو رہی تھی لیکن قرآن کے باب میں یہ قوت بالکل بیکار تھی اس لئے اُن کی ذہنیت کا ماتم کیا گیا اور وہ عتاب کے مستحق قرار پائے۔

سکوت اور کلام

انسان کو خدا تعالیٰ نے سمیع و بصیر بنایا ہے اور اِس کے اِس وصف کو قرآن حکیم میں بیان کیا گیا ہے سماعت بھی ایک نعمت ہے اور بصارت بھی انعام، سماعت، کلام سننے کے لئے ہے۔ کلام ہو اور سماعت نہ ہو تو کلام کا مقصود فوت ہو جاتا ہے۔

انبیاءؑ کو کلام عطا کیا۔ اسی لئے کہ اُن کے مخاطبین کے پاس سماعت کی قوت موجود تھی۔ وہ آیاتِ الٰہی کو دیکھ بھی سکتے تھے۔ سماعت بصارت اور اسی نوع کی دوسری قوتیں دینے کے بعد خدا تعالےٰ نے ان کے مصرف کی حدود بھی متعین کر دیں۔ نہ سماعت کو آزاد چھوڑا گیا نہ بصارت کو، ظاہری اور باطنی قوتوں کو ایک اخلاقی ضابطے کا پابند بنا دیا گیا۔ سماعت وہی محمود قرار پائی جس کا مصرف صحیح تھا جو مصروفات کے لئے وقف تھی اور جسے منکرات سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ کلام کی نسبت سے سماعت کو بھی محمود اور مذموم قرار دے دیا گیا۔ کلام، محمود تھا تو سماعت بھی محمود سمجھی گئی۔ مذموم کلام کے وقت استعمال ہونے والی سماعت کو بھی مذموم کہا گیا۔ گویائی اور خاموشی بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے زبان پر حق جاری۔ ہو تو گویائی کو باطل نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں بیہودہ گوئی سے خاموشی بہتر ہے۔ ایک شخص کی زبان سے خاموشی سے فوائد سن کر شیخ شبلی علیہ الرحمۃ نے فرمایا تھا کہ تیرے کلام سے تیری خاموشی بہتر ہے۔ نہ تیرا کلام مفید ہے نہ خاموشی روح پرور، میرا کلام، علم ہے اور خاموشی، حلم، میں سخن کا ساز اٹھاؤں تو دلوں کو زندگی بخش دوں۔ خاموش رہوں تو اسرار ہویدا ہونے لگیں۔ میری خاموشی نہ عجز کی وجہ سے ہے، نہ غفلت کے باعث۔ دونوں کسی کا پردہ ہیں۔ دونوں سے کسی کے جمال کی شان ظاہر ہے۔ لیکن تیرا معاملہ ایسا نہیں، نہ سکوت جمال کا آئینہ دار ہے نہ کلام۔

نبیؑ کی تسکین

حضرت موسیٰ علیہ السّلام جب بنی اسرائیل کو لے کر دریائے نیل کے کنارے پہنچے تو بنی اسرائیل یہ دیکھ کر گھبرا گئے کہ فرعون کا لشکر آگیا ہے۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السّلام سے کہا کہ ہم تو پکڑے گئے لیکن موسیٰ علیہ السّلام نے یہ کہہ کر انہیں تسکین دی کہ ابھی میرا رب راہ دے دیگا۔

بظاہر راہ ملنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ راستے میں دریائے نیل بہہ رہا تھا۔ اور فرعون آگیا تھا۔ لیکن بایں ہم جب موسیٰ علیہ السّلام کی زبان سے بنی اسرائیل نے تسکین کے الفاظ سنے تو انہیں یہ مین میخ نکالنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ راہ کیسے مل سکتی ہے؟ اب تو پانی سر سے گذر گیا ہے۔ چند لمحوں کی بات ہے فرعون اپنے لشکر سمیت پہنچ کر ہمیں گرفتار کرلے گا۔ موسیٰ علیہ السّلام نے تسکین دی تو انہیں تسکین ہوگئی۔

بات دراصل یہ ہے کہ نبیؑ کی بارگاہ سے ملنے والی تسکین کو،

دنیا کی بارگاہوں سے ملنے والی تسکین پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اہل دنیا کی تسکین اسباب و علل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ اسباب کو دیکھ کر تسکین دیتے ہیں لیکن نبیؑ کی تسکین اسباب و علل پر موقوف نہیں ہوتی۔ وہ رحمت سے وابستہ ہوتی ہے دنیا دار تسلی دیں تو ضروری نہیں کہ دل ٹھہر جائے صبر آجائے اور آنسوؤں کے تسلسل میں کمی واقع ہو جائے۔ بلکہ بعض اوقات تو دنیا والوں کی تسلی اور اضطراب کا موجب بن جاتی ہے۔ وہ مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اضطراب بڑھنے لگتا ہے کہ حالات نہیں بدلیں گے۔ غم سے رستگاری نصیب نہیں ہوگی۔ اہل دنیا کی تسلی کے وقت نظر حالات کے دھارے پر ہوتی ہے۔ اور جب نبیؑ یا ولیؒ تسکین دیتا ہے۔ تو نظر حالات سے ہٹ کر رحمتِ الٰہی پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ عوام کی تسکین کے وقت ذہن حالات کا تجزیہ کرتا ہے۔ اسباب کو دیکھتا ہے۔ اور مقرّب کی تسکین کے وقت اسباب پر نظر نہیں ہوتی بلکہ نظر میں رحمت ہوتی ہے۔

برزخی مقامات

برزخی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ چونکہ انبیا علیہم السلام کی زندگی کا معمول تھا۔ اس لئے یہ دولت انہی کو ملتی ہے۔ جو انبیاؑ کے فیوض سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

کافر، برزخ میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتا۔ مردوں سے کلام کرنا، اُن کی آواز سننا اور انہیں سنانا، یہ ایمان کے اعلیٰ ترین مقامات سے تعلق رکھتا ہے۔ کافر اگر اپنے ابنائے جنس سے اُن کے مرنے کے بعد کلام کر سکتا تو فوراً ایمان لے آتا۔ اس لئے کہ اس طرح اسے اُن کے اُس عذاب سے آگاہی ہو جاتی جس میں کافروں کی روحیں مبتلا ہوتی ہیں۔ کافر تو کیا، عام مومن بھی برزخ کے مشاہدے سے قاصر ہے کیونکہ برزخ نام ہے پردے کا اور پردہ عوام کے لئے نہیں اٹھایا جاتا اس میں صرف خواص کو آنے کی اجازت ہوتی ہے، اور پھر برزخ کے مقامات و مدارج بھی مختلف ہیں۔ مقرب انسان بھی وہیں تک دیکھ سکتا ہے جہاں تک اُس کی رسائی ممکن ہو۔ جب دنیا کی بارگاہ میں ہر انسان ہر مقام تک نہیں پہنچ سکتا تو برزخی زندگی میں یہ کیسے ممکن ہے کہ ہر آدمی ہر ایک کے برزخ میں جا سکتا ہے۔ مقرّب کو مقرب کا برزخ نظر آ سکتا ہے اور عارف، عارف کے برزخ سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔

سیدالانبیا، صلّی اللہ علیہ وسلّم کا برزخ چونکہ تمام انبیاؑ و رسلؑ کے برزخ سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اس لئے حضورؐ اپنی برزخی زندگی میں بھی تمام کو دیکھ سکتے ہیں۔ چاند اگر اپنی بلندیوں سے پستی والوں کو دیکھ لے یا انہیں نظر آجائے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ہر آدمی کے مرنے کے بعد برزخی زندگی میں جو حضورؐ کی صورتِ پاک نظر آتی ہے اور اُس سے حضورؐ کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ یہ ذات کون ہے۔ انہیں پہچانتا ہے؟ تو یہ بھی حضورؐ کی بلندیٔ مرتبت کی ایک دلیل ہے۔ زمین والوں کو ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھا کر چاند دکھایا بھی جا سکتا ہے۔ اُس کے متعلق گوناگوں استفسارات بھی کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن حجابات میں مستور انسان چاندنی رات بھی چاند کو نہیں دیکھ سکتا۔

بہار و خزاں

اسلام کو دینِ حنیف کی حیثیت سے قبول کرتے وقت صحابہؓ کی تمام تر تعداد غربا و
مساکین ہی پر مشتمل نہ تھی۔ اُن میں کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے بھی تھے اور وہ
بھی جن کی تاجرانہ حیثیت مستحکم تھی اور وہ بھی تھے جن کے باغ اور زمین کے قطعات بھی تھے۔ انہیں
یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام کی آغوش میں آجانے کے بعد اُن سے یہ چیزیں چھن جائیں گی۔ قریش کی
برادری کے معزز فرد ہونے کی حیثیت سے انہیں معاشرے میں جو نمایاں مقام حاصل ہے وہ بھی
باقی نہ رہے گا۔ اور اُن سے نہایت بے دردانہ سلوک کیا جائے گا۔ لیکن یہ سب کچھ جاننے
کے باوجود انہوں نے اسلام کی راہ قبول کی تو مال و منال اور عزت و آبرو کو لاحق ہونے والے
کسی خطرے کا تصوّر ان کی راہ نہ روک سکا۔ جن خطرات سے صحابہؓ کو دینِ اسلام کے علمدار کی
حیثیت سے دوچار ہونا پڑا وہ ان پر اچانک نہ ٹوٹ پڑے تھے وہ سامنے منڈلا رہے تھے
اور صحابہؓ کی نگاہیں انہیں دیکھ رہی تھیں۔ بایں ہمہ انہوں نے انہیں نہایت خندہ پیشانی
سے قبول کیا۔ رحمت کا پیغام جان کر سینے سے لگایا اور یہ خطرہ اُن کے دلوں میں راہ نہ پاسکا
کہ عزت و وقار اور مال و منال کی قربانی دے کر ہم نے کیا مصیبت مول لے لی ہے؟ تاسّف
تو انسان کو اس وقت ہوتا ہے جب اُس نے کسی راہ کو منفعت بخش جان کر قبول کیا ہو اور وُہ
خسارے کی راہ نکلے جہاں سارے نقصانات سامنے ہوں اور انسان انہیں زندگی کی متاع جان
کر جھولی میں ڈالنے کے لئے بے تابانہ آگے بڑھے وہاں احساسِ زیاں کیسا؟ وہاں تو یہ نقصان،
نفع سے زیادہ عزیز معلوم ہونے لگتا ہے۔ نقصان برداشت کرنے میں وہ راحت محسوس ہوتی
ہے جو راست کی زندگی میں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کی جماعت میں ایسے افراد بھی
ملتے ہیں جنہوں نے جان بوجھ کر مصائب کی راہ اختیار کی جو مشکلات انہیں درپیش تھیں اُن سے
اُن کا ذوق آسودہ ہوتا تھا۔ بلالِ حبشیؓ ہی کو دیکھ لیجئے امیّہ بن خلف کی غلامی میں انہیں

جن آلام کا مورد بنایا جارہا تھا اُن سے اُن کا ذوق آسودہ نہ تھا وہ اُن میں زیادتی چاہتے تھے اسی لئے بار بار حضورؐ کا اسمِ گرامی زبان پہ لاتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ اسمِ گرامی سن کر امیّہ کی آتشِ غیظ و غضب اور بھڑکے گی اور وہ زیادہ تکلیف دے گا۔ امیّہ بھی تشدّد کے ذریعہ انہیں خاموش کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ بلالؓ کی زبان پہ بدستور نام محمدؐ تھا۔ اور یہ تو بلالؓ جانے یا بلالؓ کا رب، کہ امیہ کی بھڑکائی ہوئی آگ میں بلالؓ کو نامِ پاک کی تکرار میں کیا مزا ملتا تھا۔ حضورؐ سے بھی ایسا کوئی واقعہ مذکور نہیں کہ حضورؐ نے بلالؓ کے نام کوئی ایسا پیغام بھیجا ہو کہ مصائب کی زندگی میں میرا نام لے کر امیّہ کو چڑانے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے دل میں یاد کر لیا کرو اس طرح امیّہ کے مزید تشدّد کا شکار بننے سے محفوظ رہو گے۔ معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ حضورؐ بھی بلالؓ کی ان لذات سے واقف تھے جو انہیں مصیبت کے وقت حضورؐ کو پکارنے اور نامِ پاک کی تکرار کرنے سے حاصل ہو رہی تھیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ وہ محبوب ہی کیسا؟ جس کا نام مصیبت میں مزا نہ دے مصائب کی تلخی کو کم نہ کر دے۔ رگ و پے میں بجلیاں نہ دوڑا دے۔ احساسات کو لذات و کیفیات کا گہوارہ نہ بنا دے۔ رگ رگ میں سمائے ہوئے احساسات میں بسے ہوئے اور روح کی خلوتوں کے ایک ایک گوشے کو اپنا مسکن بنانے والے کو دل سے کون جدا کر سکتا ہے؟ جدائی تو کثیف میں ممکن ہوتی ہے۔ کثیف کو کثیف سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ محبت جب لطافت کا پیکر بن کر احساسات میں سما جاتی ہے تو اُس کی جدائی ممکن نہیں ہوتی فرق و ہجر کا یہاں گذر کہاں؟

لوح و قلم

انسانی فکر کا دائرۂ عالمِ موجودات تک محدود ہے۔ اور وحی دوسرے جہان کی چیز ہے جو فکرِ انسانی سے ماوراء ہے۔ فکرِ انسانی بھی اگر وحی کی طرح ملکوتی اور لاہوتی جہان سے پیوند رکھنے والی چیز ہوتی تو وحی کے نزول کی ضرورت نہ تھی۔ فکر ہی انسان کی رہبر، معلّم اور مزکّی بن جاتی یہ

کام چونکہ وحی کے کرنے کا تھا۔ اسی لئے انبیاء علیہم السّلام کو مبعوث کیا گیا۔ جو ایک طرف مخلوق میں شامل اور دوسری طرف اللہ سے واصل تھے۔ وحی کے انوار کا سلسلہ حریم جمال کی خلوتوں تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ وہیں سے آتی ہے اور وہیں کی خبر دیتی ہے یہ جادہ شناس ہی نہیں منزل شناس بھی ہے۔ لوح و قلم، عرش و کرسی، سدرۃ المنتہیٰ، بیت المعمور، جنت و دوزخ، اعراف و بہشت وحی کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ یہ ان سے روشناس کرتی ہے۔ ان کی کیفیت و کمیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ فکرِ انسانی ان چیزوں سے آگاہ نہیں۔ وہ جنت و دوزخ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہے۔ ان کا طول و عرض نہیں ناپ سکتی۔ اور وحی نے ان کی حقیقتوں کو بھی واضح کیا ہے۔ صراط کا مفہوم ہی نہیں بتایا یہ بھی بتایا ہے کہ صراط میدانِ حشر سے جنت کی طرف جانے والی راہ کا نام ہے۔ یہ بال سے باریک ہے اور تلوار سے تیز، کچھ لوگ یہاں سے بجلی کی طرح گذریں گے۔ بعض کی پرواز ہوا اور صبا کی طرح ہوگی بعض گذرنے والے سبک رفتار ہوں گے اور بعض کی رفتار مدھم ہوگی۔ بعض کو گذرنے کا احساس بھی نہیں ہوگا۔ وہ کہیں گے کہ دوزخ کہاں تھی۔ ہم نے تو بجز لطف و کرم کے کچھ نہیں دیکھا۔ اُن سے کہا جائے گا کہ تمہارے ایمان کے شعلوں نے دوزخ کی آگ کو سرد کر دیا تھا۔

غرض وحی ایک ایک چیز کی حقیقت بیان کرتی ہے اور اُس کے بیان میں اشکال و ابہام نہیں وہ مظہرِ ذات و صفات ہے حقیقتوں کا نور اُس کے جلو میں ہے۔ اور وہ خود تجلی کی ایک شکل ہے۔

دعوت اور دُعا

کافر و مومن دونوں پر امّت کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن ایک امتِ دعوت ہے اور ایک امتِ اجابت۔ دعوت عام ہے اور اس میں مومن و مشرک کی کوئی تمیز نہیں۔ امتِ اجابت صرف ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے دل سے حضورؐ کی تصدیق کی۔ اور اس نظامِ حیات کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنایا جو حضورؐ

لے کر مبعوث ہوئے تھے۔ دعوت میں کوئی تخصیص نہیں ہر ایک کے لئے ہے۔ ابوجہل کے لئے بھی اور ابولہب کے لئے بھی۔

لیکن دعا میں یہ بات نہیں، دعا اہلِ ایمان کے لئے مخصوص ہے۔ بعض اوقات حضور علیہ السلام نے غیر مسلموں کے لئے مغفرت کی دعا کرنے کی سعی کی تو حضورؐ کو یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ ان کی مغفرت نہ ہوگی اس لئے کہ یہ میرے بھی منکر ہیں اور آپ کے بھی۔ انہیں نہ بخشوں گا۔ کوئی کریم انسان اگر بربنائے شفقت و رحمت اپنے کسی دشمن کی اپنے خود دار اور غیور دوست کے پاس سفارش کرنے لگے تو وہ کمالِ تعلق کے باوجود اسے مسترد کر دیتا ہے بلکہ ایسی سفارش سے وہ اور بھی چڑ جاتا ہے کہ اس نے تو دشمنی کی حد کر دی۔ اور آپ سفارش کر رہے ہیں؟ ایسا کرنا تعلقات کے منافی نہیں ہوتا بلکہ عین تعلق کی دلیل ہوتا ہے۔ اس طرزِ عمل سے اور بھی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ ابوجہل اور اس کی ذریت کے متعلق حضورؐ کو وحی کے ذریعے اطلاع دے دی گئی تھی کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے اس کے باوجود حضورؐ کو دعوت سے نہ روکا گیا دعا کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دعا سے روک دیا گیا روکا نہ جاتا تو دعوت کی طرح یہ سلسلہ بھی جاری رہتا۔ اس لئے کہ حضورؐ کی فطرت، رحمت تھی لیکن اللہ کریم، رحیم و کریم ہونے کے ساتھ ساتھ جبار و قہار بھی ہے۔ اس کا رحم و کرم گناہگاروں کے لئے ہے اور قہر و غضب باغیوں اور طاغیوں کے لئے"

تسکین کے اقسام

دنیا کی تسکین اور عقبیٰ کی منزل کے راہنماؤں کی تسکین میں یہ بنیادی فرق ہے کہ ایک زندگی کی محدود راہوں میں کام دے سکتی ہے۔ محدود لمحات کو خوشگوار بنا سکتی ہے اور ایک لازوال دولت ہے جو یہاں اور وہاں دونوں جگہ کام دیتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا روحانی قرب خواہ معاشی فراغ نہ بھی بخشے روحانی فراغ ضرور بخش دیتا ہے اور یہ فراغ اسی زندگی تک محدود نہیں ہوتا اخروی زندگی میں بھی انسان کا ساتھ دیتا ہے۔

صحابۂ کرام ؓ کو افلاس وغربت میں جو ذہنی اور قلبی سکون حاصل تھا۔ وہ انہی کا حصّہ تھا۔ خوش حالی اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے والے اس کا تصوّر نہ کر سکتے تھے جو تصوّرِ حیات حضور ؐ نے صحابۂ ؓ کو دیا تھا، وہ دونوں جہان کی خوشگواریوں کا ضامن تھا۔ اس لئے احساسِ محرومی اُن کے قریب نہ پھٹک سکا۔ افلاس نے انہیں وہ مزے دیئے جو دولت وثروت کی زندگی میں ممکن نہیں۔ آلام وشدائد میں وہ مسرور رہنے لگے۔ نبیؐ کے دامن میں دونوں جہان کی تسکین کی دولت ہوتی ہے۔ وہ تسکین بانٹتا ہے۔ نبیؐ اور رسولؐ کا سچّا متبع کبھی مضطرب ہو ہی نہیں سکتا۔ اُس کا اضطراب صرف بندگی کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے اور اگر حوادث کے طوفان اسے پریشان کر دیں۔ اس سے زندگی کا وہ اثاثہ چھین لیں۔ جو قناعت کی دولت سے موسوم کیا جاتا ہے تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ اس کے تعلّق کو ابھی دوام نصیب نہیں ہو سکا۔ تعلق جتنا مضبوط اور مستحکم ہوگا۔ اسی قدر استقامت اور پامردی کی صورت میں ظاہر ہوگا غیب کی ان دیکھی حقیقتوں پر صحابہ ؓ کا ایمان تھا تو یہ بھی تعلق کی کرشمہ سازی تھی اور مصائب میں وُہ استقامت دکھاتے تھے تو یہ بھی تعلق ہی کا اعجاز تھا تسکین کی دولت اُن سے کبھی نہیں چھن سکی۔ بلکہ وہ تسکین کے قاسم بن چکے تھے۔

کسب اور وہب

بعض انعامات وہبی ہوتے ہیں اور بعض کسبی، وہب میں سعی وکوشش کا عمل دخل نہیں ہوتا وہبی عطا خالصۃً عطائے ربانیہ سے تعلّق رکھتی ہے۔ لیکن اس عطا میں بھی موہوب کی ذات پر نظر کا ہونا ضروری ہوتا ہے جب تک ذات مرکزِ نظر نہ ہو وہب کی شان ظاہر نہیں ہوتی۔ نبوت ایک وہبی چیز ہے جو کسب سے تعلّق نہیں رکھتی۔ لیکن قبلِ نبوّت بھی انبیاءؑ کی نظر اپنے رب کی کریمی پر ہوتی ہے۔ کسی عطا کا مورد بننے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ جس کریم ذات سے امیدِ کرم ہو اپنی کا اثاثہ لے کر اسی کی راہ میں ڈیرے ڈال دیئے جائیں ہو سکتا ہے کہ بے کسی پسند آجائے اور وہ کسی استحقاق کے بغیر نواز دے۔ لیکن کریم بارگاہ کی طرف بھول کر بھی نظر نہ اُٹھے تو عطا ظاہر نہیں ہوتی۔ وہبی

عطا اور چیز ہے۔ اُس کا تعلق موہبِ حقیقی کے خصوصی لطف وکرم سے ہے۔ بے نیازی برتنے کی صورت میں تو بعض اوقات کسب بھی بے کار ہو جاتا ہے۔ کسی کریم ذات کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی بارگاہ کے مفوّضہ امور کو سرانجام دیتے وقت کوئی شخص بے نیازی سے کام لے رہا ہے تو وہ اُس کی محنت برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ ایسی صورت میں کسب بھی کام نہیں دیتا تو وہبی عطا کی کیا امید کی جا سکتی ہے؟ وہب بھی نیاز و گداز کا سرمایہ چاہتا ہے

اس سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ عطائے ربانی کی شان بھی اچانک گرنے والی بجلی کی طرح ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بجلی خس وخاشاک پر نہیں گرتی۔ وہ جلانے کے لئے بلندیوں اور رفعتوں کو منتخب کرتی ہے۔ تاکہ اس کی شان ظاہر ہو۔ یہ معلوم ہو سکے کہ بجلی میں پہاڑوں کی عظیم چٹانوں کو جلا دینے کی قوت موجود ہے۔ بجلی کا ہدف پہاڑ اور صحرا بنتے ہیں اور رحمت کا مورد گداز سینے، یہاں عاجزوں کو نوازا جاتا ہے۔ ان کے عجز کی پذیرائی ہوتی ہے تاکہ رحمت کی شان ظاہر ہو سکے۔ بجلی، گرنے کے لئے کوئی قانون نہیں۔ موج میں آ گئے تو شکستہ جھونپڑی کو جلا دے لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا ہے۔ رحمت بھی طالبوں کو نوازتی ہے۔ ہاں، اختیار کا اظہار مقصود ہو تو غیر مستحق کو بھی آغوش میں لے لیتی ہے، لیکن یہ خوارق سے ہے۔ اور خوارق کا ظہور بہت کم ہوتا ہے۔

عطا کی ایک صورت ذاتی ہے اور ایک صفاتی، عطا کبھی ذات میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی صفت میں، ذات کی عطا خالصتاً ذاتِ واجب الوجود کا عطیہ ہوتی ہے اور صفت کی عطا کو کبھی کسب وعمل کا نتیجہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور کبھی یہ بھی خالصتاً وہب کہلاتی ہے کسب وعمل کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتی۔ آواز کا ذیر وبم، لطف وکرم کی خو، مزاج کی رقت، اور طبع کا گداز، یہ ساری چیزیں صفاتِ انسانی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور انہیں عطیے کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ کسی کسب وعمل کا نتیجہ نہیں ہوتیں۔

بعض صفات کسبی ہیں جن کا کسب وعمل سے تعلق ہے وہ سیکھنے کے ساتھ آ سکتی ہیں۔ ذات کو کسب کے ذریعے متقلب نہیں کیا جا سکتا۔ جس حبشی نژاد انسان کی ذات سیاہی کا مجموعہ ہوا سے

سفیدی سے بدلنا ممکن نہیں ذات میں تغیّر نہیں ہو سکتا۔ ہاں صفت میں تغیر ممکن ہے اور اس کی بھی حدیں ہیں، جو صفت، وہب کی آئینہ دار ہوگی وہ بدلی نہ جا سکے گی۔ پھول کی خوشبو، شمع کا جمال، بلبل کا سوز اور پروانے کا رقص سب وہبی صفات ہیں۔ انہیں ذات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں کچھ صفات ایسی بھی ہیں جن میں کسب کے ذریعے تغیّر ہو سکتا ہے

غرض وہب اور کسب میں یہ فرق ہے۔ کسب کو کسب کے ذریعے بدلا جا سکتا ہے اور وہب کو کسبی قوتیں نہیں بدل سکتیں۔ پھول مٹ جائے گا لیکن رنگ نہیں چھوڑے گا۔ مرجھانے کے بعد بھی خوشبو دے گا۔

انبیاء علیہم السّلام کی ذات اور صفات دونوں میں وہبی شان کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ اسی لئے شدائد زمانہ سے نہ ان کی ذات بدلتی ہے نہ صفت، اُن کی ذات بھی انعام ہوتی ہے اور صفت بھی انعام۔ تغیّر نہ وہاں ہو سکتا ہے نہ یہاں۔ وہ تو پھول سے لطیف اور شمع سے زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ معصیت کی ظلمت ان کے قریب نہیں پھٹک سکتی، معصومیت ہی ان کا امتیازی نشان ہوتی ہے

شاعری کا آئینہ

فتحِ مکّہ کے بعد قبائل عرب کے وفود بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہونے لگے عربوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قریش کا اقتدار تھا یہ دیوار اُٹھ گئی تو اُن کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ قبیلہ تمیم کا وفد آیا تو اُس نے غایت درجہ بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ بارگاہِ قدس کے سامنے کھڑے ہو کر عامیانہ انداز میں حضورؐ کو پکارنا شروع کر دیا۔ اُن کی یہ پکار رب کو پسند نہ آئی اور انہیں وحی کے ذریعے زجر و توبیخ کی گئی کہ یہ کیا گستاخانہ انداز ہے؟ انہیں بے وقوف کہا گیا حالانکہ ان میں ذہانت و فطانت کی کمی نہ تھی اور علم و فضل کے ادّعا ہی نے انہیں رسالت سے مقابلے پہ آمادہ کیا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ فخر و مباہات کی باتوں میں ہم سے مقابلہ کرو۔ اُن کا مقررِ اُن کے مفاخر بیان کر چکا تو ثابت بن قیسؓ نے اُس کا جواب دیا۔ پھر اُن کا شاعر کھڑا ہوا جو فصاحت و بلاغت کے جوہر

دکھا رہا تھا۔ اُس کے دل کا غبار ہلکا ہوا تو حسّان بن ثابتؓ اشارۂ نبوی پاتے ہیں کھڑے ہو گئے یہ برجستہ شاعری کر رہے تھے۔ اسی زمین، اسی قافیے، اسی ردیف اور اسی بحر میں اُن کے افکار ڈھل کر محفل میں سحر پھونک رہے تھے۔

زبان اُن کی تھی اور بیان روح الامین کا۔ شعر اُن کے تھے اور تاثیر رب تعالیٰ کی۔ شاعری کا آئینہ اُن کا اپنا تھا اور حُسن، اُس حسین کا جو دستِ قدرت کا شاہکار ہے۔ حسانؓ بول رہے تھے اور تمیم سُن رہے تھے۔

فن کو معراج اُس وقت ملتی ہے جب وہ محبوب کے کام آئے۔ حسّان کا فن محبوبؐ کے کام آ گیا فن تو دراصل محبوب کے دل تک رسائی ..... حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ مقصد پورا ہو گیا تو فن کار کامیاب ہے۔

علم اور معلوم

علم کا مطلب ہے جان لینا اور جان لینے کے بعد منزل معلومہ کے لئے جدوجہد ہوتی ہے منزل کا حصول انسانی جدوجہد کا نتیجہ کہلاتا ہے انسان اپنی ذہنی و فکری صلاحیتوں کے باوجود ابھی تک کوئی ایسا علم دریافت نہیں کر سکا جس کا جان لینا ہی کافی ہو جان لینے ہی سے منزل ہاتھ آ جائے اور انسان کو جدّوجہد نہ کرنی پڑے۔

جدّوجہد جان لینے کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے اس کے بغیر منزل ہاتھ نہیں آتی۔ خواہ منزل کسی بھی نوعیت کی ہو اور کسی بھی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والی ہو۔

دین کے علم کی حیثیت بھی یہی ہے۔ یہاں بھی پہلے جانا جاتا ہے اور پھر سفر کا آغاز ہوتا ہے انبیاء علیہم السّلام نے بھی پہلے ربّانی احکام کی تعلیم دی اور پھر عمل کو ضروری قرار دیا۔ تعلیم کے بعد تربیت بھی دی، یہی وجہ ہے کہ نبوّت کے فیض یافتہ انسانوں کی زندگیاں ہماری زندگی کی نسبت خطرات سے زیادہ محفوظ تھیں کیونکہ انھوں نے حضورؐ سے تعلیم بھی پائی اور نبوّت کے زیرِ سایہ رہ کر

تربیت بھی حاصل کی۔

کسی چیز کے علم کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، کبھی خبر سے حاصل ہوتا ہے۔ کبھی نقوشِ رہگذر منزل کا سراغ دیتے ہیں اور کبھی براہِ راست احساس پر وارد ہو کر منزل کا غماز بن جاتا ہے۔

تیر انداز کبھی شکار کی خبر سُن کر بڑھتا ہے۔ کبھی شکار کے نقوشِ پا غمازی کرتے ہیں
اور کبھی بوئے نافۂ غزال کی خبر دیتی ہے۔ علم اپنی جگہ سارے درست اور بجا ہیں۔
خبر بھی درست ہو سکتی ہے۔ نقوشِ پا بھی صحیح ہو سکتے ہیں۔ لیکن جہاں نقوشِ پا کو
تند و تیز ہواؤں نے محو کر دیا ہو یا گرد و غبار پڑ جانے کے باعث وہ مدھم پڑ گئے
ہوں، وہاں بوئے نافہ کام دیتی ہے بُو لطیف ہے اور لطافت کو کثافت مجروح
نہیں کر سکتی۔

صحابہؓ کی ایک جماعت وہ تھی جو بوئے نبوّت سونگھ کر چمنستانِ نبوّت میں آئی اور بعض کو مشاہدۂ نبوّت کے بعد علم حاصل ہوا۔ صحابہؓ کا علم کتابی نہ تھا بلکہ مشاہدۂ نبوّت کا منت پذیر تھا۔ مشاہدے میں غلطی نہیں ہوتی، لذّت اور سرور ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کی رُوحیں مست و سرشار تھیں۔ صحابہؓ کو زیادہ تزکیۂ نفس کی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ جمالِ نبوّت کے دیکھ لینے ہی سے اُن کی روحوں میں بالیدگی پیدا ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُمّت کے بعد میں آنے والے بزرگوں کی زندگیوں میں جس طرح کے مجاہدات کا سراغ ملتا ہے اس سے صحابہؓ کی زندگیاں خالی تھیں، اُن میں مجاہدے کی نسبت مشاہدہ زیادہ تھا اور ان کا مجاہدہ بھی مشاہدے کا فیضان اور نتیجہ تھا۔ اسی لئے بدر و حنین کے میدانوں میں رزم آرا ہوتے وقت ان پر تکلیف کے احساس کی نسبت لذّات کا زیادہ غلبہ ہوتا تھا اور یہ لذّت کی فراوانی انہیں مصیبت کا احساس نہ ہونے دیتی تھی، جو علم معلوم تک نہ پہنچائے جو جادہ منزل تک لے جانے کا باعث نہ بنے وہ کس کام کا؟ بلکہ وہ تو ترا در دِ سر بن جاتا ہے۔ قیل و قال ہی سے جس انسان کو فرصت نہیں ہوتی وہ منزل کا حُسن کیا دیکھ سکے گا؛ منزل کا حُسن تو مقربین کے لئے ہوتا ہے اجو خبر پاتے ہی منزل کے حصول

کے لئے تگ و دو شروع کر دیتے ہیں۔ منزل کی طلب سے خالی علم مشاہدے کی لذتیں نہیں بخش سکتا اور نِرا علم منزل شناس نہیں بنا سکتا۔ منزل شناسی منزل کے حصول کے بعد لذتیں عطا کرتی ہے۔ اسی لئے ایمان اور عمل کو لازمی قرار دیا گیا ہے

علّت العلل

ہدایت، دلائل و براہین پہ موقوف نہیں۔ دلائل و براہین کا تعلّق علم سے ہوتا ہے اور ذہانت ہادی نہیں۔ ہادی رب تعالیٰ کی ذات ہے۔ سعادتِ ازلی رہنما ہو تو ہر ذرۂ ممکنات ہادی بن جاتا ہے۔ ہدایت کا سراغ بخشتا ہے۔ منزل کے حسن و جمال کو آشکارا کرتا ہے۔ ورنہ منزل کے آثار و نقوش بھی منزل کا راستہ نہیں دکھاتے بلکہ اُلٹا گمراہ کر دیتے ہیں۔ نِرا علم ہادی ہوتا تو انبیاء کی بعثت کی ضرورت نہ تھی۔ علم وہی ہدایت ہے جو انبیاء کی وساطت سے پہنچا ہے۔ ابلیس کا علم بلا واسطہ تھا۔ اور اس نے انبیاء علیہم السّلام سے تربیت حاصل نہ کی تھی۔ اسی لئے اُس کا علم ہادی نہ تھا۔ جو دلائل ابلیس نے انکارِ سجدہ کے وقت اپنے رب کے سامنے پیش کئے وہ حجّت و برہان کی دنیا میں خواہ کتنے بھی وقیع اور جاندار کیوں نہ ہوں۔ اطاعت و جاں نثاری اور رضایت کی دنیا میں اُن کی کوئی حیثیت نہیں۔ آگ کو افضل کہنے والا مردود اخاک کی انکساری کو بھول گیا۔ ناری کو آدم علیہ السّلام کے قالب میں جھلملانے والے نور کی حقیقت معلوم نہ ہو سکی۔ فرشتے خود نور تھے۔ اس لئے انہوں نے نور کو دیکھ لیا۔ آدم علیہ السّلام کے قالب پہ نظر پڑنے کی بجائے اُن کی نظر اُس نور پہ پڑی جسے خلّاقِ عالم اور آفرینندۂ روزگار نے اپنی روح سے تعبیر کیا تھا۔ ابلیس معلم الملکوت تھا۔ فرشتوں کا استاد سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اُس کے علم کے غرّہ نے اُس کی نگاہوں سے ایک عظیم حقیقت کو مستور کر دیا۔ حقیقت بینی، حقیقت آشنائی اور حق آگاہی دلائل و براہین کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ خالصتاً افضالِ ربّانی ہے۔ ہدایت علم کے سپرد کر دی جاتی۔ اُسی کو حق آگاہی کی علّت العلل قرار دے دیا جاتا تو انسان کی نظریں اپنے رب کے لطف و کرم سے ہٹ

جاتیں۔ رب تعالیٰ کو یہ گوارا نہ تھا کہ بندہ مجھ سے تقرب پیدا کرے مجھ سے غافل ہو جائے۔ اسی لئے علم کو ذریعہ تو کہا لیکن حق آگاہی کی علت قرار نہیں دیا۔ علتِ ہدایت رب تعالیٰ ہے اور رب تعالیٰ کا فضل و کرم۔

نصب العین

بعض لوگ جو شعبدہ بازی کے فن میں مہارت رکھتے ہیں خدا تعالیٰ کی مخلوق کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن ان کی یہ کامیابی دائمی نہیں ہوتی انجام کار انہیں ہزیمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ جس طرح ابھرتے ہیں اسی طرح مٹ جاتے ہیں۔ دوام صرف اللہ کے نام کو ہے اور اس کی راہ میں چمکنے والی روشنی ہی زندہ رہنے والی چیز ہے۔ یہ نور کبھی مٹ نہیں سکتا۔ ذوالحمار عنسی نے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ ہی میں دعویٰ نبوت کر کے اپنے گرد انسانوں کو جمع کر لیا تھا۔

عنسی، قبیلہ مذحج کا فرد تھا اور اسے شعبدہ بازی کے فن میں یکتائی حاصل تھی۔ لیکن معاذ بن جبلؓ جو اس وقت یمن کے گورنر تھے فرمانِ نبوت کے مطابق اُٹھے تو عنسی کا فن ہوس کے کام نہ آیا اور اسلام کے ایک غازی فیروز دیلمیؓ نے اس کا کام تمام کر دیا۔ حضورؐ کو وحی کے ذریعے عنسی کی ہلاکت کی اطلاع دے دی گئی۔

مسیلمہ کذاب کی شاطرانہ چالوں نے بھی بنی حنیفہ کے قبیلے میں اسے شہرت بخش دی۔ وہ اپنی قوت پہ یہاں تک اترنے لگا کہ اُس نے حضورؐ کو ایک گستاخانہ خط لکھ دیا لیکن انجام کار خالدؓ کی کمان میں لڑنے والے وحشیؓ نامی ایک مجاہد کے ہاتھوں مارا گیا۔ حضور علیہ السلام کی حیات ہی میں طلیحہ اسدی نے بھی دعوئ نبوت کیا تھا جو دورِ صدیقی میں خالد بن ولیدؓ سے شکست کھا کر بھاگا اور پھر مسلمان ہو گیا۔

نبوت کے یہ تینوں مدعی کم ذہن، طماع اور ہوشیار نہ تھے لیکن انہوں نے خدا کی دی ہوئی ذہانت

وفطانت کو گمراہی پھیلانے میں صرف کیا۔ اسلام کے جبغازی ان لوگوں کے استیصال کے لئے
اُٹھے تھے ان کی نگاہوں میں ان کی ذہانت اور قوت کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ بلکہ ان کی نظر اسلام کے
اُس نور پر تھی جس کے ساتھ ان کی وفاداریاں غیر مشروط تھیں جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھا اور
جس کی حفاظت ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔

فرعون اور ابوجہل

اپنی زندگی کے اوائل میں جب موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محل میں زندگی کے دن گزار رہے
تھے تو ان کا اندازِ نظر مطلقاً جداگانہ تھا۔ فسق و فجور کا ماحول ان کی طبیعت پر اثر انداز نہ ہو سکا۔
یہی وجہ ہے کہ جب وہ نبی بنا کر فرعون کی طرف بھیجے گئے تو فرعون ان کے متعلق کوئی ایسی
بات نہ کہہ سکا جو ایک ہادی، رہبر، نبیؑ اور مرسلؑ کی شان کے منافی ہو سکتی ہے۔ ان کا بچپن اور
جوانی فرعون کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ محل میں وہ خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے مقیم تھے
ان کی زندگی کا کوئی گوشہ فرعون کی نگاہوں سے مستور نہ تھا۔ کوئی بھی لغزش ہوتی تو فرعون بحث و
تمحیص کے وقت اس کی نشان دہی ضرور کرتا۔
اس نے موسیٰ علیہ السلام سے ربّانی پیغام سن کر جو کچھ بھی کہا وہ قرآن میں مذکور ہے لیکن ان کے
سیرت و اخلاق کو عیب دار بنانے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی جھوٹا الزام نہیں لگایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ
ان کا ماضی میری ہی نظروں کے سامنے نہیں درباری اور دربار سے تمام وابستہ افراد ان کے اخلاق
و اعمال کی بلندی اور قلب و نگاہ کی پاکیزگی سے واقف ہیں ان پر جھوٹی بات کہنے سے کوئی اثر نہیں
پڑ سکتا۔ فرعون کی الزام تراشیوں سے باز رہنے کا باعث خواہ یہ جذبہ ہو کہ اس طرح میری بات بے وزن
ہو جائے گی۔ یا یہ احساس کہ دعوئ خدائی کے ساتھ مجھے الزام تراشی زیب نہیں دیتی۔ بہرحال اس نے
اس ضمن میں کچھ نہیں کہا جو اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ نبی کی قبلِ نبوّت کی زندگی بھی ایسی پاک صاف
اور منزّہ ہوتی ہے کہ فرعون کو بھی لب کشائی کی جسارت نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہی معاملہ ابوجہل کا ہے

وہ بھی حضور کا بدترین دشمن ہوتے کے باوجود کوئی ناشائستہ بات زبان پر نہ لا سکا۔

وحی اور نبی

کسی حقیقت کو معلوم کرنے کے تین ذریعے ہو سکتے ہیں۔ حس، عقل اور مشاہدہ۔

حس کے ذریعے ہم محسوس کرتے ہیں۔ عقل سے معروف مقدمات کو ترتیب دے کر مجہولات تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اور مشاہدہ، غیب کو حضور بنا دیتا ہے لیکن ان تینوں ذرائع سے حاصل کیا ہوا علم ضروری نہیں کہ درست ہو۔

حس، عقل اور مشاہدے۔ تینوں میں تفاوت ہے نظر بعض اوقات پوری رفتار سے چلنے والی چیز کو ساکن جانتی ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہوتی۔ حرکت موجود ہوتی ہے لیکن نظر اس کی حقیقت معلوم کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ ہمارے بدن کے بال اور ناخون ہر آن بڑھتے ہیں لیکن ان کی رفتار دیکھی نہیں جا سکتی۔ عقل، نتائج اخذ کر کے بتاتی ہے کہ یہ ساکن نہیں متحرک ہیں۔ محسوسات کی دنیا بھی بعض اوقات ساتھ نہیں دیتی۔ ہمارے احساسات کا فتویٰ کچھ اور ہوتا ہے اور حقائق اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ غرض معلومات کے ان تینوں ذرائع کا تعلق محسوسات کی اسی دنیا سے ہے جو جہانِ آب و گِل کہلاتی ہے۔ ماورائے آب و گِل جو جہان ہیں اُن کے متعلق ان کا فراہم کردہ علم کیسے یقینی ہو سکتا ہے؟ جب کہ یہ اپنے ہی جہان میں یقینی علم عطا کرنے سے قاصر ہیں۔

وحیِ ربّانی کا تعلق ایک اور جہان سے ہے جہاں سے یہ نبیؐ کے قلب پر نازل ہوتی ہے۔ وحی کوئی عقلی چیز نہیں۔ جسے عقل پا سکے احساسات و مدرکات اس کی کنہ و حقیقت کے ادراک سے قاصر ہیں۔ یہ صرف نبیؐ ہی کا احساس ہوتا ہے جو اسے پا لیتا ہے۔ حکیم اور فلسفی کا ادراک یہاں عاجز ہے۔ اس لئے کہ ان کا علم قیاسی اور ظنی ہوتا ہے۔ اور نبیؐ کا علم، وحیِ ربّانی کا نتیجہ، قیاس و گمان کی بھی اگر وحی کی دنیا تک رسائی ممکن ہوتی تو انبیاءؑ کے نزول کی ضرورت نہ تھی۔ عقل خود ہی پا لیتی اور خود ہی سمجھ جاتی۔

انبیاؑ کے واقعات

انبیاء علیہم السلام کی زندگی کے واقعات سے قرآن حکیم معمور ہے اور یہ واقعات انبیاء کے ظاہری اور باطنی احساسات سے تعلق رکھتے ہیں بعض کا تعلق اُن کے ظاہر سے ہوتا ہے اور بعض کا باطن سے، بعض انفرادی کیفیت کے حامل ہوتے ہیں اور بعض کا تعلق ان کی اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے۔ جو اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ نبیؑ کی زندگی خواہ اجتماعی ہو یا انفرادی، ظاہری حالت ہو یا اندرونی کیفیت، کوئی بھی بے فائدہ نہیں۔ ان احوال و کیفیات، اور انفرادی و اجتماعی حالات کو بلاسبب بیان نہیں کیا گیا۔ ہر واقعہ، ہر کیفیت اور ہر جذبہ نوعِ انسانی کے لئے مفید ہے اور اپنے اندر بصیرتوں کے ایسے سامان رکھتا ہے، جو انسان کی حق آگاہی، منزل رسی وفائزالمرامی کے لئے ناگزیر ہیں۔

جو چیز انبیاؑ کے واقعات میں مشترک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے ان واقعات کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ یہ کہاں ظہور پذیر ہوئے اور ان کے ظہور پذیر ہونے کا وقت کونسا تھا؛ نہ سنہ و تاریخ کا ذکر ہے نہ محلّ وقوع کا، جس کے یہ معنی ہیں کہ انبیاؑ کے حالات و واقعات زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہیں۔ یہ کسی وقت، زمانے اور جگہ کے ساتھ مخصوص نہیں ان سے ہر جگہ اور ہر زمانے میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی عہد اور کسی زمانے کی قوم ہو۔ قرآن اُس کے لئے ہدایتوں کے سامان مہیّا کرتا ہے۔

انبیاؑ کے واقعات صرف زیبِ داستان کے لئے نہیں دہرائے گئے اور نہ ان سے لذّت اندوزی مقصود ہے۔ یہ درسِ حکمت ہیں۔ پیامِ بصیرت ہیں۔ یہ نہ زمان کی گرفت میں آسکتے ہیں اور نہ انہیں مکان محدود کر سکتا ہے۔ جغرافیائی حدود و قیود تو انسانی افکار و خیالات کے لئے ہوتے ہیں۔ جو واقعہ کلامِ ربانی کی صورت اختیار کرلے وہ محدود کہاں ہو سکتا ہے۔

زبان و قلم

تاریخ ہمیں دو طرز کے انسانوں سے باخبر کرتی ہے۔ ایک وہ جن کے زندگی افروز کارناموں سے تاریخ کے اوراق جگمگا رہے ہیں۔ جو ملّت کے خیر خواہ اور اسلام کے حامی و ناصر تھے۔ اُن کا ہر قدم دوسروں کے لئے نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور ایک گروہ کی ساری زندگی باطل کو فروغ دینے میں گزری ہے ایسے لوگوں کے پیشِ نظر انسانیت کی بہبود نہ تھی بلکہ اُن کا سارا وقت اغراضِ نفسانیہ کی تکمیل اور عشرت کوشیوں میں گذرا ہے۔ حق سے انہیں بیر تھا اور باطل کا فروغ وارتقاء ہی ان کا مطمحِ نظر رہا ہے۔ سلطان تغلق کا بھی ایسے ہی گم کردہ راہ انسان سے تعلق تھا۔ اپنے عہد کے مشاہیر علماء و صلحا کو نیست و نابود کر دینے کے بعد جب اُس کی توجہ حضرت قطب الدین ہانسویؒ کی طرف مبذول ہوئی تو اُن لوگوں کو بڑا دکھ ہوا جو اُن کی ذات کو ظلمتوں میں روشنی پھیلانے والے بدرِ منیر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ لیکن شیخؒ، تغلق اور اس کے اعوان و انصار کی ریشہ دوانیوں سے خائف نہ تھے۔ اُن کی نظر اپنے رب کی رحمت پر تھی۔ حضرت قطب الدین منور، شیخ الاسلام حضرت فریدالدین گنجِ شکرؒ کے خلیفۂ اعظم حضرت جمال الدین ہانسویؒ کے پوتے اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مقتدر اور محبوب خلیفہ تھے۔ حضرت نظام الدینؒ نے انہیں اسلام کی نشر و اشاعت پر مامور کیا تھا اور یہی تبلیغِ حق اُن کا سب سے بڑا جرم سمجھی جا رہی تھی۔ کئی دیہات اُن کے نام کر دینے کا حکم نامہ لکھ کر ان کے پاس بھیجا گیا۔ تاکہ انہیں اس جھنجھٹ میں ڈال کر گوناگوں مشکلات میں مبتلا کر دیا جائے۔ اور وہ اُس مقصد سے غافل ہو جائیں جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھا۔ لیکن شیخ نے حکمنامہ دیکھ کر فرمایا کہ میرے اسلاف نے یہ راہ اختیار نہیں کی۔ میرا مقصدِ حیات خدا تعالیٰ کے مقدس دین کی نشر و اشاعت ہے۔ جس کی راہ میں گذرنے والی ساعتیں مجھے اُس تعیّش کی زندگی سے زیادہ عزیز ہیں۔ جس کا مصرف حظِ نفس کے سوا کچھ نہ ہو۔ اس طرح یہ داعئ حق باطل کی اُس سازش سے محفوظ رہا۔ جو اسے پھانسنے کے لئے

کی گئی تھی۔

حضرت قطب الدّین منوّر اور سلطان تغلق کی ملاقات اس وقت ہوئی جب سلطان نے قلعۂ ہانسی کی دیکھ بھال کے لئے سفر اختیار کیا۔ دونوں میں ستیزہ کاری کا سلسلہ مدتوں سے جاری تھا۔ ایک حق کا نمائندہ تھا اور ایک باطل کا۔ ایک کے پاس مادی قوّت تھی اور ایک کے پاس روحانی۔ ایک کا بھروسہ ساز و سامان پر تھا۔ اور ایک کا خدا تعالیٰ کی ذات پر۔ شیخؒ کے ملفوظات، تغلق کی عیش پرستانہ زندگی کی نفی کر رہے تھے۔ وہ جن افکار کو پھیلا رہے تھے۔ اُن میں سرمدی نور کی لمعانیاں تھیں۔ اُن کا عمل باطل سوز تھا۔ بدیقینی اور بے ایمانی کی فضا میں ایمان و ایقان کی مشعلیں فروزاں کر دینا بھی جہاد ہے۔ جو سینے ایمان کی حرارت سے محروم ہو گئے ہوں اُن میں لگن پیدا کر دینا انہیں سوز آشنا بنا دینا، روح کو نئی زندگی بخشنا، دل کو تڑپ عطا کرنا اور فکر کو جلا بخش دینا، یہ سب جہاد کی قبیل کی چیزیں ہیں۔ کیونکہ جہاد زبان و قلم اور تلوار پر مشتمل حقیقت کا نام ہے۔ جو جس محاذ پر ہوگا اجر پائے گا۔ شیخ قطب الدّینؒ، تغلق کے عہد میں فکری محاذ پر صف آرا تھے۔ وہ حق کہہ رہے تھے۔ حق پھیلا رہے تھے۔ اور حق ہی اُن کا مقصودِ حیات تھا۔ اسی حق گوئی و حق پرستی کے جرم میں اُن کے بہت سے ساتھی اُن سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ چکے تھے۔ ان کا خونِ ناحق ابھی تک ان کی نظروں میں تھا لیکن ساتھیوں کی مفارقت، ان کا بہیمانہ قتل اور اُن کے انجام کی ہولناکیوں نے انہیں افسردہ خاطر اور کم ہمّت بنانے کی بجائے اُن کے دلوں کو اور قوّت بخشی۔ اور وہ پورے عزم سے اسلام کا نور پھیلانے لگے۔ لیکن تغلق کے ہانسی آ جانے کے بعد اُن کے ابتلا و امتحان کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ جو آخرکار اُن کی عظمتوں کا آئینہ بن گیا۔

یہ تو خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ تغلق کا یہ سفر کس لئے تھا، وہ محض قلعہ کی دیکھ بھال کے لئے آیا تھا یا اِس فکری محاذ کو توڑنا چاہتا تھا۔ جو شیخ قطب الدّینؒ منوّر کی زیرِ نگرانی ہانسی میں قائم تھا۔ بہرحال تغلق نے بنسی کے مقام پر ہانسی سے آٹھ میل دور قیام کیا اور نظام الملک کو

قلعہ کی صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ یہیں شیخ کا قیام تھا۔ اس نے شیخ کے دروازے پر پہنچ کر اُن کے گھر اور اُن کی ذات کے متعلق گریہ شروع کر دی اور جذباتی انداز میں واویلا شروع کر دیا کہ اس وقت سلطان ہانسی کے دروازے پر مقیم ہے اور اس شخص کو اتنی توفیق نصیب نہیں ہو سکی کہ وہ آگے بڑھ کر استقبال ہی کر سکے۔

شیخ نے اس غوغا آرائی کو مطلقاً قابلِ التفات نہ سمجھا۔ وہ نظام الملک کے مقاصد کو جانتے تھے اور اس وقت تک وہ شیخ کے احباب و انصار اُن کے ہم فکر، ہم مشرب اور ہم خیال علماء و صوفیاء کو جس بے دردی سے قتل کر چکا تھا۔ اُسے بھی وہ بھولے نہ تھے شیخ سے یہ امر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ قلعہ کی دیکھ بھال کے نام پر بنفسِ نفیس نظام الملک کا آنا اور دروازے پر کھڑا ہو کر اشتعال انگیزی کرنا بلا وجہ نہیں۔ وہ پیش آنے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے رب سے صبر و استقامت کی توفیق طلب کرنے لگے۔ کچھ مدت بعد جب وہ تغلق کے بھیجے ہوئے آدمی کے ساتھ تغلق کے پاس جا رہے تھے تو انہوں نے اپنے دادا حضرت جمال الدینؒ ہانسوی کے روضے پر پہنچ کر دعا مانگی۔ جس میں یہ بھی مذکور تھا کہ میں بہ امر مجبوری تغلق کے پاس جا رہا ہوں۔ ممکن ہے زندہ نہ لوٹ سکوں اور آئندہ اپنے اُن بزرگوں کے مزارات پر پہنچ کر فاتحہ خوانی نہ کر سکوں۔ جنہوں نے مجھے باطل سے ٹکرانے کا عزم اور حوصلہ عطا کیا ہے۔ شیخ نے اپنے گھر والوں کے لئے بھی دعا کی۔ جن کے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ نہ تھا۔ وہ ابھی جمال الدینؒ ہانسوی کے روضے سے نکل کر باہر آئے ہی تھے کہ ایک اجنبی نے آگے بڑھ کر پچاس ٹکے پیش کر دیئے۔ شیخ نے اسے اپنے گھر کا پتہ دے کر فرمایا۔ یہ وہاں پہنچا دو۔

شیخ اس تائیدِ ربانی سے سمجھ رہے تھے کہ نصرتِ خداوندی اُن کے ساتھ ہے۔ سلطان تغلق کی دنیا بے شک عیش و عشرت کی دنیا تھی۔ لیکن اس کی درگاہ سے وابستہ لوگوں میں ایسے افراد بھی موجود تھے جو طبعاً شریف اور فطرتاً نیک تھے۔ وہ شیخ قطب الدینؒ کی دینی خدمات سے واقف تھے شیخ کے مقاصدِ حیات کو

متعلق کبھی انہیں کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شیخؒ کو دربار میں پیش کرنے کا حکم دیا گیا تو انہیں لانے کی ندامت حسن سر برہنہ نے اپنے ذمہ لے لی۔ تاکہ شیخ کو راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ راہ میں اُس نے سواری کے لئے گھوڑا پیش کیا۔ لیکن شیخؒ نے یہ کہہ کر یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ کہ ابھی جسم میں اتنی سکت موجود ہے کہ میں خدا کی راہ میں چل سکوں۔

حسن سر برہنہ نے تغلق سے مل کر اُن غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جس میں تغلق مبتلا تھا لیکن اِس سعی و کوشش کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا ہوا بولا اسے جلدی میرے پاس لاؤ۔

اِس مدت میں شیخؒ کی بارہا نائب سلطان فیروز شاہ سے ملاقات ہو چکی تھی۔ جس نے شیخؒ کو تغلق کے غیظ و غضب سے آگاہ کر کے انہیں مفید مشورے دیئے۔ چنانچہ شیخؒ جب تغلق سے ملنے گئے تو وہ آپ کو دیکھتے ہی قہر و غضب کے عالم میں کھڑا ہو گیا اور کمان میں تیر رکھ کر مارنا ہی چاہتا تھا کہ ہیبتِ حق نے اسے مغلوب کر دیا۔

شیخؒ نے السلام علیکم کہہ کر تغلق کا ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ اب دونوں کے درمیان باتیں ہو رہی تھیں اور یہ باتیں خلوص و محبت کے جذبات کی آئینہ دار تھیں تغلق کی ذات میں یہ آناً فاناً انقلاب کرشمۂ قدرت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اللہ کریم نے اپنے بندے کو محفوظ رکھنا تھا تو تغلق کا دِل بدل دیا۔

مقبول ساعتیں

انسان کی زندگی اور موت، افکار و خیالات اور جذبات و احساسات جب رضا کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں تو اُسے عبودیتِ کاملہ کا منصب نصیب ہوتا ہے زندگی کا مزا عبودیت کی تکمیل میں ہے نفس کی بندگی میں نہیں۔ نفس کی بندگی میں اضطراب کے سوا کچھ نہیں تھا اور عبودیت کا احساس اضطراب کو قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔ عبودیت میں جو اضطراب ہوتا ہے وہ رضا کی دولت کو سمیٹنے

کے لئے دامن دراز کرتا ہے۔ اسی لئے رحمت کہلاتا ہے۔ بندگی کے اضطراب کو نفسانی خواہشات سے پیدا ہونے والے اضطراب پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ایک عذاب ہے اور ایک ثواب دونوں کی کیفیتیں جداگانہ ہیں۔ ایک پروردگار کی عطا کہلاتی ہے نیکی کے حصول کے لئے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ توفیق ربانی کی کرشمہ سازی کہلاتے ہیں بدی کے لئے پیدا ہونے والے جذبات نفس و شیطان کی بندگی کا نتیجہ ہوتے ہیں یہ بدوں ہی کو ملتے ہیں اُن کی شقاوت میں اضافے کا موجب بن جاتے ہیں اور نیک جذبات نیکی کے خالق بھی بنتے ہیں نیکی کی پرورش بھی کرتے ہیں اور نیکی کے ثمرات سے آشنا بھی کر دیتے ہیں یہ افکار و خیالات کو بھی پاکیزگی عطا کرتے ہیں اور اعمال کا حُسن بھی اُن کی پاکیزگی کا ثمر کہلاتا ہے۔

بندے پر جب خدا کا کرم ہوتا ہے تو اُسے نیکی کی توفیق ملتی ہے۔ توفیق انعام ہے اور انعام مقربین کو ملتا ہے توفیق مل گئی تو سمجھئے قرب مل گیا کیونکہ توفیق بلاوا ہے سندیسہ ہے پیغام ہے اور پیغام بھیجنے کے بعد کوئی کریم رد نہیں کرتا بلکہ دروازہ کھولتا ہے انتظار کرتا ہے تاکہ نوازے۔ اطاعت کا صلہ دے۔ محبت کا ثمر جھولی میں ڈالے۔ توفیق سے محروم انسان نیکی کی راہ پر نہیں آ سکتے۔ خواہ اُن پر پند و موعظت کے دفتر ہی کیوں نہ کھول دیئے جائیں۔ توفیق تو حصہ ہی طالبین کا ہے۔ جو جس مال کا گاہک ہی نہ ہو، وہ اُس کی جھولی میں کیسے آ سکتا ہے؟ اور خدا تو بڑا غیور ہے۔ وہ غیرت و حمیت کا پیدا کرنے والا ہے وہ بن مانگے توفیق کی دولت کیسے دے سکتا ہے۔

ہاں توفیق کی طلب سے سینہ معمور ہو تو وہ محروم بھی نہیں کرتا۔ محروم کر دینے کی نسبت اُسے نوازنے میں زیادہ مزا آتا ہے۔ محروم انسان کی جھولی جب عطیات سے بھر جاتی ہے تو یہی نہیں کہ محروم خوش و خرم نظر آنے لگتا ہے بلکہ منعم کا دل بھی مسرتوں سے لبریز ہو جاتا ہے کہ گدا نے اپنی مراد پالی۔ وہ محروم نہیں لوٹا جگہ جگہ ہماری نعمتوں کا ذکر کر کے ہماری عظمتوں میں اضافے کا موجب بنے گا۔ دوسرے محروم انسانوں کو بھی ہماری بارگاہ کا پتہ بتلائے گا۔

ہر کریم ذات کو عطا کے بعد جو مسرت نصیب ہوتی ہے وہ اُس مسرت سے کہیں زیادہ اور فزوں ہوتی ہے جو نعمت پا لینے کے بعد گدا کے حصے میں آتی ہے۔ گدا اور سخی کا ایک ازلی رشتہ ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ گدا ہی سخی کی بارگاہ کا رُخ نہ کرے۔ اُسے اعانت کے لیے نہ پکارے بلکہ اُس سے اغماض برتے تو یہ اس کی شقاوت کی علامت ہو گی اور انعام شقیوں کا حصہ نہیں ہوتے انعام کے لیے تو شکستگی ضروری ہے شکستگی خواہ حال کی ہو یا قال کی، رائیگاں نہیں جاتی۔ سخی کے جذبۂ رحم و کرم کو متحرک کر کے رہتی ہے بسا اوقات شکستگی بھی رحمت بن جاتی ہے۔ جو رحمت کو پکارنے لگے۔ رحمت کی امیدوار بن کر رحمت کی راہ میں کھڑی ہو جائے گر جائے ایسی شکستگی کو سہارا دینے کے لیے رحمت کے ہاتھ اُٹھنے لگتے ہیں۔ وہ لپکتی ہے۔ بڑھتی ہے۔ اور آغوش میں لے لیتی ہے۔ آغوش شکستہ حال کا حصہ ہے۔۔ بشرطیکہ وہ رحمت سے وُور نہ ہو رحمت سے بے نیاز بن جائے۔ رحمت سے بے نیازی ایسا عذاب ہے جس کا کوئی مداوا نہیں اور رحمت کے سامنے اپنی بے چارگی کا اظہار ایسی نعمت ہے جس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا، بے چارگی کے اظہار کے لیے جب لب کھلنے لگیں اور سامنے کریم ذات ہو تو یہ مقبولیت کی ساعتیں ہوتی ہیں۔

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بے چارگی کا اظہار کریم کو پسند آ جاتا ہے اور وہ اُس کے سُننے میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ لذت بھی گدا کے حق میں نعمت ہوتی ہے۔ کریم سننا چاہے تو گدا سلسلۂ کلام بند نہیں کرتا۔ طوالت سے گھبراتا نہیں بلکہ سلسلۂ کلام کو اور وسعت دیتا ہے اور طویل کرتا ہے اور اس طوالت کو اپنے حق میں نعمت جانتا ہے۔ کریم کی توجہ بذاتِ خود نعمت ہے وہی گدا کی کیفیتوں کو بیدار کرتی ہے۔ انہیں نیا حُسن عطا کرتی ہے۔ کریم متوجہ نہ ہو تو گدا کا بیان پھیکا رہتا ہے۔ بے سوز کہلاتا ہے اور بے سوز صدا سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

توبہ و استغفار

عاصی گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور عارف عبادت سے استغفار۔ عارفین کا استغفار گناہ کی

علامت نہیں ہوتا بلکہ اُن کے قرب کا غماز ہوتا ہے۔ قرب کے بڑھ جانے کے باعث بھی استغفار بڑھ جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام دِن میں ستّر بار استغفار فرماتے تھے۔ یہ استغفار حق آگاہی اور معرفت شناسی کا نتیجہ تھا۔ دِن میں جُوں جُوں عرفان بڑھتا جاتا تھا استغفار میں زیادتی ہوتی جاتی تھی کیوں کہ حضورؐ کی ہر ثانیہ ساعت اولیٰ سے افضل تھی پے بہ پے عرفان میں اضافہ ہو رہا تھا اور استغفار بھی اِسی نسبت سے تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی دیدار سے فیض یاب ہونے کے بعد توبہ کی تھی۔ یہ توبہ کس چیز سے تھی؟ نبیؑ کی دنیا میں گناہ کا گذر کہاں! اور یہ تو کوہِ طور تھا جلوؤں کا مقام، تجلیات کی جگہ، انوار کا عالم، جمال کا آئینہ، حسن کا پرتو، عشق کا محور، شوق کا قبلہ، ذوق کا کعبہ، یہاں توبہ کیسی؟ یہ تو تڑپنے اور لوٹنے کی جا تھی۔ ہر لمحہ اسی سرشاری اور مستی میں بسر ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن کلیم اللہ نے توبہ کی گناہ سے نہیں۔ رویت سے اور یہ صفت کی رویت تھی۔ اب وہ صفت سے ذات کی طرف مُتوجّہ ہو چکے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کی توبہ ایک بار تھی اور حضورؐ کی دن میں ستّر بار، اپنے عرفان کی نسبت سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم توبہ فرمارہے تھے۔ عارفین رحمتہ اللہ علیہ کو بھی اِس نعمت سے حصتہ ملا ہے وہ بھی بکثرت توبہ کرتے ہیں۔ عرفان کی ایک، منزل سے دوسری منزل میں داخل ہوتے ہیں تو پچھلے عرفان سے توبہ کرتے ہیں کروہ شایانِ شان نہ تھا۔

غریقِ انوار

کسی ذات کے محبوب بن جانے کے بعد ذات ہی محبوب نہیں رہتی، صفات بھی محبوب نظر آنے لگتی ہیں۔ محبوب سے تعلق رکھنے والوں کو بھی انسان محبوب جاننے لگتا ہے جس گلی کے متعلق یقین ہو کہ یار کی راہگذر ہے اُس میں بھی دلآویزی کی شان نظر آتی ہے۔ جو کوچہ یار کا مسکن ہو وہ کعبۂ شوق کہلاتا ہے اور جو راہ یار کی منزل تک لے جانے والی ہو اُس کا ذرہ ذرہ عشق و محبت کا پروردگا

بن جاتا ہے۔

صفت رہبر بھی ہوتی ہے اور عشق کی پروردگار بھی۔ یہ معرفت شناس بھی بناتی ہے اور قرب بھی عطا کرتی ہے۔ صفت کا عرفان انسان کو مختلف ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ کبھی دیکھ کر معلوم کیا جاتا ہے اور کبھی سن کر کبھی چکھ کر اور کبھی چھو کر یہ صفت کے عرفان کے مختلف طریقے ہیں اور انسان اِن تمام صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے۔ دیکھنے والی چیز کو دیکھ کر معلوم کرتا ہے۔ چکھنے والی کو چکھ کر۔ ٹٹولنے والی کو ٹٹول کر اور سونگھنے والی کو سونگھنے والی حس کے ذریعے۔

انسانی حواس کے یہ مختلف مدارج ہیں۔ ہر حس کو جو فریضہ سرانجام دینے کی صلاحیت بخشی گئی ہے وہ اسی سے کام لے سکتی ہے۔ دوسرے امور میں اُس کی شہادت معتبر نہیں ہوتی۔ آنکھ سے ناک کا کام لینے کی کوشش کی جائے گی تو یہ بےکار ثابت ہوگی۔ آنکھ، آنکھ ہی کا کام دے سکتی ہے دید کے معاملے ہی میں اُس کی شہادت کو قابلِ پذیرائی سمجھا جائے گا۔ ناک۔ کان اور زبان کے معاملے میں اُسے کبھی زحمت نہیں دی گئی عقل اپنی تمام تر طرفہ کاریوں کے باوجود سماعت کی قوت سے محروم ہے وہ آنکھ اور کان کی وساطت کے بغیر نہ دیکھ سکتی ہے نہ سننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ غرض جو لوگ دین کے ہر معاملے کو اپنی عقل کے ذریعے معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اُن کی غلطی واضح ہے کیونکہ دین ایک ربانی ضابطۂ حیات کا نام ہے۔ ضابطے اور قوانین عقل کی میزان میں تلنے کے لئے نہیں ہوتے وہ تو فرمانبرداری اور اطاعت گذاری کے لئے ہوتے ہیں۔

کسی ذات سے تعلق محکم ہو جائے اور دِل اُس کی عظمتوں کا اعتراف کرنے لگے۔ شہید ناز ہو جائے تو عظیم ذات کے مفاہیم و معنیٰ خود بخود آشکار ہونے لگتے ہیں۔ اُس کے مقصود اور مفہوم کو سمجھنا مشکل نہیں ہوتا۔ دو روحوں کے درمیان جو ربط قائم ہو جاتا ہے وہی مراد کو سمجھا دیتا ہے۔ ربط قائم ہو جانے کے بعد شرح و بیان کی ضرورت نہیں رہتی۔ ربط اور تعلق کے بعد اگر شرح لکھی جاتی ہے تو لذت حاصل کرنے کے لئے۔ یا و گے فسانے کو طول دینے کے لئے تاکہ یہ داستان دراز ہو اور زیادہ لذتیں عطا کرے۔ عقل کی شرح اس لئے معتبر نہیں کہ وہ یار کے دل میں نہیں اُتر سکتی

محبوب کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتی۔ محبت غریقِ انوار ہے۔ اُس کی پرواز یار کے در و بام تک ہی نہیں۔ وہ دل میں بھی اُتر جاتی ہے اور مراد کا موتی لے کر لوٹتی ہے۔ اُس کا لوٹنا اور تڑپنا محبوب کے لیے ہوتا ہے اور عقل کے سارے قلق و اضطراب کا محور و مرکز اپنی ذات کا مفاد ہوتا ہے، اپنا مفاد قربان کر کے وہ محبوب کے مفاد کو کبھی اوّلیت کا درجہ نہیں دے سکتی۔
بدر و حنین میں جان بازیاں دکھانے والے سرفروشوں کے پیشِ نظر اپنا مفاد نہ تھا۔ محبوب کی رضا نے انہیں تاب و تواں عطا کی تھی۔ ایک ایسا ولولۂ شوق بخشا تھا جس کی ساری بے تابیاں محبوب کی عظمتوں کو آشکار کرنے کے لیے تھیں۔ صفات کی معرفت نے انہیں ذات کی شناسائی بخشی اور ذات نے صفات آشنا بنایا۔ اسی لیے اُن کا عرفانِ رسولؐ کامل و مکمل کہلایا کیونکہ وہ ذات و صفات کی شناسائی کا نتیجہ تھا۔

صفت اگر ذات تک نہ پہنچا سکے۔ ذات آشنا نہ بنا دے تو اُس کی معرفت بے سُود ہوتا ہے۔ صفات کا تو مقصود ہی ذات کی معرفت ہوتی ہے۔ مشرکینِ مکہ حضورؐ کو صادق و امین جانتے تھے۔ لیکن صدق و امانت کی صفات کے ذریعے وہ ذات تک نہ پہنچ سکے اور صدیقؓ ذات کے شیدائی تھے۔ اُن پر محبوبیت کے نئے نئے معنی آشکار ہونے لگے۔ ہر صفت میں حسن کی جلوہ گری نظر آنے لگی۔ صفات اُن کے لیے ذات کا آئینہ بن گئیں اور ذاتِ محبوب مقصود
مشرکینِ مکہ کی راہ عشق و محبت کی راہ نہ تھی۔ وہ سراسر عقل کی راہ تھی۔ اس لیے صفات کے حُسن نے بھی انہیں ذات دیکھنا بنایا اور صدیقؓ ذات کے شیدائی تھے۔ ذات کی معرفت نے انہیں ایسی صفات سے آگاہی بخشی جن تک عقل کی رسائی ممکن نہیں۔ مشرکینِ مکہ کے پاس عقل و دانش کی تو کوئی کمی نہ تھی لیکن وہ سوز آشنا دل نہ تھا۔ جو نثار ہونے کے آداب سے واقف ہو۔ اس لیے اِن پر محبوبیت کے معنی آشکار نہ ہو سکے اور وہ اپنے مفادات کی دنیا سے نکل کر محبوبیت کی اُس منزل میں نہ جھانک سکے جہاں جلوے ہی جلوے تھے نور ہی نور تھا اور وہاں کی دنیا کا ہر ذرہ عشق و مستی کا پروردگار بن کر روح کو اِک نئی لذت اور کیفیت عطا کر رہا تھا۔

مجاہدہ اور مشاہدہ

مجاہدہ اُس جدّوجہد کا نام ہے جو رضائے الٰہی کے حصول کے لئے کی جاتی ہے جدّوجہد اگر خلوص پر مبنی ہو تو وہ مشکور ہو کر رہتی ہے۔ اُسے مقبولیت ملتی ہے یہ بتانے کے لئے خدا عرش سے زمین پر نہیں اُترآتا کہ یہ جدّوجہد مقبول ہے یا مردود، ہاں رحمت اور سکینہ لے کر ملائکہ رُوح وقلب پر ضرور نازل ہوتے ہیں جس سے روح کو طمانیت نصیب ہونے لگتی ہے قلب تسکین پاتا ہے اور یہ تسکین قبولیّت کی علامت کہلاتی ہے۔

ملائکہ جب رزم گاہوں میں دادِ شجاعت دینے والے اصحابؓ رسولؐ پر سکینہ لے کر نازل ہوتے تھے تو صحابہؓ انہیں بچشم سر نہ دیکھتے تھے بلکہ اُن کی رُوحیں اُس راحت و سرور کو محسوس کرتی تھیں جو انہیں ملائکہ کی وساطت سے موصول ہو رہا تھا۔ مجاہدے میں جب لذّت نصیب ہو روح تسکین پائے تو اُسی کا نام مشاہدہ ہے۔ جدّوجہد انسان کی طرف سے ہے اور لذّت و سرور کا تعلق خدا کی ذات سے ہے چاہے تو معمولی کوشش کو قبول فرمالے ورنہ زیادہ کو بھی قابلِ التفات نہ سمجھے وہ مختار ہے، اُسے کسی آئین اور قانون کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہ بات خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے کہ محرومی بھی اِس راہ میں ایک منزل آتی ہے انسان انعاماتِ ربّانی سے محروم ہونے کی صورت میں اور اپنی سعی و کوشش کے بارآور ہونے کے باوجود اگر اپنی، کوشش کا سلسلہ بدستور جاری رکھتا ہے اور محرومی کو بھی انعام جان کر قدم پیچھے نہیں ہٹاتا تو انجام کار بے پناہ عنایتوں کا مورد بنتا ہے۔ بے پناہ عنائتیں ہوتی ہی ثابت قدموں اور عالی ہمتوں کے لئے ہیں۔

محرومی کو عطا جاننے والا محرومی میں بھی عطا کے وہ مزے لوٹتا ہے جو بسا اوقات عطا کا مورد بننے والوں کو بھی نصیب نہیں ہوتے۔ محرومی میں اگر لذّت نصیب ہو تو محرومی کہاں رہی؟ وہ تو عین عطا ٹھہری۔ عطا نام ہی روح کی لذّت کا ہے۔ خواہ وہ کسی رنگ اور لباس میں ہو۔ غم مزہ دینے لگے تو وہ عطا کہلائے گا۔ اور اگر راحت و آرام کے اسباب بھی روحانی لذّت سے آشنا نہ کر سکیں۔

تو انہیں عذابِ الٰہی کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ راحتیں کمخواب کے بستر پر ہی نہیں ہوتیں کبھی وہ جھونپڑیوں میں بھی بٹتی ہیں۔ پاکانِ بارگاہ جن کی زندگیاں بالعموم افلاس و غربت، اور رنج و محن سے عبارت نظر آتی ہیں انہیں جو روحانی لذات نصیب تھیں کیا اُن کا عشرِ عشیر بھی قیصر و کسریٰ کے درباروں میں نظر آ سکتا ہے؟ جو لذت انہیں نصیب تھی، وہ خالصتاً عطیۂ ربانی کہلاتی ہے۔ عظیم قدرتیں رکھنے والے قادرِ قیوم کے عطیات کو عقل کے محدود پیمانوں میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔ جو غم وہ اپنی راہ میں عطا کرے وہ نعمت ہوتا ہے اور جو مسرت طاغوت کی بندگی کے بعد نصیب ہو، وہ عذابِ الٰہی سے کم نہیں۔

بلالِ حبشیؓ کا غم عطائے دوست تھا۔ اور اُمیہ بن خلف کی مسرتیں عذابِ خداوندی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ فرعون کی مسرت موسیٰ علیہ السلام کی غم و اندوہ کی زندگی کی ہمسر نہیں ہو سکتی دوست کا غم جب پہلو میں تسکین دینے کے لیۓ موجود ہو اور وہ احساس کو ملذذ کر دے تو اس سے بڑھ کر کوئی تسکین نہیں ہوتی۔ یہی مشاہدے کی منزل ہوتی ہے۔

مشاہدہ تو نام ہے دوست کی جلوہ گری کا۔ یہ جلوہ گری خواہ طورِ سینا پر ہو یا طورِ دل پر۔ پتھروں کو جلائے یا دِل کو خاکستر کر دے۔ خاک ہر جگہ کی عزیز ہو گی جلانے والے کی نسبت سے مقام اور مرتبہ پائے گی، اور سرمۂ چشمِ اہلِ بصیرت بنے گی۔ کیمیاگر کی آگ میں جلی ہوئی خاک بھی قیمت پاتی ہے اور خدا کی راہ میں جلے ہوئے دِل بھی رائیگاں نہیں جاتے۔ مشیت اُن کی خریدار بنتی ہے۔ رحمت انہیں خریدتی ہے اور قبولیت انہیں گلے لگانے کے لیۓ اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔

جلن کا علاج جمال کی خنکی سے کیا جاتا ہے۔ دِل پر جب جمال کے سائے پڑ رہے ہوں اُن سے بھی منکیف ہو اور احساسات بھی ملذذ تو یہ جمال کی کرشمہ سازی ہوتی ہے۔ یہی وہ دولت ہے جو ہمدانیٔ زہرا کے حصے میں آتی ہے اور وہ اس کے حصول کے لیۓ بے چین رہتی ہیں۔

ذات کی طلب

جاں نثاری کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ دلیل انسان کو جان دینے پر آمادہ کرسکتی ہے۔ فطرت میں سوز موجود ہو تو وہ خود بخود رہنما بن جاتا ہے جاں نثاری کے انداز بھی آجاتے ہیں اور راہیں بھی کشادہ ہونے لگتی ہیں۔

کشادگی محبت کا حصّہ ہے۔ عقل کا جہان ہمیشہ محدود رہا ہے اور اسے اپنی دنیا سے باہر جھانکنے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ محبّت کی زد میں ساری خدائی ہے بلکہ خدا بھی محبّت کے جہان سے دور نہیں۔ محبّت کی تو خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ قرب اور بُعد کے تمام مراحل کو مٹا کر رکھ دیتی ہے جہاں اس کی پرواز ہوتی ہے۔ وہاں عقل کا گذر ممکن نہیں۔ عقل کو تو قدم قدم پر خطرے اور اندیشے لاحق رہتے ہیں۔ وہ خطرات میں کودنے کی جسارت کیسے کرسکتی ہے؟ اس نے تو ہمیشہ حادثوں سے بچنے کی کوشش کی ہے اور محبت خود ایک حادثہ ہے۔ اِسے حادثوں سے کیا خوف ہوسکتا ہے؟ محبت کی جان پر کوئی حادثہ بیتتا ہے تو اس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہوجاتی ہے۔ چہرہ اور تابناک اور حسین نظر آنے لگتا ہے۔ جذبات کے سمندر کی ہر لہر طوفانی بن جاتی ہے لیکن عقل اس میدان میں ہتھیار ڈال دیتی ہے اسے تو اسی وقت جولانیاں دکھانے کا موقع ملتا ہے جب کوئی خطرہ درپیش نہ ہو۔ صحابہؓ کی محبت چوں کہ صدّیقی تھی اس لیے انہیں زندگی بھر اللہ کے رسولؐ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ مصائب و آلام کی زندگی میں اُن کے لب شکوہ و شکایت سے آشنا نہیں ہوئے فاقہ مستی میں بھی وہ مسرور تھے اور خطرات میں بھی فرحاں و شاداں، وہ اللہ کے رسولؐ پیغمبرانہ تصرّفات سے آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم نے جس امّی لقب رسولؐ کو محبوبِ دوعالم کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے وہ ہمارا ہی محبوب نہیں، خدا کا بھی محبوب ہے اور محبوبیت کا مفہوم بھی ان پر آشکار تھا ان سے زیادہ

اس حقیقت سے کون باخبر ہو سکتا ہے کہ عشق کی بارگاہ میں حسن کی بے اختیاری خود عشق
کی تو ہین ہوتی ہے۔ محبوب تو کہتے ہی اُسے ہیں جو عشق کے فیصلے بدل دے۔ جلال کو جمال
میں لے آئے۔ ایک ہی ادا دکھا کر قہر و غضب کی آگ کو ٹھنڈا کر دے۔ محبّ کا اعتماد حبیب
ہے اور اُسے محبّ کے دل پر تصرّف کا پورا پورا حق حاصل ہو۔ یہ سب کچھ جاننے
کے باوجود انہوں نے مصائب سے نجات کے لئے کوئی معجزہ طلب نہیں کیا۔ سب سے
بڑا معجزہ ان کے نزدیک جمالِ رسول ؐ تھا اور یہ انہیں حاصل تھا۔ مزید کی طلب تو اس
وقت ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے محسن کے سابقہ انعامات کی شکر گزاری سے عہدہ برآ
ہو جائے۔ صحابہؓ کو تو مشاہدۂ جمال کی شکر گذاری ہی سے فرصت نہ تھی۔ وہ سہولتیں اور
آسانیاں کیا مانگتے؟ بدر و حنین کے معرکوں میں اُن کا سینہ سپر ہو جانا اور تیر کھا کر
دل سے مرحبا کی صدا کا نکلنا کیا تھا؟ یہ مشاہدۂ جمال کی شکر گذاری ہی تو تھی۔ ورنہ تیر
کھا کر کون دعا دیتا ہے؟ زخموں سے نڈھال ہو کر کون رقص کرتا ہے؟ اُن کا رقص اُن کی
محبّت کا مستانہ رقص تھا جو قدسیوں کو بھی کیف میں لے آتا تھا۔

حجابات

اپنی ضرورت پر کسی کی ضرورت کو ترجیح دینے کا نام ایثار ہے۔ خود بھوک سے بُرا
حال ہو، اور اپنی غذا کسی محتاج کو دے دی جائے تو اسے ایثار کہیں گے ایثار یہ نہیں
کہ اپنے دسترخوان کے بچے کھچے ریزوں سے کسی کو نواز دیا جائے۔ اُسے زیادہ سے
زیادہ سخا کہہ سکتے ہیں ایثار نہیں۔ ایثار کی تو فطرت ہی یہ ہے کہ وہ دوسرے کی
ضرورت پوری کر کے خوش ہوتا ہے اور اس خوشی میں اسے اپنی تکلیف کا احساس
نہیں رہتا۔ سخاوت کے اندر بسا اوقات معاوضے کی طلب ہوتی ہے لیکن ایثار معاوضے
کا آرزو مند نہیں ہوتا۔ اس کی کوئی طلب ہوتی ہے تو صرف یہ، کہ جس کی خاطر ایثار کیا

گیا ہے اُسے احتیاج سے بے نیاز کر دے۔ سخاوت اور ایثار دو مختلف قبیل کی چیزیں ہیں۔ دونوں کے محرکات بھی جدا ہوتے ہیں اور اثمار و نتائج بھی جداگانہ۔ سخاوت خوب دیکھ بھال کر کی جاتی ہے۔ پہلے اپنے حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ اگر خدا کی راہ میں اتنی رقم خرچ کی گئی تو اس کا اپنی زندگی پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا؛ لیکن ایثار اپنی ضرورت سے بے نیاز ہو کر دوسرے کی ضرورت کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے۔ سخاوت عقل کا فعل ہے اور ایثار محبت کا کرشمہ، محبت جس قدر پائیدار مضبوط اور محکم ہوگی، ایثار بھی اسی نسبت سے ہوگا اور عقل جس قدر عیّار ہوگی۔ سخاوت میں اسی قدر احتیاط برتے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بدر و حنین میں صحابہؓ جو جاں نثاریاں دکھا رہے تھے اس کی یہی وجہ تھی کہ محبت سب کچھ نثار کر کے اوجِ کمال حاصل کرنا چاہتی تھی۔ محبت کا خمیر ہی ایثار سے تیار کیا گیا ہے۔ محبت ہو تو ایثار کے بغیر چین نہیں آتا سب کچھ قربان کرنے کے بعد بھی یہی احساس باقی رہتا ہے۔ کہ شاید محبت کا حق ادا نہیں ہو سکا؛ اور اگر محبت نہ ہو "صرف لین دین ہو" تو چند ٹکے خرچ کر کے بھی یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ بڑا تیر مارا جو اتنی بڑی قربانی دی گئی محبت کو قربانی دینے کے بعد بھی اطمینان نہیں ہوتا اور عقل معمولی سخا پر بھی اترانے لگتی ہے۔ محبت چونکہ جنسِ بازار نہیں اس لئے یہ انہی سینوں میں رکھی جاتی ہے جو اس کے اہل ہوتے ہیں یوں بھی جو چیز عام ہو جائے وہ اپنی قیمت کھو بیٹھتی ہے۔ جس چیز کی اہمیت کو باقی رکھنا مقصود ہو اُسے جنسِ بازار نہیں بننے دیا جاتا صدیقؓ کی طرح دوسروں کا ایثار بھی حدِ کمال کو پہنچ جاتا، وہ بھی سب کچھ پیش کرنے کے بعد اس احساس سے پریشان ہونے لگتے، کہ بیٹی کے کانوں میں دو پیسے کی بالیاں رہ گئیں، یا علیؓ کی طرح بستر پہ لیٹ کر نقدِ جاں پیش کر دیتے تو ایثار کی شان کیسے باقی رہ سکتی تھی مال اور جان دونوں کا ایثار حدِ کمال کو پہنچ گیا، تو دنیا کے سامنے ایثار کے مظاہر پیش کرتے والے رسولؐ

نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ ابوبکرؓ اور علیؓ کی فطرت میں ایثار کا مادہ پہلے ہی سے موجود تھا رسولؐ کی ہجرت نے انگیخت کی، تو یہ مادہ اُبھر کر سامنے آگیا۔ نبوّت کا پہلا ہی قدم اُٹھا اور دو انسانوں کی تکمیل ہو گئی۔ علیؓ جاں نثار بن کر بستر پر لیٹ گئے اور ابوبکرؓ کو ہم رکابی کا شرف مل گیا۔ ایثار دونوں صورتوں میں جلوہ گر ہے کہیں رفیقِ سفر بن کر اور کہیں آسودۂ خواب ہو کر، دونوں صورتیں ایثار کی ہیں۔ دونوں میں ایثار کی جلوہ گری ہے۔ محبت دونوں مقام پر فائز المرام ہے۔ بستر پر بھی اور غارِ ثور میں بھی 'پاس' رہ کر بھی اور دور رہ کر بھی قرب و بُعد دونوں اضافی امور ہیں۔ دنیا نے قرب و بُعد کے جو پیمانے بنا رکھے ہیں، محبت کی دنیا میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تعلق مضبوط ہو، تو ایثار خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور ایثار ہو تو دُوری قرب سے بدل جاتی ہے۔ محبت تمام پردوں کو اٹھا کر رکھ دیتی ہے۔ حجاب ہمیشہ اپنی طرف سے ہوتا ہے۔ محبوب حقیقی کی طرف سے نہیں! اغراض نفسانیہ کے پردے جوں جوں اُٹھتے جاتے ہیں، حجاب بھی مٹتا جاتا ہے۔

تو خود حجاب شدی حافظ از میاں برخیز

ہستی کو اس لئے سب سے بڑا حجاب کہا گیا ہے کہ یہ خواہشات کا منبع ہے اپنی رضا محبوب کی رضا کے تابع ہو جاتی ہے تو کوئی حجاب نہیں رہتا۔

عبداللہ بن مُبارکؒ

خراسان سے بغداد آنے کے بعد مبارکؒ ایک باغ میں غلام کی حیثیت سے کام کر رہے تھے کہ ایک واقعہ نے اُن کی زندگی کا دھارا بدل کر رکھ دیا باغ کے مالک نے انہیں انار لانے کے لئے کہا لیکن جب وہ انار لائے تو وہ مالک کو پسند نہ آیا اور اس نے تہدید آمیز لہجے میں کہا کہ اتنی مدت باغبانی کرنے کے بعد ترش و شیریں میں فرق کرنے کی صلاحیت بھی پیدا نہیں ہوئی؟ مبارکؒ بولے میں نے کبھی باغ کا پھل نہیں کھایا۔ یہ

جواب مالک کی توقع کے خلاف تھا۔ ایک عابد اور محنتی نوجوان کی حیثیت سے وہ مبارکؒ سے واقف تھا۔ لیکن دیانت داری کا یہ پہلا تجربہ تھا جو اس کے لئے حیرت، و استعجاب کا موجب بنا۔ دونوں میں وہ تفریق مٹ گئی جو آقائی اور غلامی نے قائم کر رکھی تھی۔ اب بے تکلفانہ گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر باتیں ہونے لگیں

ایک دن مالک نے سوال کیا۔ کسی شخص کو داماد کی حیثیت سے اپنی فرزندی میں لیتے وقت کن امور کو ملحوظ رکھنا چاہیئے؟

مبارکؒ نے جواب دیا۔ اس باب میں مختلف قوموں کے مختلف نظریئے ہیں۔ دورِ جاہلیت میں حسب و نسب کو دیکھا جاتا تھا۔ یہود کی نظر ہمیشہ مال پر رہی ہے۔ وہ مالدار داماد کو پسند کرتے ہیں اور نصاریٰ کے نزدیک جمال کی خوبی وجہ شرف قرار پاتی ہے۔ لیکن اسلام کا اس باب میں مختلف نظریہ ہے وہ مال، جمال اور حسب و نسب کو نہیں دیکھتا بلکہ ایسے کمال کو پسند کرتا ہے۔ جو ایک مسلم کو غیر مسلم سے ممیز و ممتاز کر سکے اصل چیز اسلام کے نزدیک تقویٰ اور پارسائی ہے۔ مالک نے اس گفتگو کے بعد مبارکؒ کو اپنی فرزندی میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ جب اُن کا نکاح ہو گیا تو انہیں غلامی سے نجات بھی مل گئی اور مال بھی ہاتھ آ گیا۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اسی پاک باز انسان کے گھر پیدا ہوئے۔ اسلام کے اس مامور اور عظیم صوفی، محدثؒ اور صاحب عرفان نے بغداد کی عظیم درسگاہ سے تعلیم حاصل کی مختلف دیار و امصار کے تعلیمی مراکز اُن کی توجہ کا مرکز بنے۔ انہوں نے عظیم محدثین سے اکتسابِ فیض کیا علم و عرفان کے مطلع پر بدر منیر بن کر چمکے اور تجارت کا سلسلہ دور دراز ممالک تک پھیل گیا جو تموّل انہیں نصیب تھا کم از کم علماء و صلحاء کی زندگیوں میں تو اس کی مثال نہیں ملتی۔ اُن کا تموّل اس لئے نہ تھا کہ اس کے ذریعے وہ حظِ نفس کا سامان فراہم کر سکیں۔ اُن کا سرمایہ غرباء و مساکین کی ضرورتوں میں صرف ہو

رہا حسن بصریؒ کا جو قافلہ باطل کی پھیلائی ہوئی ظلمتوں میں حق کا نور فروزاں کرنے کے لیے اُٹھا تھا۔ اُس پر رزق کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے تھے اور حجاج بن یوسف نے اُن لوگوں کو اپنی نوازشات کا مورد بنا لیا تھا۔ جو اُس کے معین و مددگار بن کر اُس کے مقاصد کی تکمیل کر رہے تھے۔ حسن بصریؒ کا ساتھ دینا حجاج کے قہر و غضب کو دعوت دینے کے مترادف تھا اور اہلِ حق کا قافلہ بے یار و مددگار ہونے کے باعث گوناں گوں مشکلات میں مبتلا تھا۔ حسن بصریؒ کی غربت، حسن بصری کا افلاس، حسن بصری کی تہی دامنی اور فاقہ کشی اگرچہ سرمایہ داروں اور حجاج کی خوشنودی کے ذریعے دولت سمیٹنے والوں کے خلاف احتجاج کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اُن کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ یوں بھی سرمایہ دار کی زندگی اقتدار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے اشاروں کی منت پذیر ہوتی ہے وہ وہیں سرمایہ لٹاتا ہے۔ جہاں سے اُسے مزید کے ملنے کی توقع ہوتی ہے حسن بصریؒ تو اپنے عہد کے مظلوم ترین انسان تھے۔ اہلِ بیتؓ کی محبت اور عقیدت کے جرم نے انہیں حجاج کی نظروں میں معتوب اور مبغوض بنا رکھا تھا۔ اُن سے ہمدردی کا اظہار کون کرتا؟ عبداللہ بن مبارکؒ نے اس بے سر و سامان قافلے کی ضرورتوں کی تکمیل کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ وہ انہی لوگوں کے لیے تاجر بنے تھے۔ ورنہ تجارت اُن کا میدان نہ تھا۔

عبداللہ بن مبارکؒ نے اُمتِ محمدیہؐ کے لیے۔ جو دولت چھوڑی ہے۔ وہ لعل و جواہر نہیں بلکہ علم و عرفان کی دولت ہے۔ فکر و نظر اور سوز و گداز کا سرمایہ ہے۔

حج کے لیے ایک دفعہ وہ ایک صحرا سے گزر رہے تھے کہ اپنے قافلے کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں ایک نوجوان نظر آیا جو انتہائی بے سر و سامانی کے عالم میں قطع مسافت کر رہا تھا۔ عبداللہ بن مبارکؒ اسے دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ بھوک پیاس سے نڈھال ہے چنانچہ انہوں نے قافلے کو ٹھہرنے کا حکم دیا اور کھانا منگا کر نوجوان کے سامنے رکھ دیا اور کھانا کھاتے وقت انہوں نے نوجوان سے پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟

نوجوان بولا کہ حرمین الشریفین کی زیارت کے لیے

عبداللہ بن مبارکؒ نے ازرہِ تفنّن کہا کہ آپ پر تو حج فرض نہیں۔ آپ کا شکستہ حال بے کسی کا آئینہ دار ہے۔ ہمیں مال و دولت سے ذریعے توفیق بخشی گئی ہے۔ ہم اس لیے جا رہے ہیں کہ ہمیں بلایا گیا ہے۔ آپ کے نام تو کوئی پیغام نہیں آیا۔

نوجوان نے جواب دیا کہ میرے رب کی کریم ذات ہے۔ وہ مہمانوں ہی کو نہیں نوازتا۔ طفیلی بھی اس بارگاہ سے محروم نہیں رہتے۔ یہی احساس کشاں کشاں لیے جا رہا ہے۔

یہ عارفانہ معاشقانہ جواب سُن کر عبداللہ بن مبارکؒ تڑپ گئے۔ اُن کے لیے آنسوؤں کا ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ اب عبداللہ بن مبارکؒ تماشہ تھے اور نوجوان تماشائی۔ محبت کی کمان سے نکلا ہوا تیر عبداللہ بن مبارکؒ کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اور انہیں نئی لذتوں سے آشنا بنا گیا۔

یہی بارگاہ سے قربِ عطا فرمانے کے بعد خدا تعالیٰ دوسروں کے دلوں میں بھی انسان کے لیے عقیدت محبت کے جذبات پیدا فرما دیتا ہے یہ ممکن نہیں کہ خدا کا کوئی بندہ خلا کی نظروں میں محبوب ہو اور نیک بندوں میں مقبول قرار نہ پائے مقبولیت جب خدا کی بارگاہ سے ملتی ہے تو انسان عقیدت و محبت کا محور و مرکز بن جاتا ہے۔

دنیا کی مقبولیت اور خدا تعالیٰ کی عطا کی ہوئی مقبولیت میں یہ بنیادی فرق ہے کہ ایک کی پرواز محدود ہوتی ہے۔ حرص و ہوس کی کوکھ سے جنم لے کر یہ نمودار ہوتی ہے اور حرص و ہوس ہی کی فضاؤں میں قلابازیاں لگا کر معدوم ہو جاتی ہے لوحِ جہاں پر اس کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔ خدا کی عطا کی ہوئی مقبولیت دلوں پر محبت کے جو نقوش چھوڑتی ہے۔ زمانے کے تغیرات اسے مٹا نہیں سکتے۔ اُس کا حسن و جمال لحظہ بہ لحظہ فزوں ہوتا ہے۔ اپنی بہار دکھاتا ہے اور دلوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کا موجب ثابت ہوتا ہے۔ تاریخِ عالم میں ایک ایسی مثال نہیں ملتی کہ خدا کی عطا کی ہوئی عظمتوں کو کبھی زوال آیا ہو۔ اپنے عہد میں خدا کا جو بندہ محبوب تھا صدیاں گذر جانے کے باوجود بھی وہ محبوب ہے۔ محبوبیت کا جو خلعت اسے اپنے رب کی بارگاہ سے ملا۔

تھا۔ اُس پر زمانے کی تغیر پذیر رفتاریں اثر انداز نہیں ہو سکیں۔ بخلاف اِس کے اقتدار اور قوت کے بل بوتے پر معزز اور مکرّم بننے والوں کی عظمتوں کا آفتاب ایسا غروب ہوا کہ دلوں میں اُس کی یاد بھی باقی نہ رہی۔

عبداللہ بن مبارکؒ کی عظمتوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے امام نووی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حق کا ایسا امام ہے۔ جس کا ذکر کیا جائے تو رحمتِ حق کا نزول شروع ہو جاتا ہے۔ رحمت برستی ہے رحمت نازل ہوتی ہے۔ اِن کا ذکر رحمت کا امین ہے۔ جس کے ذریعے مغفرت کی آرزو کی جا سکتی ہے۔ یہ جادہ عقبیٰ کی منزل تک لے جانے والا ہے۔ خیر یہ تو امام نوویؒ کی رائے تھی۔ امام مالکؒ جو زندگی میں کسی امیر کے لیے تعظیماً کھڑے نہیں ہوتے۔ جنہوں نے سلام میں تقدیم نہیں کی۔ اقتدار کو نظر بھر کر نہیں دیکھا عبداللہ بن مبارکؒ کو دیکھ لیتے تو اُٹھ کر تعظیم کرتے اور احترام سے انہیں اپنے پاس بٹھاتے۔ سفیان ثوریؒ سے ایک دفعہ کسی نے مسئلہ پوچھا۔ ثوریؒ نے کہا آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟ سائل بولا کہ میں مشرق کا رہنے والا ہوں۔

ثوریؒ بولے کہ حیرت ہے۔ مشرق میں مشرق کا امام موجود ہے اور آپ دوسروں سے مسائل پوچھتے پھرتے ہیں۔

سائل نے کہا کہ مشرق کا امام کون ہے؟

ثوریؒ نے جواب دیا۔ عبداللہ بن مبارکؒ۔

عبداللہ بن مبارکؒ نے زندگی بھر اونچی بارگاہوں کا طواف نہیں کیا۔ وہ خلفاء کے دربار میں نہیں گئے۔ حالانکہ اِن بارگاہوں کے دروازے اُن کے لئے بند نہ تھے انہیں درباروں میں لانے کے لئے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری تھا ایک دفعہ خود بخود اُٹھ کر ہارون رشید کے دربار میں پہنچ گئے اور انہوں نے تبلیغ کا وہ فریضہ ادا کیا جو اُن پر داعئ حق ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا تھا۔ ہارون رشید کے دربار سے

نکل کر واپس آ رہے تھے تو نوح موصلی نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور کہا کہ پہلے تو آپ اصرار اور تقاضے کے باوجود دربار میں آنے سے گریز کرتے تھے آج کیوں آگئے؟

عبداللہ بن مبارکؒ نے جواب دیا۔ مدتوں میری نفس سے جنگ رہی ہے۔ میں اسے شہادت کی موت پر راضی کر رہا تھا لیکن اُس کی سرکشی میں فرق نہ آیا اب وہ شہادت کی موت پر راضی ہو گیا ہے اور میں آگیا ہوں اس باب میں اُن کا نظریہ یہ تھا کہ جب تک موت کا کھٹکا لگا رہے۔ انسان ارباب جاہ کے سامنے کھل کر بات نہیں کہہ سکتا۔ کسی حق پرست انسان کو سرکاری دربار میں اسی وقت جانا چاہیئے جب اُس کے دل سے موت کا خطرہ نکل جائے اور وہ واشگاف الفاظ میں حق بات کہنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ یہ نہ ہو تو جانا حرام ہے ہارون رشید کا معمول یہ تھا کہ وہ کچھ مدت کے لئے رقہ آ جاتا اور یہاں قیام پذیر ہو کر موسم کی خوشگواریوں سے لطف اندوز ہوتا یوں بھی اِس عہد میں رقہ کو بغدادِ ثانی کی حیثیت حاصل تھی۔

ایک دفعہ رقہ کے بازار میں شور اٹھا۔ لوگ اضطراب کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور ہارون رشید کی بیوی محل سے لوگوں کے دوڑنے کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اُس نے ایک خادمہ کو صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے روانہ کیا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے لوٹ کر اطلاع دی کہ شہر میں عبداللہ بن مبارکؒ کے آنے کی خبر مشہور ہو گئی ہے اور لوگ اُن کے استقبال کے لئے جا رہے ہیں۔

ہارون رشید کی بیوی جو اپنے شوہر کے استقبال کے مناظر دیکھ چکی تھی۔ ایک مردِ حق کے استقبال کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ چنانچہ اُس نے ہارون رشید کے پاس جا کر کہا۔

"حقیقتاً بادشاہ یہ لوگ ہیں جن کی دلوں پر حکومت ہے انہیں خیل و سپاہ کی ضرورت نہیں۔ خدا کی مخلوق ان کی فوج اور سپاہ ہے اور خدا ان کا حامی و ناصر۔"

حق کو مغلوب دیکھ کر صرف وہی لوگ حق کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔

جن کا ذوق بلالِ حبشیؓ اور صہیبؓ رومی کے ذوق سے ہم آہنگ ہو ورنہ قوت و شوکت کے مظاہر دیکھ کر تو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بھی غازیانِ اسلام کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ جو لوگ ابتدا میں ایمان لائے۔ انہوں نے دورِ مصائب دیکھا۔ قریش کے مظالم برداشت کئے اور اُن کے عزائم میں فرق نہ آیا۔ قرآن انہی کا قصیدہ پڑھتا ہے۔ انہی کو مثالی قرار دیتا ہے۔ اُن کے اتباع کی تعلیم دیتا ہے۔ کیونکہ مصائب و آلام کے اُس مکی دور میں نفاق کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ کفار کی بھڑکائی ہوئی آگ میں بلالِ حبشیؓ ہی کود سکتے تھے۔ عمارؓ و یاسرؓ کا ایمان ہی اس آگ میں سلامت رہ سکتا تھا جو شخص شعلوں سے کھیلنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو۔ ذرا سی تکلیف سے گھبرا کے دامن سمیٹے مفاد کو عزیز جانے، وہ مشکلات میں ساتھ کہاں دے سکتا ہے؟ یہ راہ تو صدیقین کی راہ ہے اور ایسے ہی لوگوں کے تابندہ جذبات سے عشق و محبت کی داستانوں کو فروغ ملا ہے۔ عشق نے انہی سے زندگی پائی ہے اور حسن کا چہرہ انہی کے خون کی سرخی سے فروزاں اور تاباں نظر آتا ہے۔ ذرا سوچئے اسلام کو اپنی ابتدائی زندگی میں ایسے دیوانے نہ ملتے تو اس داستان میں جان کہاں سے آتی۔ محبت کا چہرہ الرگوں کیسے بنتا اور عشق کو یہ سرفرازیاں کیسے نصیب ہوتیں؟ یہ تو انہی دیوانوں کا جذب و شوق تھا جو کئی داستانوں کا عنوان بن گیا۔ بدر و حنین کے افسانے اسی سے مرتب ہوئے۔ عشق بن کر لامکاں میں پہنچا اور وحی بن کر زمین پر اُترا۔ کہیں سمٹا اور کہیں پھیلا۔ دِلوں میں رہ کر محدود کہلایا اور وحی میں آجانے کے بعد لامحدود ہو گیا حق کو مظلوم اور مقہور دیکھ کر جاں نثاری اور جاں سپاری کے جذبات لے کر آگے بڑھنے والوں کا پیوند بھی انہی نفوسِ قدسیہ سے ہوتا ہے۔ جنہیں قدرت نے اسلام کے اوّلیں نگہبانوں کی حیثیت سے منتخب کر لیا تھا اور ایسے حق پرست مختلف ادوار میں اپنے ایمان و ایقان کی شان دکھاتے رہے تھے۔

عبداللہ بن مبارکؒ کا بھی ایسے ہی حق پرست انسانوں سے تعلق تھا۔ کوفے میں حسن بصریؒ علم و فضل کی بساط بچھا کر دعوتِ حق دینے میں مشغول تھے حجاج کی نگاہوں میں اُن کا بھی جُرم ناقابلِ معافی تھا۔ اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ کسی طرف سے دستِ تعاون بڑھنے کی امید نہ تھی۔ امراء کا تعاون حجاج کے ساتھ تھا اور جو لوگ حسن بصریؒ کا ساتھ دے رہے تھے۔ اُن کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ وہ حسن بصریؒ کی قیادت میں حق کے فرائض سرانجام دینے والوں کی ضرورتوں کے کفیل بن سکتے۔ یہ فریضہ عبداللہ بن مبارکؒ نے اپنے ذمہ لے لیا تجارت کے سلسلے میں گھومنے پھرنے کے باعث انہیں حق کو پھیلانے کا موقع بھی مل رہا تھا۔ یوں وہ دنیائے اسلام کے اُس جلیل القدر محدّث اور مردِ درویش کے افکار کو مختلف دیار و امصار میں منتقل کر رہے تھے۔ جنہیں علیؓ ابن ابی طالب نے بنفسِ نفیس حق گوئی کے فرائض سرانجام دینے کے لیے مامور کیا تھا اور بازو سے پکڑ کر کوفے کی جامع مسجد کے منبر پر بٹھا دیا تھا۔

عبداللہ بن مبارکؒ غایت درجہ بے باک اور حق پرست ہونے کے باوجود اربابِ اقتدار کے قہر و غضب سے محفوظ رہے۔ لیکن اُن لوگوں کے غضب سے محفوظ نہ رہ سکے جن کی نیتوں میں کھوٹ تھا۔ وہ ان پر غلاظت اچھال کر اپنی رزالت کا ثبوت فراہم کر رہے تھے وہ اُن لوگوں کو خوش کرنا چاہتے تھے۔ جن کی راہ میں اسلام کے اس مبلغ کا وجود دیوار بن کر حائل تھا۔ حق کا داعی اگر اربابِ اقتدار کی نظروں میں معتوب ہو تو دوں فطرت انسانوں کو اپنی خباثت کے اظہار کا پورا پورا موقع مل جاتا ہے۔ وہ جی بھر کے اپنے دِل کا بخار نکالتے ہیں اس لیے کہ الزام تراشیوں سے انہیں روکنے والا کوئی نہیں ہوتا بد باطنوں کو جب عبداللہ بن مبارکؒ کی زندگی میں کوئی خلا نظر نہ آیا تو انہوں نے یہ کہہ کر زہر اگلنا شروع کر دیا کہ اس شخص کا سرمایہ حسن بصریؒ اور فضیل ابن عیاضؒ کے پاس آنے والے غیر ملکی افراد کی ضرورتوں پر تو صرف ہو رہا ہے لیکن اس کے دِل میں بغداد کے رہنے والوں کی ہمدردی

کا کوئی جذبہ نہیں یہاں کے غریبوں، محتاجوں کی ضرورتیں اسے نظر نہیں آتیں۔ یہ بڑا خطرناک شوشہ تھا۔ جو خبیث روحوں نے چھوڑا۔ اس میں جذباتی اپیل بھی تھی جس سے سطحی نظر رکھنے والے متاثر بھی ہوئے۔ لیکن عبداللہ بن مبارکؒ کا جواب یہی تھا کہ جنہیں میں مستحق سمجھتا ہوں، اُن کی مدد کر رہا ہوں۔ آپ کی نظر میں جو غریب ہیں۔ آپ ان کا خیال رکھیں۔

باطل کی یہ فطرت ہے کہ جب وہ حق پرستوں کے سامنے دلیل و برہان لانے سے عاجز آجاتا ہے تو عوام کو بھڑکانے کے لیے جذباتیت کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ ابوجہل نے بھی یہی حربہ استعمال کیا تھا قریش کو یہ کہہ کر بھڑکانے کی کوشش کی تھی کہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) قریش کے فضل و کمال کے منکر ہیں، غلاموں کو نواز رہے ہیں یہ لوگ اُن کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔

مذہب اُو، قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویشتن بر یک خواں نشست

ابوجہل کا یہ طرزِ عمل بھی خالصتاً جذباتی تھا اور عبداللہ بن مبارکؒ کے حریف بھی بغداد کے رہنے والوں کو اُن غیر ملکیوں پر ترجیح دے رہے تھے۔ جنہیں اسلام کی محبت حسن بصریؒ کی محفل میں کھینچ لائی تھی۔ لیکن عبداللہ بن مبارکؒ کے نزدیک زبان رنگ اور نسل کی یہ تفریق کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ جس نے انسانوں کو مختلف شعوب و قبائل میں بانٹ دیا تھا۔ وہ اسلام کے ہمہ گیر مفہوم کے داعی تھے۔ اِسی طرف لوگوں کو بلا رہے تھے۔ حسن بصریؒ اور فضیل ابنِ عیاضؒ کا قافلہ اُن کے نزدیک مکرّم و محترم تھا وہ اسی قافلۂ شوق کی نصرت و اعانت کے لیے تاجر بنے تھے اور جب روم کے ایک

محاذ پر معرکۂ کارزار گرم ہوا تو یہی نہیں کہ عبداللہ بن مبارکؒ نے اپنی شعلہ نوائی سے لوگوں کے دلوں میں آگ بھر دی اور انہیں جہاد کے لیے تیار کیا بلکہ اپنے تبلیغی فرائض نظر انداز کر کے وہ رُوم کے محاذ پر پہنچ گئے اور دنیا نے انہیں ایک غازی اور مجاہد کی حیثیت سے دادِ شجاعت دیتے ہوئے دیکھا۔ اربابِ اقتدار سے اُن کے اختلافات معمولی نوعیت کے نہ تھے۔ اُن کی حیثیت شرعی تھی لیکن باطل کی صورت میں جب خطرہ سامنے آیا تو وہ اختلافات کو بھول کر میدان میں آ گئے وہ جانتے تھے کہ ایسے مواقع پر اختلافات کو اہمیت دی گئی تو اس سے باطل کو تقویت ملے گی کافروں کے دلوں سے مسلمانوں کا خوف نکل جائے گا اُن کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔ خطرے کے وقت عبداللہ بن مبارکؒ اختلافات کی آڑ لے کر پسپائی اختیار کر لیتے اور اُن کی طرف سے اُن سرفروشانہ جذبات کا اظہار نہ ہوتا جو ہماری ملی تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہیں تو اسلام کے اِس عظیم محدّث کو وہ عظمتیں نصیب نہ ہوتیں۔ جن سے اُن کی ذات عبارت ہے۔ ایسے نازک موقع پر انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ باطل کی غوغا آرائی کے وقت اختلافات کو اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ وقت متحدّ اور منظّم ہو کر باطل کو نیست و نابود کرنے کا ہوتا ہے روم کے محاذ پر انہیں جن شدائد کا سامنا کرنا پڑا۔ انہی کے باعث اُن کی صحت برقرار نہ رہ سکی اور وہ اپنے اللہ سے جا ملے۔

تخلیقی کام کرنے والوں کی زندگیاں بالعموم تنہائی میں گذری ہیں۔ گوشہ میں بیٹھ کر ہی انہوں نے تخلیق کی ہے۔ تخلیق کو حسن عطا کیا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ہیں جن لوگوں کا محبوب ترین مشغلہ بزم آرائی رہا ہے انہیں بھی بیکار تو نہیں کہا جا سکتا معاشرے کو انہوں نے مسرّتیں عطا کی ہیں۔ کئی دلوں کو لذّت آشنا بنایا ہے لیکن اُن کا فن اُن کی زندگیوں تک محدود رہا ہے تخلیق کا حسن محدود چیز نہیں۔ یہ فنکار کی موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور اس آئینے میں شاعر، ادیب اور نئے جلوے تراشنے والے صنّاع

اور فنکار کے ذوق و وجدان کے حسن و جمال کو دیکھا جا سکتا ہے۔

عبداللہ بن مبارکؒ بھی غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے عالم دین تھے۔ کتاب و سنت سے انہیں غیر معمولی شغف تھا اس لئے اپنے فرائضِ حیات سے فارغ ہونے کے بعد اُن کا زیادہ تر وقت تنہائیوں میں گذرتا۔ ربانی کلام اور احادیث پاک اُن کے فکر و خیال کا موضوع ہوتیں۔ تجربے اور مشاہدے سے بھی یہی معلوم ہوا ہے کہ خلوت کی لذتوں سے بے بہرہ انسانوں نے خلوت نشینوں کو ہمیشہ حیرت و استعجاب کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ ایسا ہی ایک شخص جس کے لئے عبداللہ بن مبارکؒ کی خلوت نشینی ایک معمہ بنی ہوئی تھی اُس نے حیرت سے سوال کیا کہ خلوت میں آپ کا دِل نہیں گھبراتا؟

عبداللہ بن مبارکؒ نے جواب دیا کہ گھبراہٹ کیسی؟ جس شخص کو خدا تعالےٰ اور اس کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی معیت حاصل ہو وہ گھبرائے گا یا اپنے مقدر پر ناز کرے گا؟

عبداللہ بن مبارکؒ کے جواب میں اُس حدیث کی طرف اشارہ تھا جس میں خدا تعالےٰ کا یہ فرمان موجود ہے کہ میں ذکر کرنے والے کا جلیس ہوتا ہوں۔ یوں بھی ذکر کو مذکور سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں ذکر ہوگا۔ مذکور کی ذات بھی ہوگی یہ الگ بات ہے کہ وہ ہمیں نظر نہ آئے لیکن محسوس ضرور ہوگی۔

مجھے تھا شکوۂ ہجراں کہ یہ ہوا محسوس
میرے قریب سے ہو کر وہ ناگہاں گذرے

خیر ذکر اور ذکر کی لذت و برکات کے متعلق عبداللہ بن مبارکؒ کا نظریہ کوئی نیا نہیں۔ عارفینِ اُمت اسے ہر دور میں دہراتے رہے ہیں۔ اُن کے اسلوب و انداز میں کسی قدر فرق نظر آتا ہے ورنہ حقیقت ایک ہی ہے لیکن ہجر و وصال کے متعلق عبداللہ بن مبارکؒ نے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ ضرور انفرادی شان کا حامل ہے فرماتے ہیں کہ خدا

کے دوستوں کے دلوں پر آرام حرام ہے۔ دنیا میں وہ طلب واشتیاق کے عالم میں رہتے ہیں۔ اُن کی حیثیت مہجور اور غمزدہ کی ہوتی ہے اور آخرت میں جمال کی تجلّی کے باعث اُن کی حالت غیر ہوگی۔

اسی نظریئے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آرام یا تو مراد پالینے کے بعد، حاصل ہوتا ہے یا مراد سے کلیتاً دست بردار ہوجانے کے بعد۔ خدا کے دوستوں سے دونوں صورتیں متصوّر نہیں ہوسکیتں۔ وہ خدا تعالےٰ سے غافل بھی نہیں ہوسکتے اور پوری مراد انہیں، اس لیئے نہیں مل سکتی کہ خدا تعالےٰ کا کلّی عرفان ناممکن ہے۔ قدیم کو حادث کیا جان سکتا ہے۔ ممکن کی واجب تک رسائی کیسے ممکن ہوسکتی ہے؟

ایک دفعہ بعض لوگوں نے سوال کیا کہ آپ کو زندگی میں کوئی ایسا واقعہ بھی پیش آیا ہے جس نے آپ کو حیران کر دیا ہو؟

فرمانے لگے کہ ہاں۔ میں نے ایک راہب سے سوال کیا کہ خدا کی راہ کیسے مل سکتی ہے؟ وہ بولا کہ میں نہ تو خدا کو جانتا ہوں نہ پہچانتا ہوں لیکن اس کے قہر وغضب سے خائف ضرور ہوں۔ لیکن تم خدا کو جاننے پہچاننے کے مدّعی ہو۔ باایں ہمہ مجھے تمہاری ذات میں خوف کے آثار نظر نہیں آتے۔

عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ راہب اگرچہ ایمان کی دولت سے محروم تھا لیکن اس کی بات میرے دل میں اُتر گئی اور میرے لیل و نہار بدل گئے۔

راہب سے مل کر عبداللہ بن مبارکؒ کو جو خوف نصیب ہوا وہ خشیت کے اعلیٰ ترین مقامات میں سے تھا۔ ورنہ اس کے یہ معنی نہیں کہ پہلے اُن کا دل خوفِ خدا سے خالی تھا۔ اِسی خشیتِ ربّانی نے تو انہیں عارفینؒ کا امام بنا دیا تھا اور اُن پر علم وعرفان کے دروازے کھل گئے تھے۔